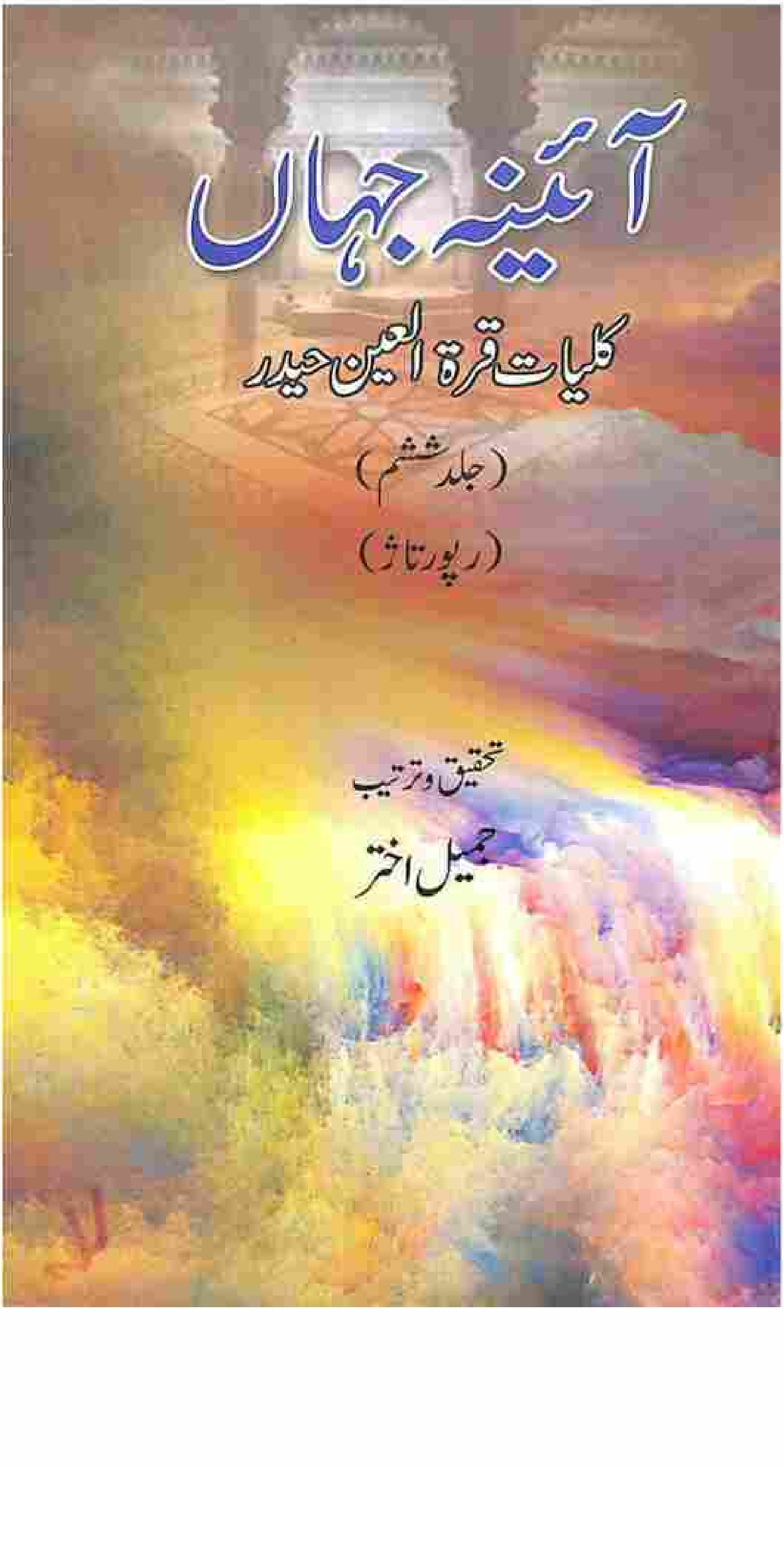
آئینہ جہاں
کلیات قرۃ العین حیدر
(جلد ششم)
(رپورتاژ)
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

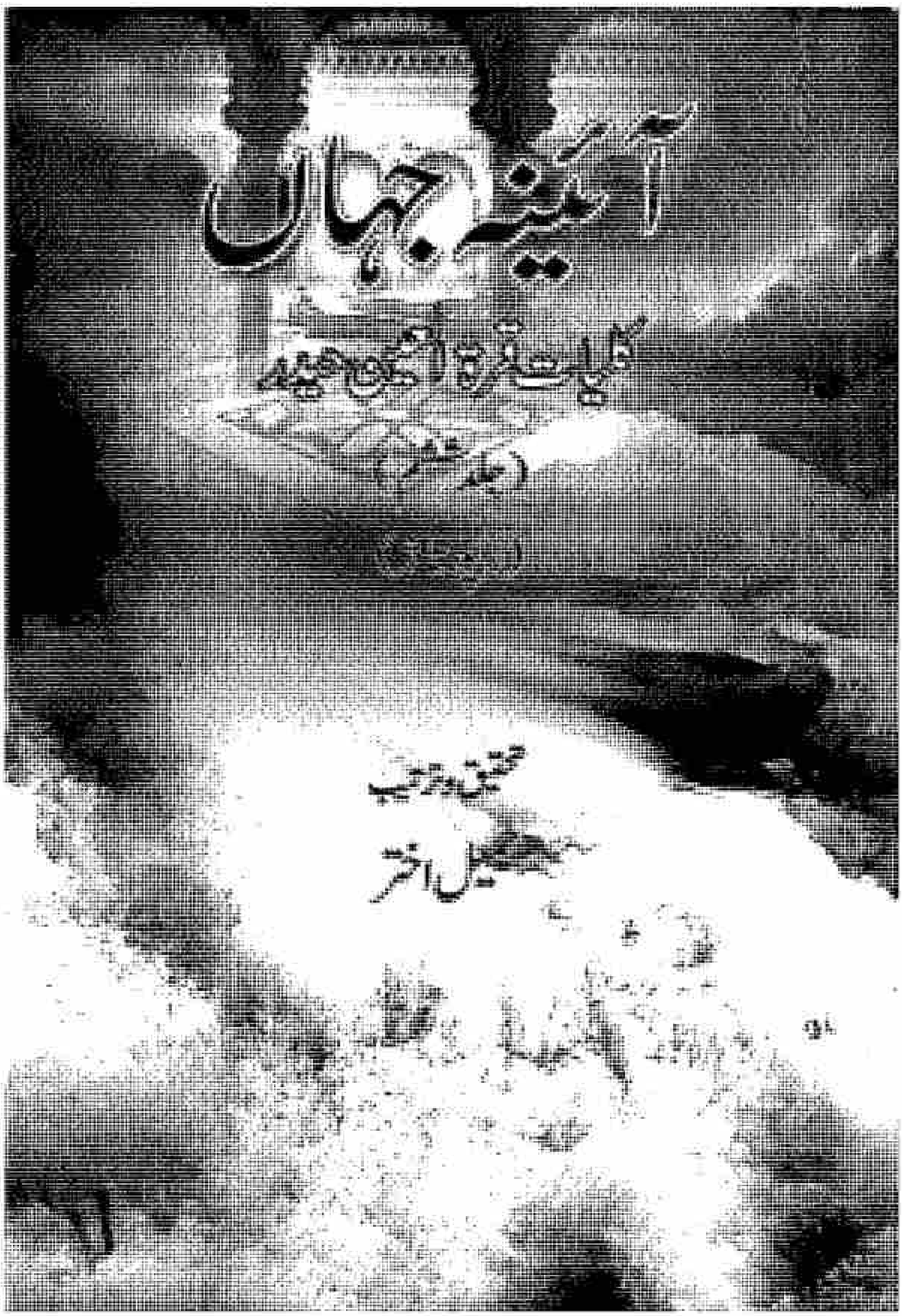
آئینۂ جہاں
کلیات قرۃ العین حیدر
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

آئینۂ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(رپورتاژ)

(جلد ششم)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/170 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1890

Aaina-e-Jahan

Kulliyat-e- Quratulain Haidar Vol. 6

By: Jameel Akhtar

ISBN :978-93-5160-124-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار ضیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

- دیباچہ — قرۃ العین حیدر — vii
- مقدمہ — ix

1. کوہ دماوند — 1
2. جہانِ دیگر — 103
3. قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے (عالم آشوب) — 257
4. خضر سوچتا ہے وولر کے کنارے (کشمیر) — 293
5. دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں — 337

دیباچہ

رپورتاژ اور سیدھے سادے سفرنامے میں محض اندازِ بیان کا فرق ہے۔ رپورتاژ افسانے کی زبان میں لکھا جاتا ہے، اس میں زیبِ داستاں بھی اسی حد تک ہوتی ہے کہ اس سے حقائق کی پردہ پوشی نہ ہو یا واقعات کو غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر افسانے اور حقیقت کا امتزاج ہمیں یلدرم کے مضمون "سفرِ بغداد" میں ملتا ہے جو 1904 عیسوی میں لکھا گیا اور جسے اُردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ اس روداد میں بغداد جانے والے راوی کو راستے میں سندباد جہازی ملتے ہیں جو حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے بعد عالمِ اسلام کی ابتر حالت پر آنسو بہاتے ہوئے اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔

راقم الحروف کا پہلا رپورتاژ "لندن لیٹر" 1953 عیسوی میں لکھا گیا تھا اور اسی زمانے میں "نقوش" لاہور میں شائع ہوا۔ اس میں مَیں نے ذکر کیا تھا کہ میں فیروز جبیں اور چند اور دوست فرانسیسی فلم "لا روند" دیکھ کر پیکیڈِلی کے سینما ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے تو ایک اپاہج گورے نے بھیک مانگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "تمھارے بازو کیا ہوئے؟" مسکرا کر بولا

"میں ڈنکرک فتح کرنے گیا تھا۔" اب اس جملے میں اس دور کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جبکہ دوسری جنگِ عظیم کو ختم ہوئے ابھی صرف چھ سال ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں نے مختلف ملکوں کے متعدد رپورتاژ قلم بند کیے پھر جی بھر گیا، سیاحت نامے کوئی کہاں تک لکھے۔ امریکہ کے متعلق میرا رپورتاژ بعنوان "جہانِ دیگر" ہفتہ وار اُردو بلٹز، بمبئی میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد بھی میں امریکہ وغیرہ گئی اور برطانیہ تو تقریباً ہر دوسرے تیسرے سال جاتی ہوں اور خیال آتا ہے کہ اتنے طویل عرصے میں جس طرح مغرب کا رنگ بدلا ہے اس کے بارے میں بھی لکھوں۔ پتہ نہیں یہ ارادہ کب پورا ہوگا۔ چلیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔

قرۃ العین حیدر

نوئیڈا

15 نومبر 1998

مقدمہ

قرۃ العین حیدر کی کلیات سازی کا کام میں نے ان کی اجازت سے ان کی حیات میں ہی شروع کر دیا تھا۔ افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل تین جلدیں اور ایک نیا افسانوی مجموعہ 'قندیل چین' ان کی حیات میں ہی شایع ہو چکا تھا لیکن عینی آپا اس کی خوشی نہ دیکھ سکیں کتاب شایع ہونے کے فوراً بعد خرابیِ صحت کی وجہ سے داخل اسپتال ہوئیں اور پھر جاں بر نہ ہو سکیں اور اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ بلکہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر کام کرتا رہا۔ اس لیے کہ کوئی ادارہ پروجیکٹ مکمل ہونے پر کتاب تو شایع کر دیتا ہے لیکن بنیادی ماٰخذ کی تلاش و جستجو کے لیے جو اصراف خطیر ہوتا ہے اس کا بار اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ اردو ادب کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرد واحد کے محدود وسائل سے کوئی بڑی امید کرنا بعض وقت مایوسی کا سبب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی فرد واحد انجمن اور ادارے سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے اور اس کا یہی نادر کارنامہ فرد کی انفرادیت کو ادب کے افق پر اجاگر کر کے اس کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے اور ادبی تاریخ ایسے منفرد جیالوں سے جگمگا رہی ہے۔ ورنہ اردو ادب کی دگرگوں صورت حال میں اس کی ساری وراثت تہہ و بالا ہو جاتی اور سارا

سرمایہ تہہ تیغ ہو جاتا۔ لیکن ادبی ذوق وشوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق وتنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی پس ماندگی کو دور کیا جا سکتا اور اعلیٰ اُدب اور اعلیٰ تحقیق وتنقید کے لیے فضا سازگار ہوتی۔ گفت وشنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو مجتمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی محافظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے وافراد کیا اپنی آنکھیں خشک کر لیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو پچاسوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کر سکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنفہ نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام ونمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی، آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی

النا کی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔عبرت ناک...عبرت ناک...سردم دکھم دکھم...

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

قرۃ العین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

"بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پرفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہل نظر نے اپنے عہد رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوحہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان کمپنی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذرِ آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرا نشیب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پرونے کی ٹوکری

بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں پشکن کے گھوڑے کی ایال کو جس چوبی کنگھے سے سنوارا جاتا تھا وہ کنگھا بھی محفوظ ہے۔ جس زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوب کیا، اس وقت تک شاید ان میں سے کوئی ہندو روس نہیں گیا تھا۔

چنانچہ عزیز بانو کا مکان بھی لکھنؤ کے چند اور مکانات کی طرح National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ رائے دیتی مگر وہ خود ہی غائب ہو گئیں۔"

قرۃ العین حیدر کا مکان بھی نیشنل ہیریٹج میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ تاریخ کی یہ دردناکی شاید انسان کا مقدر ہے۔ تاریخ کے بہاؤ اور وقت کی جبریت کا قہر جب سونامی کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سب کچھ تاخت و تاراج کر دیتا ہے اور انسان محض ایک بے بس تماشائی کی طرح حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس عبرت ناک منظر پر چند آنسو نکل بھی آتے ہیں اور کبھی استعجابی شدت سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی اس بے بسی اور دردناکی کی گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر حقیقت کا ادراک کرانے والی خاتون کو کیا پتہ تھا کہ صدیوں سے دہرائی جانے والی اس کہانی کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

آج قرۃ العین حیدر کی برسی پر چراغاں کرنے والے بھی نہیں رہے۔ عقیدت کے دو پھول چڑھانا تو دور کی بات ہے۔

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

کیا قبرستان کا یہ سناٹا بھی ادبی سرگوشیوں میں تبدیل ہو کر انھیں خراج عقیدت پیش کر سکے گا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

اردو ادب کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت مصنفہ لحد میں ضرور خوابیدہ ہے لیکن ان کے چاہنے والے انھیں اتنی جلد فراموش کر دیں گے، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت اور سچائی بڑی جابر چیز ہے۔ جب سامنے آتی ہے تو بھرم تار تار کر دیتی ہے۔ آج وہ بھرم تار تار ہو گیا جو داستان طراز تھی۔ وہ خود داستانِ عہد گل ہو گئی۔ تاریخی بصیرت کا رفیع الشان احساس دلانے والی تخلیقی ہستی کا اس طرح ناپید ہونا دوسروں کے لیے زبردست عبرت کا مقام ہے۔ کیا وقت اس حیرت و استعجاب کو کم کر سکے گا؟ ہمیں اس لمحے کا انتظار رہے گا۔

آج قرۃ العین حیدر دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس تاریخی قبرستان میں جہاں انھوں نے علم و ادب کی عظیم المرتبت ہستیوں، دانشوران ملت اور بانیان جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان پناہ لی ہے، سے باہم مشاورت ضرور کر رہی ہوں گی کہ آخر یہ ستم ظریفی ہماری قوم میں ہی کیوں ہے۔ تاریخی حامل کی عظیم المرتبت ہستیوں کے درمیان رہ کر بھی اس قدر بے بسی کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قوم اپنے لعل و گہر کی عظمت کو کب پہچانے گی؟ کب انھیں عزت و توقیر ملے گی؟ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ان لوگوں کے درمیان میں کبھی فراموش نہیں کی جاؤں گی۔ میں نے اپنا سارا ادبی سرمایہ اس دانش گاہ کو اس لیے بخش دیا تھا کہ کم از کم ہر برس یہ لوگ میری لحد پر عقیدت کے دو پھول ہی ڈال کر میری عزت افزائی کریں گے۔ لیکن یہ تو میرا میوزیم (آرکائیو) بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے نام کا گیٹ بھی وہاں بنایا جہاں علم و ادب کی ہستیوں کا گزر ہی نہ ہو۔ بھلا اسٹیڈیم سے متصل گیٹ سے میرے نام کی کیا نسبت؟ دانش گاہ کا مین گیٹ جہاں غالب غزل سرا ہیں اگر میرے نام کا ہوتا تو شاید کچھ مناسبت بھی معلومات ہوتی کہ میں وہاں سے شعبۂ اردو پر بھی نظر رکھ سکتی اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی، پھر تو میری روح بھی خوش ہوتی اور میری ہستی کا وجود اس طرح ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

تاریخی بصیرت کی حامل ہستیوں کا یہ حشر عبرت ناک ہے۔ غالب کی حویلی کی باریابی

کے لیے صدیوں تک تحریک چلی پھر حکومت نے موقع پرستی کی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے واگزاری کی بھی، وہاں تو معاملہ غاصبانہ قبضے کا تھا اس لیے واگزاری ہو گئی۔ یہاں تو مکان فروخت کر دیا گیا ہے جس کی واگزاری ممکن ہی نہیں۔ تاریخ کی بوالعجیاں بھی عجیب و غریب ہیں۔ عظمت رفتہ پر تاسف کرنے اور آنسو بہانے والی اد یہ ڈھائی ہزار سالہ ہندستانی تاریخ کے وقوع کو کھنگالنے کے بعد کف افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تو میرا ماضی، میرا عظیم الشان ماضی، میری عظیم الشان روایات کی یاد کر کے اس پر آنسو بہا کر دل کو مطمئن کر لیا۔ یہاں تو ماضی کی عظیم الشان روایات سے حال کا عظیم الشان رشتہ باقی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن زر پرستی کی ہوس میں، ہندستانی تہذیب و ثقافت کی بقاو تحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کے صلے میں انھیں انعام بھی کیا دیا کسی دوسرے نے نہیں خود ان کے اپنوں نے جو ان کے جذبات اور ان کی عظیم الشان تخلیقی وراثت کی قدر و قیمت کو پہچان نہ سکے جو کل تک ہماری عظمتوں کی پہچان تھے اور جس پر انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی اور آج خود ان کے اپنوں نے ان کی وراثت کی پامالی کر کے ان کی عظمتوں کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو لعنتوں کی بارش ہوگی، مگر کس پر۔ یہ وہ مقام عبرت ہے جس سے ہر کسی کو سبق لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر پر میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو زندگی کے ان کے مشن کے تحت میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہوں۔ اور میں قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی عظمت کو خواہ اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو داغ دار کرے۔ دنیا ان کو عزت کے منڈولے میں بٹھانا چاہتی ہے اور اپنے ہیں کہ قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہاں تو بات کلیات سازی کی چل رہی تھی اور موضوع بھٹک کر کہاں سے کہاں چلا گیا۔ سوال وراثت کی حفاظت کا تھا۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس بار گراں کو اٹھا تو لیا ہے لیکن کیا وسائل کے بغیر کئی ملکوں میں بکھری ان کی تحریری وراثت کو مکمل طور پر سمیٹنا ممکن بھی ہو سکے گا۔ میرے خیال میں اس کا سیدھا سچا جواب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ زندگی میں کسی پر اتنا اعتماد آپا نے نہیں کیا جتنا مجھ پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات کی تدوین جیسے مشکل کام کے لیے خود سے میرا انتخاب کیا اور میں نے

ان کی زندگی میں اس اعتماد کو وقار بھی عطا کیا۔اور کلیات کی تین جلدیں سجا سنوار کے انھیں پیش بھی کر دیں۔اب سوال آگے کا ہے۔ مجھے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہو کر مجھ سے سوال کرتی ہیں کہ باقی بچا کام کب ہوگا؟ بس یہی بات مجھے کچو کے لگاتی ہے۔ میں نے آپا سے وعدہ کر لیا ہے کہ مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا۔

ان کے انتقال کو آٹھ سال بیت گئے۔اس بیچ میں تنکا تنکا جمع کرتا رہا۔اب جا کر اتنا کچھ جمع ہو سکا کہ آپا کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔شاید میری یہ کاوش علم و ادب کے قدردانوں میں ان کا اعتماد مضبوط کر سکے گی۔ یہ کوشش فرد واحد کی ضرور ہے لیکن یہ کام انسان کو ایک انجمن، ایک ادارہ بنا دیتا ہے۔خدا کرے میری یہ سعی جمیلہ انھیں شہرت دوام عطا کر سکے اور علم و ادب کے سرمایۂ افتخار میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہو۔

کلیات کی پہلی چار جلدیں افسانے، ناولٹ اور ایک نیا افسانوی مجموعہ قندیل چین پر محیط ہیں۔اب کلیات کی پانچویں جلد سے تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

Vol. - 5 : رپورتاژ	Vol. - 9 : خاکے
Vol. - 6 : رپورتاژ	Vol. - 10 : انٹرویوز
Vol. - 7 : مضامین	Vol. - 11 : انٹرویوز
Vol. - 8 : مضامین	

اس کے علاوہ ان کے تراجم، بچوں کی کہانیاں، صحافتی مضامین، فلم ریویو، کتابوں پر تبصرے، خطوط اور دیگر دوسری چیزیں۔ یہ سب قصہ اگلے پڑاؤ کا ہے۔سلسلہ تلاش و جستجو جاری ہے۔ تحقیق اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ فی الوقت درج بالا سات جلدیں پیش خدمت ہیں۔

پانچویں اور چھٹی جلد میں قرۃ العین حیدر کے گیارہ رپورتاژ ہیں۔اس کی ترتیب بھی تقویمی ہے۔اردو میں اس صنف کو بھی اپنے منفرد انداز میں عظمتوں سے ہم کنار کرنے کا سہرا

بالآخر قرۃ العین حیدر کے سر جاتا ہے۔ ان سے پہلے جو رپورتاژ لکھے گئے ان میں یہ خوبیاں نہیں ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے جہاں کا بھی (ملک یا شہر) رپورتاژ لکھا ہے اس ملک کی تاریخ و تہذیب و تمدن کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ تاریخ و تہذیب کا یہ رچاؤ و بساؤ، تمدن کی یہ ہمہ رنگ سامانیاں اس دروبست کے ساتھ ان سے قبل کے لکھے ہوئے رپورتاژ میں نہیں پائے جاتے۔ افسانویت سچائی پر غالب نہیں آئی ہے۔ ان کی زبان تخلیقی ہے اس لیے اس میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ رپورتاژ اور سیدھے سادے سفرنامے کے بیچ جو معمولی سا فرق ہے اس فرق کو وہ اول تا آخر باقی رکھتی ہیں۔ ان دو جلدوں میں کل گیارہ رپورتاژ ہیں۔ دس تو پہلے مختلف صورتوں میں موجود تھے، گیارہواں گم تھا۔ یہ میری تحقیق ہے۔ یہ اضافہ اہم ہے۔ یہ رپورتاژ 'پدما ندی کنارے ہے' جو بنگلہ دیش کے بارے میں ہے۔ بقیہ رپورتاژ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(کون سا رپورتاژ کس ملک کے بارے میں ہے)

1. 'کوہ دماوند' میں ایران کے سفر کا حال درج کیا ہے۔
2. 'جہان دیگر' سفر امریکہ سے متعلق ہے۔
3. 'قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے' یا ایک عالم آشوب ہے۔
4. 'خضر سوچتا ہے وولر کے کنارے' میں کشمیر جنت نشان کا ذکر ہے۔
5. 'دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں' حیدرآباد دکن کے سفر کی روداد ہے۔

ان تمام رپورتاژ میں قرۃ العین حیدر کی انفرادیت دوسری اور صنفوں کی طرح نمایاں ہے۔ انھوں نے رپورتاژ نگاری کے فن اور اصول و ضوابط پر بحث کرتے ہوئے رپورتاژ نگاری کی تعریف وضع کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اور اردو میں رپورتاژ نگاری کے فن کو بھی نئی جہت عطا کی ہے۔ ان کے تمام رپورتاژ الگ الگ تکنیک میں لکھے ہوئے ہیں اور اپنے ناولوں کی طرح وسیع کینوس کا احاطہ کرتے ہیں۔ تاریخ و تہذیب اور ثقافت کو یہاں بھی وہی اہمیت دیتی ہیں جو انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں دی ہے۔ ہر واقعہ ہر بات کو اس کے وسیع تناظر

میں دیکھنا اور برتنا اور وہ بھی اس طرح کہ اصل مقصد مرکز میں رہے اور تحریر بوجھل نہ ہو، یہ ان کا وصف خاص ہے۔ خوب صورت اور دل پذیر انداز بیان میں لکھی گئیں تحریریں دور بینی اور فکر انگیزی کی دعوت دیتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے یہ تمام رپورتاژ، رپورتاژ نگاری کے نئے اسٹائل سے اردو کے قاری کو متعارف کراتی ہیں۔ یہ تمام رپورتاژ مقلدین کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرۃ العین کی ان بکھری ہوئی تحریروں کو مجتمع کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے میری معاونت کی ہے جن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر نجیب اختر، برادر عزیز کفیل اختر، ڈاکٹر ارشد رضا بھاگلپور، عزیزی جاوید اختر، بزرگ محترم مہر الٰہی ندیم صاحب، برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر تحسین فراقی (لاہور)، ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی)، صبا اکرام (کراچی)، علی حیدر ملک (کراچی)، پروفیسر مرزا حامد بیگ (لاہور)، پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)، پروفیسر علی احمد فاطمی، چودھری ابن النصیر (ایڈیٹر 'پہچان')، شمع افروز زیدی (ایڈیٹر 'بیسویں صدی')، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رام پور) کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ تحقیق کے مشکل مرحلے میں ان تمام لوگوں کا پرخلوص تعاون مجھے ملتا رہا ہے تبھی تنکا تنکا جمع ہو سکا، اور جو رہ گیا ہے وہ بھی انشاءاللہ حاصل ہو جائے گا۔

اداروں میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، انصاری لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرۃ العین حیدر آرکائیو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد کا بھی شکریہ لازم ہے جن کی پرخلوص معاونت نے تحقیق کے مرحلے کو آسان بنادیا فرداً فرداً سب کا نام گنوانا ممکن نہیں۔ لیکن ان کے کرم خاص کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

قومی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے تعاون کے بغیر کلیات کی طباعت کا خواب ادھورا رہتا۔ لہٰذا میں قومی کونسل کے تمام افراد کا جنھوں نے کلیات کی طباعت و اشاعت کے کسی بھی مرحلے میں مدد کی میں فرداً فرداً سبھوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آخری

شکریہ نوجوان دوست تنویر احمد کا جن کی محنت شاقہ سے کلیات کمپوزنگ کے دشوار گزار مرحلے سے گزر کر مکمل ہوئی اور طباعت تک پہنچی۔

بیوی اور بچوں کا شکریہ کیا ادا کروں، ان کی حق تلفی کا مجھے شدید احساس ہے لیکن ملول خاطر نہیں ہوتے۔

جنوری 2015
نئی دہلی

جمیل اختر
موبائل:9818318512
ای میل:jameelakhtar786@yahoo.com

کوہِ دماوند

جھلملاتے سپید دریچوں کے باہر خنک نیلگوں دھندلکے میں شمراَن کی ان گنت روشنیاں چراغِ لالہ کی طرح جھلملا رہی ہیں۔ ان کے عقب میں اودی چوٹیوں پر خسرو جم کے عظیم الشان برقی تاج جگمگاتے ہیں۔ بادل کوہ دماوند پر سے مودب خادموں یا متحیر سیاحوں کی مانند آہستہ آہستہ گزر رہے ہیں۔ چند لمحوں بعد یہ کاروانِ سحاب پہاڑیوں کے ادھر توران پہنچ کر ایک اور جشنِ پُر شکوہ کا تماشہ کرے گا۔ بسیط، منور، بے کراں رات میں یہ کاسنی بادل اندھیرے کیسپین سے اٹھے ہیں۔

البرز کی گونجتی ہوئی چٹانوں پر سیمرغ پروں میں چونچ چھپائے بیٹھا اونگھ رہا ہے اور باخبر ہے کہ چند فرسنگ پر کوہ طالقان اور کیسپین کے درمیان پُر اسرار جنگلوں، چراگاہوں میں بڑا جنے والا لال دیو بغلیں بجاتا ہے کہ ہفت خواں طے ہوئی اور سفید دیو بالآخر مات کھا گیا۔ سفید دیو اور ارژنگ دیو اور شیر اسپ، گستاسپ، جاماسپ، مہراسپ، ارجاسپ، اسفندیار؛ رستم رہاز میں پہ نہ بہرام رہ گیا۔ بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔

اے خسرو زمانہ بکشاد چشم و بنگر۔ در بند سکندرا حوال ملک دارا۔

رات تیزی سے گزر رہی ہے۔ ٹھنڈ بڑھتی جارہی ہے بروایں دام بہ مرغ دگر نہ۔ کہ عنقا را بلند است آشیانہ۔ ہفت خواں کے بعد کیا ہوتا ہے؟ بڑی سخت نیند۔

بالکنی کے سفید پردے سرسرائے۔ ایک مختصری شے نے اندر جھانکا

"ہلو"

"ہلو" میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور گھبرا کر جواب دیا۔ ایک عجیب وغریب پرند پھدک کر سامنے آگیا۔

"مجھے آقائے سیمرغ نے بھیجا ہے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" پرندے نے پر پھیلا کر کہا۔

"آقائے ......کون؟" میں نے گڑبڑا کر پوچھا۔

"خانم۔ آپ ابھی انہیں یاد فرما رہی تھیں" پرند نے ذرا بُرا مان کر کہا۔

"اوہ"

"موصوف خود نہ آسکے کہ پرتو کول مانع ہے کیونکہ آپ نے بال کو"

"آگ نہ دکھائی" میں کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔

وہ حیرت انگیز پرند اچک کر ٹیلی ویژن پر بیٹھ گیا اور نہایت اخلاق سے گویا ہوا۔

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

ہڑبڑا کر میں نے ذہن پر زور ڈالا اور مناسب جواب دینا چاہا۔

خیر مقدم مرحبا اے طائر میموں قدم

دوسرا مصرع یاد نہ آیا لہٰذا اس کے بعد "السلام علیکم" پر اکتفا کی

"وعلیکم السلام" پرند نے تقریباً علی گڑھ کے لہجے میں ڈپٹ کر جواب دیا۔

"معاف کیجیے گا" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں ذرا متعجب نظر آرہی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ جیسا پرند میں نے کبھی نہیں دیکھا"۔

''خانم! آپ بجا فرماتی ہیں۔ خاکسار عنقا ہے۔''

''آقائے عنقا اب تازہ فارسی رسالوں کے انبار پر فروکش تھے۔ اچانک اپنے پنجوں کے نیچے ایک رنگین تصویر پر ان کی نظر پڑی اور وہ فوراً پھدک کر کاشانی قالین پر آئے اور اٹنشن کھڑے ہو گئے کہ وہ شاہ کی تازہ ترین تصویر تھی۔

اس غیر المعقول صورت حال کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔

''آپ کو معلوم ہے آقائے عنقا کہ عین اس لمحے ماوراء النہر کے ادھر کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' عنقا نے پینترا بدل کے اب گوریزیوں کا رخ کیا جس پر ایک اور عجمی زمزمہ سنج تھا۔

''اس پار'' میں نے دریچے میں جا کر سلسلۂ کوہ کی طرف اشارہ کیا ''عین اس وقت سلطانی جمہور کا جشن تاسیس منایا جا رہا ہے''۔

''آپ کے آئینۂ اسکندر کا حجم بہت مختصر ہے''۔ عنقا نے چالاکی سے میری سنی ان سنی کر کے کہا ''ارباب حل و عقد کو تلقین کیجیے کہ آپ کے حجرے میں دوسرا آئینہ لگا دیں۔''

میں اس مسخرے پرند کو کہاں بخشنے والی تھی، اپنی بات پر اڑی رہی۔

''نغمۂ بیداری جمہور، کابلستان، زابلستان، مازندران۔ آذربائی جان، سب جگہ دیکھ لیجیے گا بہت جلد۔ جس طرح داغستان، کرغستان، قزاقستان۔''

''اور ہندستان و پاکستان؟'' عنقا نے چالاکی سے پوچھا۔

''گلستان بوستان'' میں نے فوراً بات ٹالی۔

''سبحان اللہ! ماشاءاللہ!'' عنقا نے جواب دیا۔

''ساری اولاد آدم'' میں نے خطیبانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''آقائے آدم نے تو جوٹ ملیں قائم کر لی ہیں اور ادبی انعام دیتے ہیں''۔ عنقا نے بات کاٹی۔

کس قدر بے تکا پرند ہے۔

"آپ کبھی اڑ کر اس طرف تشریف لے گئے ہیں؟"

"کدھر؟" اس نے تجاہلِ عارفانہ سے دریافت کیا۔

"شمال میں آپ کا ایک پڑوسی ملک ہے۔ عجائب زرنگار ایسا خطہ کہ مرقع خیال مانی و بہزاد نے نہ کھینچا ہوگا اور پیرِ دہقان فلک نے مزرعِ عالم میں نہ دیکھا یعنی لال دیو کا دیس۔"

"تم نے فغفور چین کا تازہ بیان پڑھا؟" عنقا نے جواباً استفسار کیا۔

"آقا پہلے میرے سوال کا جواب عطا ہو۔"

"یاجوج ماجوج کا" عنقا نے ٹیلی ویژن کا بٹن گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"سدِ باب ہو چکا ہے"

"بذریعہ انقلاب سپید؟"

"ہاں"

"مگر آپ کو یاد ہے اے طائر لاہوتی کہ اس ملک میں جہاں آج عوج بن عنق نے بقیہ سفید دیوؤں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے وہاں دو صد سال قبل ایک انقلاب آیا تھا اور"۔

"عوج بن عنق؟" پرند نے پنجہ اُٹھا کر ذرا سر کھجایا۔ "سے وی! سوسیو دی گال"۔ پھر وہ پھدک پھدک کر خوب ہنسا۔

"ہاں" میں نے کہا: "ابھی وہی انقلاب بہت سے ملکوں میں آنا باقی ہے۔ اکتوبر والا تو دور رہا۔"

"تازیوں کے متعلق خانم آپ کیا کہتی ہیں؟" عنقا نے ایک چوکس صحافی کی طرح بات کا رخ پلٹا۔

"آپ لوگوں نے"۔ مجھے غصہ آ گیا۔ "محض بعض معاویہ میں کانے دجال کے ڈاکو ملک کو تسلیم کر لیا ہے۔"

"وہ جوانانِ تتاری یعنی وارثانِ دولتِ عثمان بھی تو اس کے وجود کو قبول کر چکے ہیں۔ اوہ

خانم! آپ شاہ دقیانوس کے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ آج کا اخبار دیکھیے۔" اس نے چونچ میں تازہ اطلاعات اٹھا کر مجھے پیش کیا۔

"جنگ شدید مصر و اسرائیل — شہر سویز درمیان شعلہ ہائے آتش می سوزد۔"

"میں پڑھ چکی ہوں۔"

"جی نہیں۔ اندر کا جوشیلا ایڈیٹوریل پڑھیے۔"

میں نے اخبار کھولا۔

"خانم"۔ عنقا نے سنجیدگی سے کہا: "مسلمان ہمیشہ مسلمان کا ساتھ دے گا۔ تازیوں کے ان مصائب پر ہم خون کے آنسو رو رہے ہیں۔" پھر اس نے دوسرا چینل لگایا۔ اسکرین پر دفعتاً تاج شاہی کا کلوز اپ جگمگانے لگا۔ عنقا سکور ہو کر پھر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"موسیو! قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تک؟" میں نے کہا۔

"مادموزیل۔ آپ کی روشنی بصر کے لیے" اس نے پلٹ کر جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا "سرمے کی ضرورت ہے۔ حکیم طوسی کو یاد کیجیے۔"

"میں نے کیا تھا انہیں تلفن۔ معلوم ہوا کا کی ٹیلو کے لیے منسٹری آف کلچر گئے ہوئے ہیں اس کے بعد ان کا ٹکویزیوں پر پروگرام ہے۔ حیف کہ آپ لوگ بھی شمع ٹکویزیوں کے پروانے۔"

"خانم!" عنقا نے بات کاٹی۔ "ہمارے جام جم کو آؤٹ آف فوکس ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ کیوں نہ ہم اب ساحر فرنگ کے عجائب او ہو۔ ہوذرا یہ نظارہ دیکھیے۔" عنقا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اسکرین پر اب شہر کی قیامت خیز آئینہ بندی اور چراغاں کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ خوش پوش عوام کے ہجوم۔ مسرور چہرے، موٹروں کا سیلاب۔ اچانک کیمرہ حکیم فردوسی کے بلند و بالا مجسمے پر آ کر تھم گیا۔ سنگی قبا میں ملبوس، ہاتھ میں شاہنامہ تھامے روشنی میں نہائے ہوئے فردوسی دیدہ ور اپنی فرحاں قوم کو کیسی متبسم نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پس منظر میں سرود بجنے لگا۔

"یک بیک عنقا نے پر پھیلا کر ایک سانس میں کہنا شروع کیا۔

برفت از درپردہ سالار یار   بیامد خراماں بر شہر یارا!
بگفتش کہ رامشگرے بردراست   آیا بربط مغز رامشگر است
ہمی رائے جوید بدیں پیش گاہ   چہ فرماں دہد نامور بادشاہ
بربط چو بابست برساخت زود   برآورد دماوند رانی سرود

اور پھر خاموش ہوگیا۔ مجھ پر نظر ڈالی: میری جہالت پر افسوس کرتے ہوئے توضیحاً کہا:
"یہ شاہ کے کاؤس کے جشن تاج گذاری کا ذکر تھا۔"

"اب اسکرین پر دوبارہ تاج شاہی اور اس کے بعد بانک ملی میں محفوظ زر و جواہر کے کلوز اپ آن موجود ہوئے اور لعل بدخشاں اور الماس کے جڑاؤ ظروف اور جام۔
"روشن ہے جام جمشید اب تک   شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی"
میں نے فوراً کہا: اشعار تھے کہ اس مجمی پرند کی موجودگی میں نوائے سروش کی طرح چلے آرہے تھے۔

"اے خانم خارجی!" عنقا نے بُری طرح جھلا کر جواب دیا: "آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کج کلاہ مجم سوشلسٹ ہوگئے ہیں۔"
خبطی پرندہ ہے۔ میں نے سوچا اور واپس آکر پلنگ پر بیٹھ گئی۔
"اب آقائے پتہ نہیں کون ایک گلشن میں سرود بجائے چلے جارہے تھے عنقا نغنے میں محو ہوگیا۔

"آقائے عنقا۔" چند منٹ بعد میں نے جماہی لے کر کہا "نیند کے مارے میری حالت خراب ہے۔ صبح بہت سویرے اٹھنا ہے۔ ابھی پریس روم سے کل کے متعلق بھی تازہ بلیٹن بھی نہیں آیا۔ آپ کو علم ہے کل شاہ کا کیا پروگرام ہے؟"
"شہنشاہ آریامہر کہیے۔" عنقا نے ڈپٹ کر جواب دیا۔ میں نے اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ "شہنشاہ آریامہر۔ شہنشاہ آریامہر۔"
"یہ آریامہر کیا شے ہے آقا؟" میں نے سوال کیا "اڈولف ہٹلر کی آریا نسل۔ پنجاب کا

آریہ سماج۔ بھلا غور کیجیے۔ ایک اصطلاح کتنے مختلف معانی رکھتی ہے۔ خود آریا نسل۔ ایک بے حد مبہم اصطلاح ہے۔ اینتھرو پولوجی۔۔"

اب عنقا نے منقار وا کر کے جاہی لی گر میں کہہ گئی" اور اینتھولوجی کی رو سے ایران میں منگول یعنی ترک جنوب میں نیگرو اور مجموعی طور پر کا کیشن نسلیں آباد ہیں۔"

"اسی لیے کوہ قاف کی پریاں کہا جاتا ہے۔ ہم ایرانی ایک بے حد خوب صورت قوم ہیں۔" عنقا نے پر پھیلا کر کہا:

"درست! اور برطانوی ہند میں نیٹو سے یورپین کو اسی لفظ کا کیشن سے ممیز کیا جاتا تھا جبکہ انگریز بہادر آپ ایرانیوں کو بھی نیٹو کہتا تھا۔ عنقا سوچتا رہا۔

"اچھا! مثال کے طور پر اس فقیر حقیر کو لیجیے جو اس وقت کوہ دماوند کے سائے میں موجود ہے۔ میں کیا کہوں؟"

"کافر ہندی۔" عنقا نے مختصراً جواب دیا۔

"آقائے عنقا" میں نے سنجیدگی سے کہا" مجھے خاکسار کے نسلی اجزائے ترکیبی کا تجزیہ فرمائیے۔ میں سامی النسل ہوں یا آریا؟"

"نمی دانم۔"

"سنیے! یہ فدوی بنی ہاشم ہے"۔

"تازی۔" عنقا نے ذرا منہ لٹکا کر کہا۔

"اور جناب شہر بانو خالص ایرانی تھیں تو اس لحاظ سے ناچیز تھوڑی سی آریا بھی ہوئی؟"

عنقا خوش نظر آیا۔

"میری نسلی، تہذیبی اور روحانی جڑیں ارض عجم و عرب میں بے حد گہری ہیں۔"

"بالے! لیکن پچھلے آٹھ سو سال سے آپ انڈک سوسائٹی INDIC SOCIETY میں شامل ہیں۔" عنقا بولا: "وہ اپنے ٹوئنبی TOYNBEE سے بخوبی واقف تھا۔

"انڈک اسلامک سوسائٹی۔" میں نے تصحیح کی۔ "تو ذرا بتلایئے کہ یہ سب کیا گھپلا ہے؟

قوم، نسل، تہذیب کی بھول بھلیاں۔"

"پچھلے چھ ہزار سال سے۔" عنقا نے جواب دیا "میں کوہ دماوند کی چٹانوں میں چھپا اس کھیلے کا نظارہ کر رہا ہوں جس میں مبتلا ہو کر فانی انسان ایک دوسرے کو نیست و نابود کرتے رہے ہیں۔"

یک بیک عنقا نے پَر پھیلا کر ایک سانس میں کہنا شروع کیا "برفت از در پردہ سالار یار۔ پیادہ خراماں بر شہریار، بکتش کرد ماشکرے بر دراست۔"

مجھے نیند کا ایک اور جھونکا آیا۔ عنقا بولے جا رہا تھا "چہ فرماں دہد نامور پادشاہ اور برآور دماز عدرانی سرود۔"

"میں شاہ نامہ فردوسی سنا رہا اور آپ سو رہی ہیں۔ ملک الشعرا فرخی سناؤں؟ داغ گاہ شہریار اکنوں چنا خرم شود"۔ اچانک عنقا فرخی کو بھول کر ٹیلی ویژن دیکھنے میں محو ہو گیا۔ نکو یزیوں میں اس کی یہ دلچسپی حیرت انگیز تھی۔ پروگرام ختم ہوا۔ قومی ترانہ بجا۔ عنقا اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"نکو یزیوں" میں نے چڑ کر کہا "پس ماندہ اقوام شرق کا نیا اسٹیٹس سمبل ہے۔"

"ہم" عنقا نے وقار کے ساتھ گردن اُٹھا کر کہا: "اب پس ماندہ نہیں ہیں۔ اب ہم خاورمیانہ کا جاپان بننے والے ہیں۔" پھر وہ پھدک کر بالکنی میں چلا گیا۔ "دوبارہ حاضر ہوں گا۔ شب بخیر۔" اس نے وہیں سے آواز دی اور مکر سے اُڑ گیا۔

اس قدر قوم پرست پرند میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

مطرب خوش نوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو
بادۂ دلکشا بجو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

نگارندہ داستان یوں لکھتا ہے پھر ماجرائے غریب کہ ہوا پائے ایران ہما جب صبح سویرے فرودگاہ مہرآباد پر پُرفشاں ہوا، اس وقت کوہ دماوند کی چوٹی ابر میں پوشیدہ تھی اور فضا پر وہ خنکی جانفزا طاری تھی جس کے باعث لالہ زار عجم مینو سواد بہشت نژاد مشہور ہے۔ پایۂ تخت اس اقلیم کا پسند خاطر محبوبانِ جہاں قابل بود و باش خوبانِ زماں، شمیم اس کی دافع خفقان و خلجان۔ زمین اس رشک فردوس۔ گلی کوچہ غلطت وہ باغ ارم۔ مرد و زن بے آزار و خوش اطوار۔ راستے تمام مصفیٰ و

ہموار۔ دوکانیں و مکانات نفیس بطرز فرنگ۔ خلق خدا با خاطر شاد۔ دولت و روغن معدنی وافر لیکن بہ ایں حکومت و ثروت پادشاہ اولاد نرینہ نہ رکھتا تھا اور شب و روز مع بی بی و رعایا دست بدعا رہتا تھا کہ ع

الٰہی غنچۂ اُمید بکشائی

''تمنا اس کی آخر جناب باری سے پوری ہوئی۔ بعد اس واقعہ روح افزا کے تاج دار فیروز بخت نے قصد کیا کہ جب رعایا اوس کی خوش حال ہو جاوے تب تاج شاہی زیب فرق کرے۔ القصہ آشیانہ مہر آباد تھا جس پر آن کے اترا، آراستہ مثل عروس نو کے تھا۔ ہر چہار جانب تصاویر دودمان شاہی، قالین ہائے نظر فریب و گلہائے صد رنگ زنان ایرانی مثل حوران فرنگ۔ جوانان خوب رو مثل صاحب لوگ۔ باہر راستے گل پوش۔ و فرش کاویانی جا بجا سر بلند۔ عساکر قواعد پریڈ میں مشغول۔ وردیوں پر طلائی ڈوریوں اور تمغہ جات کی فراوانی۔ حتیٰ کہ چپراسی کا سپاہی اچھا خاصا جرنیل معلوم ہوتا تھا۔ گمان ہوا عہد ہیپس برگ کا کوئی اوپیرا ہے۔ گرم کوٹ پتلون، بوٹ، موزے اور ہیٹ پہنے مزدور۔ وسیع باغات، مہذب منظم ہجوم، شور و غوغا، فلمی گانوں، غلاظت اور بھکاریوں کا فقدان۔ سڑکوں پر دو رویہ صنوبر و شمشاد کی قطاریں جس سے جگر لالہ میں پیدا ہو وہ ٹھنڈک افق پر بھورے کوہستان۔

تہران کے نواحی پہاڑوں کا یہ سلسلہ شمران تک پھیلا ہوا ہے جہاں چودہ منزلہ رویال ہلٹون ہوٹل ایک سرسبز ٹیلے پر استادہ ہے۔ طویل سایہ دار شاہراہ پہلوی تہران کو شمران سے منسلک کرتی ہے۔ ہلٹون کی برساتی میں دربان قدیم ایرانی پوشاک میں ملبوس کہ مشرق کی ساری تاریخ اب ٹورسٹ انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہوٹل کے اندر چار سو مغربی نامہ نگار اور متعدد جغادری وی آئی. پی. لوگ آ چکے ہیں۔

چودھویں منزل پر میرے کمرے کے سامنے شمران کی ڈھلان پر امرا کی کوٹھیاں دور دور تک بکھری ہوئی ہیں اور ان کے صحنوں میں تیز نیلے پانی کے سوئمنگ پول جھلملاتے ہیں۔ سردیوں میں یہ سارا منظر برف پوش ہوگا۔ بہار میں یہاں نغمۂ ہزار گونجے گا۔

گراؤنڈ فلور کی "کافی شاپ" اور ایوان طعام میں لوگ باگ گرم گرم تاس اور ششش کباب اور سردہ، بوزا اور ملائی جیسے نفیس گیلانی چاول کا پلاؤ نوش کرنے میں مصروف ہیں۔ دریچوں کے باہر نیلے دھندلکے میں تہران افق تا افق پھیلا ہوا ہے۔ ایک دریچے کے نیچے ایک حبشی نژاد وسیع و عریض پارسی خاتون زرق برق ساڑی پہنے جنگی جہاز کی طرح تیرتی اکثر ہماری میز پر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ مارشنس آف ونچسٹر ہیں جنھوں نے چند سال قبل برطانیہ کے سب سے اعلیٰ مرتبت اسی سالہ مارکوئس آف ونچسٹر سے شادی رچائی تھی۔ بقول خود مارشنس صاحبہ رضا شاہ کبیر کی ذاتی دوست تھیں۔

شام کو سارا شہر پرستان میں تبدیل ہو گیا۔ پہاڑ کی چوٹیوں، مکانوں اور سڑکوں پر ان گنت ٹمولوں کے برقی تاج۔ پتہ پتہ بوٹا بوٹا۔ لاکھوں برقی قمقموں سے منور۔ تہران پیلس ہوٹل میں وزیر اطلاعات آقائے جاوید منصور بیرونی صحافیوں سے ملاتی ہیں۔ صبح کے کارونیشن بلیٹن میں جو روز ہلٹن کے پریس روم سے جاری ہو کر ہر صحافی کے کمرے پر پہنچ جاتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ تقریب میں شامل ہونے والے تمام حضرات کے لیے لباس تیرہ یعنی سیاہ ٹیل کوٹ (یورپ کا درباری لباس) اور خواتین کے لیے لیے گاؤن، لمبے دستانے اور ہیٹ لازم ہیں۔

"میرا نام بیلویا میتھسن ہے"۔ آقائے جاوید منصور کی دعوت میں ایک متنکبر بی بی نے مجھ سے کہا۔ "میں لندن ٹائمز کے لیے تصویریں کھینچ رہی ہوں۔ دستانے پہن کر تصویریں کیسے کھینچوں گی؟ کیا تم بھی ساری کے ساتھ ہیٹ اور دستانے پہنو گی؟"

اس سارے بین الاقوامی مجمع میں اتفاق سے ساری پوش خاتون صرف میں ہوں!

"نہیں! میں ساری کے ساتھ ہیٹ اور دستانے نہیں پہنوں گی"۔ میں نے جواب دیا۔ بوکھلائی ہوئی مسز میتھسن لائف کی فوٹو گرافر میری لن سلواسیٹون کی طرف لپکیں۔ میری لن حسب عادت سکون سے مسکرائی (میری لن اب بدھ ازم کی طرف راغب ہو چکی ہے)۔

ایک فرانسیسی نما خانم ہم لوگوں کی طرف آئیں۔ پریس کارڈ تقسیم کر رہی تھیں۔

"متشکرم"۔ میں نے کارڈ لے کر کہا۔

انھوں نے تعجب سے مجھے دیکھا فرمایا" آپ کی زبان تو سنسکرت ہوگی؟" پھر میرا نام پڑھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر بولیں:" آپ انڈیا سے آئی ہیں؟"

"جی ہاں! وہاں ابھی اس قسم کے نام والے لوگ کئی کروڑ بستے ہیں۔"

خانم اخلاق سے مسکرائیں مگر ان کا کنفیوژن کم ہوتا نظر نہ آیا۔ میں نے اس تصور پر غور کیا۔ ساری کے ساتھ دستانے اور ہیٹ اور زبان سنسکرت۔

(میری لیکن اس سارے کنفیوژن کا علاج آج کل سسٹم کی ایک بدصورت خانقاہ میں تلاش کرنے میں مصروف ہے)۔

طہران۔ جسے اب اہل ایران تہران لکھتے ہیں کہ ط عربی حرف ہے۔ سطح سمندر سے پونے چار ہزار فٹ کی بلندی پر البرز کے دامن میں واقع ہے۔ ناصری نے لکھا تھا کہ طہران اور شمران دو گاؤں ہیں۔ منگولوں کے ہاتھوں رے کی تباہی کے بعد وہاں کے باشندوں کو ان گاؤں والوں نے خوش آمدید کہا۔ سولھویں صدی میں طہماسپ صفوی نے قزوین کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔ وہ روضہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی زیارت کے لیے جاتے ہوئے طہران سے گزرا، جگہ پسند آئی۔ یہاں قلعے بنوا کر ان کی دیواروں پر آیات قرآنی نقش کروائیں۔ فصیل میں چودہ پھاٹک تھے۔

1788 عیسوی میں شاہان قاچار نے طہران کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ بارہ محلے آباد تھے اور شہر گلستانوں اور پھلوں کے باغات سے پُر تھا۔ صحن چمن ز لالہ و ریحان مزین است گلہا شگفتہ در چمنستان بصد سرور۔ قمری بشاخ سرو با آہنگ دلربا وغیرہ وغیرہ۔

شاہان قاچار کے بنوائے ہوئے کاخ گلستاں میں مراسم تاج گذاری کی ریہرسل کی جا رہی ہے۔ دربار ہال میں کاریگر اور اہل کار مصروف کار۔ سامنے تخت طاؤس رکھا تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے بہت آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ سنہری پشت اور ہتھوں اور پایوں پر فارسی اشعار کندہ تھے۔ محمد شاہ رنگیلے اس پر آخری بار جب بیٹھ کر اٹھے ہوں گے ان کو کیا معلوم تھا۔ میں نے پرس سے کاغذ نکال کر اشعار بسرعت نقل کیے۔ مغربی نامہ نگار ادھر اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔ کسی نے مجھ سے کہا" اصل تخت طاؤس بانک ملی میں محفوظ ہے۔ یہ اس کی نقل ہے"۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باہر خدام شاہی سامان آرائش اٹھائے چلے آرہے تھے۔ مجھے لکھنؤ کے امام باڑوں کا ساز وسامان یاد آ گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہان اودھ جو خود خراسانی النسل تھے۔ ایک ایک چیز میں شاہان ایران کی نقل کی تھی۔

رات کو منسٹری آف کلچر کے ایک ہال میں شاہی خاندان کے متعلق ڈاکومنٹری فلم دکھائی جا رہی تھی۔ ایک ہال میں دیہی نور باف اپنے کرگھوں پر بنے دیبا حریر لگائے بیٹھے ہیں۔ وزیر اطلاعات نے ایک ایک میز پوش تمام غیر ملکیوں اور صحافیوں کو پیش کیا۔

"فنٹاسٹک۔ فنٹاسٹک"۔ ایک امریکن خاتون میز پوش کے گل بوٹوں پر ہاتھ پھیر کر دہرائے جا رہی تھی۔ ایک انگریز صحافی ڈیوڈ، اس کی امریکن بیوی برینڈا اور ایک انگریز نامہ نگار لڑکی ایلین اندر سے نکلے، میں باہر ایک مرمریں ستون کے نیچے بیٹھی صحن بوستان کو ملاحظہ کر رہی تھی جس کے گل بوٹوں سے ایران کے شعرا اور ہنر مندوں اور مصوّروں نے اپنے شہ پاروں کو سجایا۔ ایران کا لینڈ اسکیپ اس کی روح کا لینڈ اسکیپ ہے۔

فنٹاسٹک۔ فنٹاسٹک۔

ایلین اور برینڈا اپنی منی اسکرٹوں کے اوپر فر کوٹ پہنے آ کر سیڑھیوں پر چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ یہ منی اسکرٹ کے عروج کا زمانہ ہے۔ تعجب ہے یہ لوگ اتنی سردی میں ٹھٹھر کیوں نہیں جاتیں۔

فنٹاسٹک۔

ڈیوڈ برینڈا اور ایلین ہوٹل میں میری فلور پر مقیم ہیں۔ دوسرے روز صبح بہت روشن تھی۔ ڈیوڈ اور برینڈا کے کمرے میں پستہ سے شغل کیا جا رہا تھا جو اہل ایران مونگ پھلی کی طرح کھاتے ہیں۔ کمرے کا رخ پائیں باغ کی طرف تھا۔ اچانک نیچے سبزے پر ع سر کھولے ہوئے قاف سے پریاں اتر آئیں۔ کشور ایران کے مختلف صوبوں کے فوک ڈانسر مرد اور عورتیں اپنی اپنی علاقائی پوشاکوں میں ملبوس جشن تاج گذاری کے لیے ریہرسل میں مصروف ہوئے۔ اوپر روشن نیلے آسمان پر فضائی مظاہرے کی مشق کے لیے جیٹ طیاروں کے پرے سرمئی بادلوں کی طرح گذر رہے تھے۔

ہلٹن کے سبزہ زار پر گرد اور آذر بائیجانی ترک رقصاں۔ مہوشے ترک قباپوش اور جے کیا۔ ز ہر گوشہ سیر فت جوں موج موج۔

ٹیلفن کی گھنٹی بجی۔ ایلین اٹھ کر گئی۔ آ کر کہا۔ تمہارے ہم وطن پترکار پوچھ رہے ہیں۔ شام کو آپ لوگ نائٹ کلب چلیے گا؟

رات کے وقت ہم وطن پترکار شگوفہ نائٹ کلب میں بہت ہشاش بشاش کیبرے ملاحظہ کرتے نظر آئے۔

دُھن اور رقاص تبدیل ہوئے۔ الف لیلوی پوشاک میں ایک لڑکے اور لڑکی نے ''جنگلی'' کا مشہور گیت ''میری جاں شب بخیر'' گا کر ناچنا شروع کیا۔ ڈیوڈ، برینڈا اور ایلین بہت مسحور نظر آئے۔ میں نے اس وقت انہیں بتانا مناسب سمجھا کہ یہ ایک انڈین فلمی گیت ہے۔

ہم وطن پترکار خوشی سے بے حال تھے۔ میں بحیثیت ان کی شہپر ون ان کی حرکات و سکنات کو نظر میں رکھنا چاہ رہی تھی۔ یہ شرقی ہند کے ایک بھولے سے معمر صحافی تھے۔ بمبئی ایئر پورٹ پر ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا آپ بھی ہم سفر ہیں۔ ان کی بے حد کم عمر بیوی نے بڑی لجاجت کے ساتھ چپکے سے کہا تھا: ''ڈیڈی یہ بہت سیدھے ہیں اور پہلی بار باہر جا رہے ہیں۔ ذرا ان کا خیال رکھئے گا۔'' ان مہذب بزرگ صحافی نے بھی مجھے ڈیڈی کہنا شروع کر دیا تھا۔

جب فضائی لڑکی نے شراب پیش کی آپ نے پینا شروع کر دیا۔ وہ مجھ سے بہت آگے بیٹھے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار اشارے سے منع کیا مگر اب وہ ''فارن ٹریول'' میں مصروف تھے کس کی سنتے۔ طہران پہنچنے سے ذرا قبل ایرانی لڑکی نے شراب کا بل پیش کیا تو گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے۔ ''ڈیڈی غضب ہو گیا۔ یہ چھوکری ہمارا دیوالیہ نکال دیا۔ ہمارا سارا فارن ایکس چینج ختم ہو جائے گا۔ ہمارا خیال تھا شراب بھی مفت ہے۔''

''میں نے بار بار آپ کو منع کیا۔ آپ نے اس وقت کیوں نہیں سُنا؟''

پٹر کار نے بہت توبہ تلا کی۔ "اب آپ کی بات ہمیشہ ضرور مانے گا۔ ڈیڈی ہماری بی بی کو مت بولنا۔"

اس وقت وہ شگوفہ نائٹ کلب میں بالکل پرستان میں پہنچے ہوئے تھے لہٰذا میری نظریں بچا کر ایک دور کی میز پر جا بیٹھے۔

"میری جان شب بخیر" کے بعد خانم جمیلہ بیلی ڈانسر تشریف لائیں۔

میرا خیال ہے شرق وسطیٰ کی یہ بیلی ڈانسر لوگ خفتا کو فوراً تاڑ لیتی ہیں۔ ناچ کے بعد اسٹیج سے اتر کر ملکتی ملکتی وہ سیدھی پٹر کار کی میز کی سمت گئی اور جا کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

اب رات کا ایک بج رہا تھا۔ "ہمیں صبح چھ بجے شیراز کے لیے پرواز کرنا ہے۔ اب چلنا چاہیے۔" میں نے ایرانی میزبان سے کہا۔

پٹر کار دوڑے ہوئے آئے بولے۔ "آپ چاروں کے ایر ٹکٹ متعلقہ افسر نے آج دوپہر مجھے دے دیے تھے۔ میں ٹھیک صبح ساڑھے چار بجے ہلٹن کی لابی میں آپ سے ملوں گا۔" وہ خود کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔

"بہت خوب! اب آپ بھی اپنی قیام گاہ واپس جائیے فوراً۔" میں نے جواب دیا۔

"ڈیڈی آپ باہر چلیے ہم کلوک روم سے اپنا اوور کوٹ لے کر آتا ہے۔"

نائٹ کلب سے باہر آ کر ہم پٹر کار کے انتظار میں مصروف ہو گئے اس وقت سڑک بالکل سنسان ہو چکی تھی۔ کہرہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم لوگ ڈیوڈ، بریندا، ایلین، ایرانی میزبان (جو ایک درباری افسر تھا) اور اس کی لڑکی ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے پٹر کار کی راہ دیکھ رہے تھے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ ایرانی میزبان اس دوران میں ان کو کلب میں تلاش کر آئے مگر وہ نہ ملے۔ "پولیس کو اطلاع کر دیجیے۔" میں نے غصے سے کہا اور ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ منسٹری آف کلچر کی لموزین بڑھا کر آگے لے آیا۔ ہم لوگ ہوٹل واپس پہنچے۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے، ڈیوڈ بریندا اور ایلین کے ٹکٹ پٹر کار کے پاس ہیں۔ میں نے گھبرا کر ایلین کو فون کیا۔ اس نے گھبرا کر پٹر کار کے ہوٹل

فون کیا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ موصوف ابھی واپس نہیں آئے۔

صبح ساڑھے چار بجے سے چالیس مغربی اخبار نویس مرد اور عورت اپنے اپنے کمروں سے اتر کر ہوٹل کی لابی میں جمع ہو رہے تھے۔ پتر کار ندارد۔ پانچ بجے منسٹری آف کلچر کا افسر جو ہمارے ساتھ شیراز و اصفہان جا رہا تھا کوچ لے کر آ گیا۔ اس نے کہا آپ چاروں کے لیے ایرپورٹ سے دوسرے ٹکٹ لے لیے جائیں گے مگر مجھے ان صاحب کے متعلق بڑا تردد ہے کہاں چلے گئے؟

''ٹھیک پانچ بجے کوچ ہلٹن کی ڈھال سے اتر رہی تھی کہ پتر کار ٹیکسی میں آتے دکھائی دیے۔ کوچ روک کر ان کو سوار کیا گیا۔ ایئرپورٹ پہنچ کر وہ میرے قریب آئے۔ شکل پر گھڑوں ندامت برس رہی تھی۔ انتہائی مسکینی سے کہا: ''دیدی ہم کو معافی دیو۔ ہم کلوک روم سے باہر آ رہا تھا خانم جمیلے بھر مل گیا۔ اس کو ہم بولا تھا مڈل ایسٹ کی نائٹ لائف کے بارے میں ایک آرٹیکل اپنے پیپر کے لیے لکھنا مانگتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک اور نائٹ کلب لے گیا۔ وہ شگوفہ سے بھی جیاسی بڑھیا تھا مگر دیدی پلیز ہمارا بی بی کو مت بولنا۔''

موصوف پر خفا ہونا بے کار تھا۔ لاعلاج تھے۔ نرمی سے دریافت کیا ''خانم جمیلے کون؟''

''وہی نرتکی۔ بہت ڈیسنٹ عورت تھا۔''

فرودگاہ شیراز کے سامنے گلاب کے تختے لہلہا رہے ہیں۔ ایلین کار میں بیٹھتے ہوئے دفعتاً بولی:

''یہ جگہ۔ بالکل یہی جگہ، یہی فضائیں میں سال بھر پہلے خواب میں دیکھ چکی ہوں۔ یہی کار۔ یہی لوگ۔''

''ایلین''۔ میں نے رسانیت سے جواب دیا۔ ''پتر کار نے اپنے حُمق سے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب اسی کی کسر ہے کہ تم سائیکک ہو جاؤ۔''

کاریں ایک قطار میں شہر سے باہر مزار حافظؒ کی سمت روانہ ہوئیں۔

''السلام علیکم حافظ جی''۔ میں نے دل میں کہا۔ ان اہلِ مغرب کو جو ساتھ جا رہے ہیں کیا

پتہ کہاں جا رہے ہیں۔ کہ در آں جا خبر از جلوہ ذاتم دارم۔

روضہ حافظ میں سرو شمشاد کے کنج۔ میوزیم چائے خانہ۔ پہلی بار پترکار نے ایک معقول بات کہی بولے "یہاں پر چائے خانہ کی بجائے میخانہ ہونا چاہیے تھا۔" پترکار پڑھے لکھے انسان تھے۔ ویدانت سے بھی علاقہ رکھتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے اصلی سادہ دل بندے۔

ایک دراز قد فوجی افسر اور اس کی خانم گلشن حافظؒ کے باہر سنسان سڑک پر سے اپنے بچے کی پریم گاڑی دھکیلتے چمنستان میں داخل ہوئیں۔ مزار خواجہ کے پاس پہنچ کر پریم ایک طرف کھڑی کی۔ تربت پر ہاتھ لگا کر فاتحہ پڑھی۔ خاموشی سے واپس چلے گئے۔

پترکار بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ اس وقت میں نے ان کی تمام بے وقوفیوں کو معاف کر دیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے: "دیدی حافظؒ کے کوئی میخانے والے شعر سناؤ نا دیدی۔"

"حافظ کی شراب کا مطلب آپ جانتے ہیں نا؟" مجھے فکر تھی کہ یہاں سے ہوٹل شیراز پہنچ کر بار پر نہ جا بیٹھیں کہ حافظ کے شہر میں پیروی حافظ کر رہا ہوں۔ فرمایا "دیدی! ہم کو معلوم ہے حافظ ہمیشہ پرماتما کے گیان کی بات بولتا تھا۔ کچھ سناؤ نا؟"

میں نے دماغ پر بہت زور ڈالا۔ چند شعر مع انگریزی ترجمہ گوش گزار کیے۔

جریدہ رو کہ گزرگاہ عافیت تنگ ست — پیالہ گیر کہ عمر عزیز بے بدل ست

بجز خدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت — در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند — گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

اور سنیے:

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

پترکار ایک صنوبر کے نیچے بیٹھ کر مراقبے میں چلے گئے۔ فرنگی اخبار نویس روضے میں مصروف گلگشت ہیں۔ اچھا ہے بے خبر رہیں۔

چچا سعدیؒ کے مقبرے کی اندرونی دیواروں پر جو اشعار کندہ ہیں لندن ٹائمز کا رپورٹر ان کو بغور دیکھ رہا ہے۔ "یہ سب کیا لکھا ہے؟" وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔

"گول کرو۔ اب تمھیں کون سمجھائے؟"

کپلنگ ٹھیک کہہ گیا تھا۔ مغرب و مشرق کی روحیں جداگانہ ہیں۔

ستاون میل دور پرسی پولس کو جانے والی شاہراہ۔ دونوں طرف خشک بنجر زمین پر چرواہے بکریاں لیے جا رہے ہیں۔ کار میں پچھلی سیٹ پر ایلین کے برابر ایک اطالوی جرنلسٹ آ بیٹھا تھا۔ ایلین نے چند منٹ بعد سرگوشی میں مجھ سے کہا! "یہ عجیب سا آدمی ہے۔ میں اس طرف بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

انگلستان کی پروگریسیو سوسائٹی کی پروردہ۔ اونچی سے اونچی منی اسکرٹ پہننے والی ایلین ایک مشرقی لڑکی کی طرح گھبرا رہی تھی۔ اس نے کسی بہانے پترکار سے جگہ تبدیل کر لی۔ انھوں نے بعد میں مجھ سے کہا کہ یہ انگریز لڑکی اتنا شریف ہے۔"

"آپ لوگوں کے دماغ سے یہ خیال کب نکلے گا کہ مغرب کی ہر لڑکی آوارہ ہوتی ہے؟" میں نے جواب دیا۔

دور سے پرسی پولس کے سرخ کھنڈر نظر آئے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ہم سب محلات کے کھنڈروں میں بکھر گئے۔ مبہوت، مرعوب ہکا بکا۔ دارائے بزرگ کے اس کاخ عظیم کو سکندر نے نذرِ آتش کر دیا تھا کڑکا سکندر بجلی کی مانند۔ ایک ضربِ شمشیر افسانہ کوتاہ۔

تخت جمشید کے ایک چبوترے پر سے ایک خوانچہ فروش لڑکا گذر رہا تھا۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور اس کا خوانچہ فرش پر گر گیا۔ معمولی مٹھائیاں زمین پر بکھر گئیں۔ وہ بے اختیار رونے لگا۔ وہ روتا جاتا تھا اور بے بضاعت اثاثہ چنتا جاتا تھا جو خاک آلود ہونے کی وجہ سے اب کوئی نہ خریدے گا۔

میاں خوانچہ فروش تم کیوں روتے ہو یہاں پورا پرسی پولس تباہ ہو چکا تم چند ریال کے نقصان پر روتے ہو۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔

پتر کار ٹہلتے ہوئے قریب آئے۔ فرمایا کوئی باموقع شعر سناؤ نا دیدی۔"

"اے خسرو زمانہ بکشا وچشم دیگر
درنامۂ سکندر احوال ملک دارا"

میں نے جواب دیا۔

"اور سنیئے

سرود مجلس جمشید گفتہ اندایں بود
کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

اور سنیئے

بنائے کوئی عمارت تو کس توقع پر
پڑا ہے قصر فریدوں ابن آدمی سونا

شیراز سے باسٹھ میل دور نقش رستم۔ پہاڑ کے اندر ترشے ہوئے مقابر شاہان ہخامنیشہ وزیر چمیں۔ شہریار سے چناں۔ رستم رہا زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا۔ بیک چشم برہم زدن شد تباہ۔ چہ تاج و چہ تخت و چہ گنج و سپاہ۔ کدام است جام جم و جم کجاست۔ یہاں کون کون ہستیاں مدفون ہیں۔ کسریٰ اول، دارائے کبیر، دارائے سوئم، کسریٰ دوم اور ایک چوکور سنگی عمارت کہ کعبہ زرتشت کہلاتی ہے۔

اور اب ہوٹل شیراز کے برآمدے میں لوگ باگ آرام کر رہے ہیں سارے گورے اور میمیں آرام کرسیوں پر نیم دراز سرد شیریں تربوز نوش کرنے میں معروف ہیں اور بیئر پی رہے ہیں۔

زاں بادۂ کہ از جم و کے ماندہ یادگار
لبریز کن کہ چشم بداز عیش مابدور

ہوٹل کے باغ میں بلبل ہزار داستان نغمہ سرا ہے۔

خون کرد درد لم اثر آواز عندلیب
گشتم چنانکہ ہیچ نماندم تحملے

شیراز سے واپسی پر راستے میں شہر کا قبرستان نظر آتا ہے۔ صد حیف کہ گلرخاں کفن پوش شدند۔

شیراز نہیں جانا چاہیے۔

اصفہان نصف جہان— ہوٹل شاہ عباس۔ فوئر کے وسطی فوارے میں دنیا بھر کے سکّے پڑے ہوئے ہیں۔ جو بیرونی سیاح یہاں لا کر بطور شگون ڈالتے ہیں۔ تحری کوائیز ان اے فاؤنٹین۔ مرصع معنور سنہری الف لیلوی مہمان سرائے جسے عہد شاہ عباس بزرگ کی ایک کاروان سرائے کے قطعۂ زمین پر اسی انداز سے تعمیر کیا گیا ہے، ایران جدید کا ٹورسٹ شوپیس نمبرون۔ دیواریں قد آدم ایرانی تصاویر سے مزیّن۔ ہوٹل کیا ہے عہد صفویہ کا رفیع الشان شاہی محل ہے اور نگار خانہ مانی و بہزاد۔

مہمان سرائے کے خدام نے عہد صفویہ کی پوشاک پہن رکھی ہے۔ ایک ریستوران میں شام کو اصفہان کے مشہور سازندے سنتور بجاتے ہیں۔ پائیں باغ کے میکدے کے اندر قدیم پوشاک میں ملبوس افسانہ خواں شاہنامہ فردوسی پڑھتا ہے۔ قلیان رکھے ہیں۔ دیواریں ڈھالوں اور تلواروں سے آراستہ۔ مغربی سیاح قالینوں پر بیٹھے قلیان گڑگڑا رہے ہیں۔ ان کے تصوّرات کا روایتی افسانوی ایران ان کے سامنے موجود ہے۔

دوپہر کو ایک ایوانِ طعام میں بیگم آغا خان اور پرنس امین بیٹھے نظر آئے کہ جشن تاج گذاری کے لیے آئے ہیں۔

ہوٹل شاہ عباس سے ملحق ایک قدیم اور مشہور مذہبی مدرسہ واقع ہے۔ میں نے کل شاہ عباس کے جنرل منیجر سے کہا تھا کہ اس مدرسے کے ریکٹر سے ملنا چاہتی ہوں۔ انھوں نے ذرا تعجب سے مجھے دیکھا پھر معلوم کر کے بتایا کہ وہ طہران گئے ہوئے ہیں۔ مدرسے کا گنبد میرے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا ہے۔ رات کو ایک اور ایوانِ طعام میں مغربی آرکیسٹرا تازہ ترین

مغربی دھن بجا رہا ہے۔ ایرانی لڑکے لڑکیاں مصروف رقص۔ ہم سارے بیرونی صحافیوں کا گروہ ایک طویل میز پر بیٹھا ہے اس گروہ میں دو نوجوان ترک جرنلسٹ بھی شامل ہیں۔ احسان اور گل عذار خانم۔ دونوں انقرہ سے آئے ہیں۔

میرے نزدیک بیٹھا لندن ٹائمز کا رسے شہزادی مارگریٹ اور لارڈ اسنوڈن کا ذکر کر رہا ہے۔ رسے لارڈ اسنوڈن کا پرانا دوست ہے۔

اداس صورت ترک لڑکی گل عذار خانم ایک ہنگرین جرنلسٹ کے مقابل بیٹھی ہے۔ ہنگرین اس لڑکی سے ذرا متاثر معلوم ہوتا ہے۔ گل عذار اداسی کے ساتھ رقصاں جوڑوں کو دیکھ رہی ہے۔ ہنگرین اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ گل عذار بہت حسین لڑکی ہے۔ اسے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشست۔

ہنگرین اس سے بات شروع کرتا ہے۔ وہ جواب دے کر پھر دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ اے ترک شوخ ایں ہمہ ناز و عتاب چیست۔

رسے آہستہ سے مجھ سے کہتا ہے "یہ لڑکی اتنی غمزدہ کیوں رہتی ہے؟"

ہنگرین اس سے پوچھتا ہے۔ "تم کبھی ہنگری آئی ہو؟"

"نہیں" ۔ وہ آہستہ سے جواب دیتی ہے۔ "میرا منگیتر 1956 عیسوی میں ہنگری میں مارا گیا تھا۔"

"اوہ۔ مجھے افسوس ہے۔" ہنگری کھانے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مانچسٹر گارجین کے انگریزی نمائندہ نے جو عرب اسرائیل محاذ سے آ رہا ہے اور جو میرے بائیں جانب بیٹھا ہے۔ بیرہ خزر کی کیویار کھاتے کھاتے اچانک اس سے آہستہ سے کہا:

DAY AFTER TOMORROW
I WILL GO BACK
TO THE WARS.

دوسری صبح اصفہان کے ایک مشہور مصور آقائے علی سجادی مینا تورست کا نگار خانہ۔ آقائی سجادی روایتی مینا تور بناتے ہیں۔ فوراً ایک مختصر تصویر سیاہ قلم سے بنائی شروع کی اور کہ آپ میں سے جس کا جی چاہے اسے لے لیجیے۔

گروہ میں مغربی جرمنی کی ایک ذرا پختہ عمر خاتون صحافی بھی شامل تھیں۔ انھوں نے تصویر کو بہت للچائی نظروں سے دیکھا۔ میرے ہم وطن پترکار فوراً بولے: "ہاں ہاں آپ سب سے زیادہ ضعیف اور سینئر لیڈی ہیں۔ یہ تصویر آپ ہی لے لیجیے۔"

میں نے آہستہ سے ان سے کہا: "عورت کتنی ہی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو کبھی اس طرح نہیں کہتے، یہ خلاف تہذیب بات ہے۔"

"کیوں؟ ازنٹ شی اَین اولڈ لیڈی؟" با آواز بلند دریافت کیا۔ سب بے حد خجل ہوئے۔ بے چاری جرمن خاتون کھسیانی ہنسی ہنسیں۔

آقائے علی سجادی نے انتہائی گیلنٹ انداز سے اٹھ کر تصویر ان کو پیش کی۔

اصفہان سے باہر ارمنی شہر جلفا میں دوسرے روز ہم لوگ کیتھڈرل کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ آپ نے فرمایا" یہ کیا بات ہے کہ یہ ہے تو چرچ مگر ایک دم مسجد کے موافق معلوم دیتا ہے۔"

"یہ چرچ" اب میں نے ان کو ایرانی فن تعمیر پر ایک مختصر لیکچر دینا مناسب جانا۔

"شاہ عباس کبیر نے سترھویں صدی میں اپنی ارمنی رعایا کے لیے بنوایا تھا لہٰذا اسی دور کا طرز تعمیر۔"

"اچھا تو ایسا بولو۔"

"اندر قربان گاہ پر اٹھارھویں صدی کا ایک حسین پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پھول کاڑھتے کاڑھتے ایک ارمنی دوشیزہ یسوع کو پیاری ہو گئی تھی۔" پادری نے بتایا۔

"ویری سیڈ۔ ویری سیڈ"۔ پترکار نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلایا۔ میوزیم کے قدیم نسخوں میں اٹھارھویں صدی مدارس کے ارمنی چھاپہ خانوں کی شایع کتابیں رکھی تھیں۔ گرجا کی دیواروں پر حسین فریسکو۔

باہر خاموش سڑک پر زرد پتے اڑ رہے تھے۔ گل عذار خانم اور احسان کوچ میں بیٹھے رہے۔ ایک ارمنی گرجا کے اندر جانا انہیں گوارا نہ تھا۔ "تم کو تو معلوم ہے 1914 عیسوی میں سلطنت عثمانیہ کس طرح تباہ ہوئی"۔ گل عذار نے آہستہ سے کہا۔

قومی نفرتیں دیرپا ہوتی ہیں۔

رتے واپس آکر کوچ میں بیٹھا۔ اچانک اس نے سامنے نظر ڈالی۔ گرجا کے پھاٹک پر جو کلاک لگا تھا اس پر لکھا تھا۔ "میڈ ان ہانگ کانگ 1873ء" رتے ہنس پڑا۔ "ایران میں ارمنی چرچ اور اس پر ہانگ کانگ کا بنا برطانوی کلاک۔"

جلفا سے آگے کوئے حکیم نظامی ہے اور کوئے سنگ تراشہا۔ زائیدہ رود کے پل پر سے گزر کر خیابان خاقانی کو پیچھے چھوڑتے ہم لوگ شہر واپس آئے (ذرا اصفہان کی سڑکوں کے نام سنیے۔ خیابان صائب۔ کوئے دالان بہشت۔ خیابان سروش۔ خیابان صور اسرافیل، خیابان ہاتف، کوئے عطارہا، خیابان ناصر خسرو، کوئے ابن سینا اور محلے: جوئبارہ، گل بہار، لون بان)۔

لیکن زائیدہ رود یعنی زندہ رود نہایت اینٹی کلائمکس نکلی۔ ایک پتلی سی مٹیالی ندی اور اس پر شاہ عباس کبیر کا بنوایا ہوا حسین پل۔ جس طرح لینن گراڈ پیٹر اعظم کا شہر ہے۔ اصفہان میں شاہ عباس کی شخصیت کی جھلک ہر طرف موجود ہے۔

مسجد شیخ لطف اللہ کے پھاٹک کی محراب پر نادعلی لکھا تھا۔ پھاٹک کے دونوں طرف جو گل دان تراشے گئے تھے ان میں سے ایک ذرا سا نامکمل تھا۔ آقائی منوچہر گائیڈ نے بتایا: "صناع کامل صرف خدا ہے۔ اس وجہ سے ایرانی حسن کار اپنے فن پاروں میں ایک ذرا سی کسر چھوڑ دیا کرتے تھے۔"

"یہ بھی اچھا پوائنٹ ہے"۔ پتر کار نے سنجیدگی سے کہا۔

"مسجد کے صحن میں اسکول کے بچوں کے ایک گروہ نے ہمیں گھیر لیا۔ یونیفارم میں ملبوس

فرنچ اور فارسی بولتے بچے اپنی استانی کے ساتھ سیر کرنے آئے تھے۔

''بتاؤ ترکی کہاں ہے؟'' احسان نے ان سے انگریزی میں پوچھا۔ استانی نے سوال کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ایک سرخ گالوں والے بچے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

''وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔''

''یہ دنیا کی سب سے بڑی، سب سے شاندار مسجد ہے۔'' ایک بچے نے مجھ سے کہا۔

قوم پرستی۔

''انھوں نے دلی کی جامع مسجد نہیں دیکھی۔'' پترکار نے مجھ سے چپکے سے کہا۔

قوم پرستی۔

''اس مسجد کی ساری حسن کاری آذر بائیجان کے ترک صناعوں نے کی تھی—''

احسان نے چپکے سے مجھ سے کہا۔

قوم پرستی۔

قصر چہل ستون میں اطالوی کاریگر قدیم فریسکو ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ ایک فریسکو میں شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں ہمارا ہمایوں بے چارہ سانولا اور چھوٹا سا، ایرانی بادشاہ کے سامنے دوزانو بیٹھا ہے اس کے مغل امرا بھی سانولے چھوٹے سے۔ سامنے رقاصہ ناچ رہی ہے ملٹری ایڈ لینے آیا تھا۔ مل گئی۔

میں نے پترکار کو بتایا۔ ان کا جذبۂ وطن پرستی پھر جاگ اٹھا۔ ''ویدی ہمارے انڈین بادشاہ کو اتنا چھوٹا سا کیوں دکھایا؟''

''ہمارے مغل مصوروں نے اپنی تصاویر میں صفوی بادشاہوں کو ننھی دکھایا ہوگا۔''

میں نے جواب دیا'' اور یہ دیکھیے اس محل میں ہیں صرف بیس ستون۔ کہلاتا ہے چہل ستون۔ وہ سامنے تالاب میں ان ستونوں کا عکس پڑتا ہے ان کو چالیس کر دیا۔''

''یہ ایرانی بڑے طباع لوگ ہیں''۔ پترکار نے سر ہلا کر کہا۔

طہران میں شاہراہ پہلوی کے کنارے ایک سائیڈ واک کیفے میں دھاری دار چھتریوں کے نیچے بیٹھے لوگ قہوہ پی رہے ہیں۔ نزدیک ایک بے حد فربہ سرمئی بلی ایک چنار کے نیچے قناعت سے آنکھیں موندے دھوپ سینک رہی ہے۔

"وہ دیکھو ایرانی بلی۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"ایران میں کیا جاپانی بلی ہوگی؟" بریندا نے جواب دیا۔ بات بھی معقول تھی۔

ایک سبزہ زار میں صنوبر کے نیچے قالیچہ بچھائے ایک غریب کنبہ تربوز کھا رہا تھا۔ سامنے نان رکھے تھے۔ ڈیوڈ نے فوراً کہا: "اے جگ آف وائن۔ اے لوف آف بریڈ اینڈ داؤ۔"

ہلٹن کے نزدیک صنعتی نمائش لگی ہے۔ شاہ و شاہ بانو اسے ملاحظہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک صنوبر کے نیچے ایک طویل القامت عباپوش عرب سب سے الگ تھلگ کھڑا سارا نظارہ دیکھ رہا تھا۔

تا ز صحرائے رسیدش محشرے

آنکہ داد اور احیات دیگرے

"نمائش کی چہل پہل سے کچھ دور اقوام متحدہ کے خیمے نصب تھے۔ وہاں ایک خاموش روش پر ایک صاحب ٹہلتے نظر آئے۔ صورت کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ ایران میں اجنبی۔

ن۔ م راشد کہنے لگے "میں پچھلی جنگ عظیم میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔ برسوں سے یہاں رہتا رہا ہوں۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایران کتنا بدل گیا۔"

"اور ہمارے دیکھتے دیکھتے دنیا کے بہت سے ملک کیسے بنے کیسے بگڑے"۔ میں نے جواب دیا۔

زمانہ جہاں زادہ وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو اور فانوس و گلدان کی مانند۔

●●●

(2)

تعارف: رمیش سنگھوی سابق فارن ایڈیٹر بلٹز نے جن کو میں لندن کے زمانے سے جانتی تھی جہاں وہ قانون کے طالب علم تھے۔ آج سے پندرہ سولہ سال قبل بہ طور صحافی شاہ ایران کو انٹرویو کیا۔ اس کے بعد کئی بار شاہ سے ملے۔ واپس بمبئی آ کر بہت تعریف کی: "بے حد ذہین پڑھا لکھا اور مدبر آدمی ہے۔ سوشلسٹ ہو گیا ہے۔ جاگیرداروں اور ملاؤں کا زور اس نے ختم کیا۔ عورتوں کو مکمل آزادی اور حقوق دیے۔ سپاہِ دانش گاؤں گاؤں تعلیم بالغاں میں مصروف ہے۔ دونوں میاں بیوی ملک و قوم کی خدمت میں جٹے ہوئے ہیں۔"

رمیش خود نہایت ذہین اور پرانے پروگریسو آدمی تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے شاہ کی ضخیم سوانح حیات لکھ کر لندن سے شائع کی۔ لندن میں ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا جس میں مختلف ملکوں کی حکومتوں کے پبلک ریلیشنز کی کتابیں چھاپنا شروع کیں۔ حکومت ایران، شاہ اور انقلاب سپید کے متعلق کتابوں کا پورا سیٹ لندن سے شائع کیا۔ اس سلسلے میں ان کی شاہ سے کافی گہری دوستی ہو گئی۔ 1969 عیسوی میں رمیش سنگھوی نے مجھ سے کہا "شاہ بانوے ایران ایک نہایت غیر معمولی قسم کی خاتون ہیں۔ مغرب میں ان کی سوانح حیات بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ فرح پہلوی ایک مڈل کلاس لڑکی ہے اور عوام دوست۔ اور اپنے ملک میں ملکہ ثریا کے برعکس نہایت ہر دل عزیز ہو چکی ہیں کیونکہ سماجی فلاح و بہبود کے لیے ذاتی طور پر خود ان تھک کام کر رہی ہیں۔ ملنسار اور نیک دل ہیں۔ میں نے شاہ سے کہا ہے کہ ہر مجیسٹی سے متعلق انگریزی میں کتاب لکھوائیں۔ شاہ بانو ایران کی عورتوں اور بچوں اور فن کاروں کے لیے بہت کچھ کر رہی ہیں۔ میں نے شاہ سے تمھارا تذکرہ کیا ہے کہ اس قسم کی سوانح حیات تم بہت اچھی طرح لکھ سکو گی۔ تم ایران کی تاریخ و تمدن سے بخوبی واقف ہو اور 'فرح اسٹوری' کے ہیومن اینگل کو بھی سمجھتی ہو۔ اس کتاب کو یورپ کی چھ زبانوں میں انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کیا جائے گا اور 1971 عیسوی میں ایرانی

شہنشاہیت کے ڈھائی ہزار سالہ جشن کے موقع پر ریلیز کی جائے گی۔ میں نے رچرڈ فرائی سے طے کرلیا ہے۔ تاریخ ایران کے اس موقع کے لیے وہ کتاب لکھیں گے تمھاری اور رچرڈ فرائی کی کتابیں ایک ساتھ ریلیز ہوں گی۔"

(رچرڈ فرائی "ایران قدیم" کے مصنف ایک نامور مستشرق اور مورخ ہیں) چند ماہ بعد رمیش لندن سے آئے تو بتایا کہ اب یورپ اور امریکہ کی چند مشہور جرنلسٹ خواتین اور حضرات شاہ بانو کے متعلق کتاب کا اسائنمنٹ حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن شاہ بانو کا اصرار ہے کہ یہ کتاب مشرقی مصنفہ ہی لکھیں کیونکہ بحیثیت ایک جدید ایشیائی مسلم خاتون وہ اس موضوع کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گی۔

اخیر ستمبر 1970 عیسوی میں رمیش نے طہران سے ٹرنک کال کیا کہ جلد از جلد طہران پہنچو۔ فرح پہلوی چاہتی ہیں کہ اکتوبر کے مہینے میں تم زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزار سکو۔

دو روز بعد دیموسنگھوی نے مجھ سے کہا۔ رمیش نے پھر طہران سے فون کیا تھا وہ لندن چلے گئے تم فوراً ایران روانہ ہو جاؤ۔ منسٹری آف کورٹ تمھاری میزبان ہوگی اور وہ تمھارا سارا پروگرام مرتب کر چکی ہے۔

1. 'سنڈریلا اسٹوری'

اکتوبر 1970 عیسوی اتوار کا دن۔ فرودگاہ مہرآباد کے باہر ایک کوائیسک میں ایک اہل کار ایرانی کیتھولک لڑکی سیاہ جالی کا رومال اوڑھے ہاتھ میں تسبیح لیے اپنی ڈیوٹی پر مستعد بیٹھی تھی۔ چہرے مہرے سے یہ لڑکی ارمنی معلوم نہیں ہوتی بلکہ خالص ایرانی۔ پچھلی صدیوں میں یورپین مشنری یہاں کافی لوگوں کو بپتسمہ دے گئے گو ایران سمیت خاور میانہ میں عموماً ہر جگہ کا م ہے تھے۔

دوبارہ رویال ہلٹن ہٹل۔ کافی شاپ میں بیرونی سیاحوں کا مجمع۔ اس کافی شاپ میں اکثر مشاہیر عالم بیٹھے نظر آتے۔

رات کو اپنے کمرے سے رمیش کو لندن ٹرنک کال کی۔ رمیش نے کہا: ''پہلا کام تم یہ کرو فویرز میں کتابوں کے اسٹال سے شاہ کی کتاب خرید کر اسے پڑھ لو۔ اگلے ہفتے میں ایک مشہور فوٹوگرافر اور فلم ڈائرکٹر طہران بھیج رہا ہوں۔ اپنی کتاب کے لیے اس سے شاہی خاندان کی تصویر کھنچوانا۔''

''میں اس کہانی میں بالکل ہیومن اینگل چاہتی ہوں NO POLITICS میں نے کہا۔

''اور قصیدہ خوانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بالکل ہیومن اینگل''۔ رمیش کی آواز آئی۔ ''یہ ویسٹرن ریڈرشپ کے لیے ایک سنڈے ریڈنگ اسٹوری ہے۔ کیسی قصیدہ خوانی۔''

''لیکن میں محض FAIRY TALES نہیں لکھتی۔ اس کے پیچھے پوری تاریخ ایران ہے۔''

''ہاں لیکن ہسٹری سے کتاب کو HEAVY مت کر دینا''۔ رمیش بے چارے نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔

''اس کی تم فکر مت کرو COLLIERS میگزین پڑھنے والوں کو بھی تاریخ ایک دلچسپ انداز سے سمجھائی جا سکتی ہے۔ سارا ویسٹ WEST! اسلام اور ایشیا کے متعلق بالکل جاہل ہے حالانکہ اسلام یہاں ایران میں، میں نے دیکھا ہے کہ بالکل PLAY DOWN کیا جا رہا ہے لیکن بہر حال فریم ورک تو وہی ہے۔''

''اس میں پھر سیاست آ جائے گی۔''

''وہ سب میں دیکھوں گی کس طرح لکھوں۔'' میں نے جواب دیا ''گڈ نائٹ''۔

اسلام، ملائیت، تودہ پارٹی۔ ڈاکٹر مصدق، ڈاکٹر حسین فاطمی۔ انقلاب سُرخ انقلاب سپید۔ یہ سنڈے ریڈنگ اسٹوری نہیں تھی۔

سارا طہران بے حد پُر امن ہے اور انتہائی منظم۔ جلسے جلوس، سیاسی ہنگامے جھگڑے فساد ناپید۔ ہر طرف دولت کی ریل پیل۔ بڑھیا ڈپارٹمنٹل اسٹور، اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ۔ اونچے اونچے بنک۔ موٹر سائیکل سوار زنانہ پولیس کے دستے۔ چپے چپے پر شاہ اور شاہ بانو اور ولی

عہد کے عظیم الجثہ پورٹریٹ۔ ALL THIS IS TOO GOOD TO BE TRUE کل ایک مغربی سیاح مجھ سے کافی شاپ میں کہہ رہا تھا۔

منسٹری آف کورٹ کے وسیع باغ میں چیڑ کے اونچے درخت موسم خزاں کی ہوا میں سرسرا رہے ہیں۔ اندر جگمگاتی خاموش راہداریوں میں نیلی کوٹ اور دھاری دار پتلونوں میں ملبوس درباری افسر بتوں کی طرح ساکت و جامد کھڑے ہیں۔ یورپ کے شاہی خاندان ذرا بے تکلف ہو گئے ہیں مگر برطانیہ اور ایران کی شاہی روایات قواعد و ضوابط میں مجال ہے جو سر مو فرق پڑا ہو۔ دربار ایران یورپ کے کسی ملک کا رائل کورٹ معلوم ہوتا ہے۔ یورپ میں محض البانیہ ایک مسلمان بادشاہ کا ملک رہ گیا تھا جس کے آخری فرماں روا شاہ احمد زوغو 1939 عیسوی تک تو تھے اب جانے کہاں ہیں۔ البانوی نژاد شاہ فاروق بے چارے، جو تاش کے چار بادشاہوں اور پانچویں برطانوی بادشاہ کے متعلق لطیفہ سنا گئے۔ عالم جلاوطنی میں انھوں نے بھی اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ وہ شہنشاہ آریہ مہر کے سابق برادر نسبتی تھے۔

منسٹری آف کورٹ کے اندر آغائے موثقی کا وسیع دفتر (یعنی آغائے متقی اہل ایران ق کو ع ادا کرتے ہیں) موصوف جنوبی ایران کے باشندے ہیں۔ اس وجہ سے ذرا گندمی رنگت والے نوجوان ہیں۔ وسیع دریچوں میں سے درختوں کی دھوپ چھاؤں اندر آ رہی ہے۔ علیا حضرت کے ساتھ ملاقاتوں کا سارا پروگرام ان کی میز پر موجود ہے۔ باہر شمران کے پُر فضا علاقے میں سردی کی لہر بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ ماہ آبان ہے۔ فصل پریز بہت جلد درختوں کے پتے ارغوانی ہو جائیں گے۔

ماہ آبان انتہائی چہل پہل کا زمانہ ہے کہ اس مہینے میں سارے ملک میں بے حد دھوم دھام سے شاہ، ان کی توام بہن شہزادی اشرف، شاہ بانو اور ولی عہد کی سال گرہیں منائی جاتی ہیں جو سب اتفاق سے اسی مہینے میں پیدا ہوئے تھے۔

شمران میں ڈپلومیٹک کور والوں کی کوٹھیاں: سارے شہر میں عالی شان مکانات اور جدید اپارٹمنٹ بلاک، محلّے کی صاف و شفاف گلیوں میں پرانے مکانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اونچی چہار دیواری، ڈیوڑھی کے اندر سیب کے درخت، افسانوی ماحول، سارا دارالسلطنت صاف ستھرا اور منظم۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایشیائی شہر ہے۔

اختر حسین رائے پوری ایک وضع جدید کے دو منزلہ مکان کی دوسری منزل پر مقیم ہیں۔ پھاٹک پر انٹرکوم کا مائک نصب ہے۔ اندر سے اختر حسین صاحب کی آواز آئی۔ اوپر حمیدہ باجی (علی گڑھ والے چچا ظفر عمر کی سب سے بڑی بیٹی) حسب عادت پاندان سامنے رکھے تخت پر بیٹھی ہیں۔ راشد صاحب کی طرح ڈاکٹر اختر حسین بھی یہاں یونیسکو میں تعینات ہیں۔ عنقریب پیرس جانے والے ہیں۔

راشد صاحب ایک اور رہائشی علاقے کی دو منزلہ کوٹھی میں رہتے ہیں۔ سامنے بڑا باغ، طرز معاشرت مغربی بیوی انگریز نصف اطالوی۔ پہلی بیگم کے انتقال کے بعد جب راشد صاحب نیویارک واپس گئے یہ خاتون ان کے بچوں کی گورنس تھیں۔ نہایت معقول اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ راشد صاحب سے پچھلی بار میری ملاقات طہران میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل کراچی میں۔ موصوف کے خیالات میں زیادہ پختگی اور توازن آچکا ہے۔ بہ لحاظ سیاسی نظریات اب اتنے اینٹی انڈیا بھی نہیں رہے۔ طہران پہنچنے کے تیسرے روز جب میں نے موصوف کو ان کے دفتر فون کیا کہنے لگے اخاہ آپ اس مرتبہ کس سلسلے میں تشریف لائیں؟

عرض کیا ع

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

بہت خوش ہوئے۔ فوراً اپنی کسی تازہ نظم کا ایک با موقع مصرع سنایا۔ شام کو اپنی نئی کتاب "لا مساوی انسان" کی ایک جلد لے کر ہلٹن تشریف لائے۔ کہنے لگے "اس مرتبہ آپ طہران کے جدید شاعروں اور ادیبوں سے ضرور ملیے گا۔ ملنے اور بات کرنے کے قابل لوگ ہیں۔ ایک نئی ذہنی دنیا انھوں نے آباد کی ہے۔" میں نے جواب دیا "چند ہفتے شہبانو کے ساتھ گذارنے کے بعد

اس طرف توجہ مبذول کروں گی۔" فرمایا "اس کے بعد کہاں آپ کہاں وہ لوگ"۔ میں نے کہا آپ کو حافظ اور ابو اسحٰق انجو کا قصہ یاد ہے کہ وہ اس بادشاہ کو خسروئے روئے زمیں کے ساتھ ساتھ خوشۂ زماں بھی کہتا تھا۔ امیر مبارز الدین کے دوسرے بیٹے جلال الدین شاہ شجاع کے لیے کہ علم دوست تھا کہا تھا۔"

"وہی جس نے کہا کہ نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت وغیرہ لیکن شاہ بانو سے ایران تو خود آرٹسٹ اور علم دوست خاتون ہے اور میں تو جاروب کشِ مزار حافظ ہوں۔ خاک پائے حافظ وغیرہ۔"

"شاہ بانو سنا ہے بہت نیک دل اور بھلی بی بی ہے۔" راشد صاحب نے جواب دیا۔ "لوگ شاہ سے ڈرتے ہیں اور شاہ بانو سے محبت کرتے ہیں۔ ان کا وہ قصہ تو آپ نے سنا ہوگا ایک مرتبہ یہ گرمیاں گزارنے کیسپین کے کنارے گئی ہوئی تھیں۔ ایک روز جیپ خود چلاتی کسی پہاڑی راستے سے گزر رہی تھیں۔ ایک دیہاتی بڑھیا نے کوئی یورپین لڑکی سمجھ کر ہاتھ اٹھایا اور لفٹ مانگی۔ شاہ بانو نے جیپ روک کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بڑھیا اپنے گاؤں جا رہی تھی۔ راستے بھر اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کی۔ آخر میں پوچھا بی بی تم کون ہو اور ادھر کیسے آئیں۔ انکسار سے جواب دیا "زنِ شاہ ہستم"۔

2. 'کاخ سعد آباد'

کاخ سعد آباد شمران میں رضا شاہ کبیر نے بنوایا تھا۔ یورپین وضع کا عظیم الشان محل۔ کئی ایکڑ پر پھیلے اس کے پارک لینڈ میں بلند و بالا درختوں پر صبح کی دھوپ، بارش کی لطیف پھواروں کی طرح برس رہی تھی۔ سارے میں بڑی مؤدب خاموشی طاری تھی۔ برآمدے میں چند السیشن بیٹھے محوِ خواب۔ اندر وسیع مرمریں ہال میں چند درباری افسر اس طرح نیل کوٹ پہنے مجسموں کی طرح استادہ۔ فرانسیسی وضع سے آراستہ کمرۂ انتظار میں ایک نیل کوٹ والا افسر بغیر دودھ کی چائے پیش

کر کے خاموشی سے واپس چلا گیا۔ میں اٹھ کر ہال میں گھومنے لگی۔ کاسنی رنگ کا فراک پہنے شاہ بانو دوسری طرف سے کسی سے کچھ کہتی ہوئی گذر گئیں۔ چند منٹ بعد ایک اے ڈی سی مجھے اوپر شاہ بانو کے دارالمطالعہ میں لے گیا۔ الماری میں فن تعمیر اور موڈرن آرٹ پر فرانسیسی کتابیں رکھی تھیں۔ کچھ دیر بعد علیا حضرت اندر آئیں۔ دوبارہ چائے پیش کی گئی۔ ہر امپریل مجسٹی نے سگریٹ سلگایا۔ ایک نارمل ملنسار قسم کی لڑکی۔ ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کے بعد کہا: ''شام کو بھی آ جانا میں ٹیلی ویژن پر یہیں سے یوم اطفال کے لیے ایک پروگرام ٹیلی کاسٹ کروں گی۔ پرسوں ہم لوگ خراسان چلیں گے۔

گھنٹی بجائی۔ سکریٹری آقائی مسعود بارزین حاضر ہوئے۔ ''خانم کو خراسان لے جانے کے لیے کمانڈر پلین تیار رہے۔''

مسعود بارزین نے سر تسلیم خم کیا۔

شاہانِ مغلیہ کے محلات میں بھی اس طرح احکام صادر ہوتے ہوں گے اور ان سب شاہانِ عالم اسلام نے اوّل اوّل اسی ایران کے شاہانِ ساسانیہ کے آداب اختیار کیے تھے اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے اس کاخ سعد آباد نے پرسی پولس اور پسارگاد اور شاہانِ ساسانیہ اور صفویہ اور قاچاریہ کے آداب ورسوم کو شہنشاہی یورپ کے رائل ایٹی کیٹ سے منسلک کر رکھا تھا خود ہمارے نظام حیدر آباد کے ہاں چھوٹے پیمانے پر یہی سب کچھ ہوتا ہوگا۔ اور 1919 عیسوی تک باب عالی قسطنطنیہ میں اور 1952 عیسوی تک قصر شاہ فاروق قاہرہ میں۔ لیکن ایرانی تکلفات اور شائستگی کی کوئی حد وانتہا نہیں اور اب یہ بے اندازہ دولت وثروت۔ پیٹر وڈ الرز کا شاہی خاندان۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اگر کہیں ایران نہ فتح کیا ہوتا تو اسلامی تہذیب کا رنگ ہی بالکل مختلف ہوتا۔ شروع میں کیا سادگی تھی۔ اونٹ سے اترے۔ خلیفہ وقت کو السلام علیکم یا امیر المومنین کہا اور پھسکڑا مار کر سامنے بچھے ہوئے بوریے پر بیٹھ گئے۔

شام۔ کاخ سعد آباد کے پہلو میں ایک وسیع تالاب کے سرسبز کنارے پر سرو کے درختوں کے نیچے چند کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ درختوں کے پیچھے آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ٹیلی ویژن

والے اپنا ساز وسامان درست کرنے میں مشغول تھے۔ ایک ایرانی لڑکی کرسچین وائیور کی ماڈل کی طرح مکمل جو شاہ بانو کا انٹرویو لینے والی تھی، کرسی کے پاس منتظر کھڑی تھی۔

''اچانک دور درختوں میں سے بلبل کی آواز سنائی دی۔ میں نے آقائے مسعود بارزین سے پوچھا: ''ایران میں بلبل کہاں کہاں پائی جاتی ہے؟'' انھوں نے فوراً میرے سوال کو نوٹ کیا۔

''کل آپ کو مطلع کر دوں گا۔''

کچھ دیر بعد علیا حضرت کاخ کی اونچی مرمریں سیڑھیاں اترتی نظر آئیں۔ پیچھے پیچھے ایک اے ڈی سی ان کا منک کوٹ بازو پر ڈالے آ رہا تھا۔ علیا حضرت آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں اور یوم اطفال کے لیے اپنی فی البدیہہ تقریر نرمی اور روانی کے ساتھ شروع کی۔

پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ اے ڈی سی منک کوٹ لیے سرو کے نیچے استادہ تھے۔ تالاب میں فوارے چل رہے تھے۔ ٹی وی والے لڑکے لڑکیاں، اے ڈی سی سکریٹری، سنہرے بالوں والی ملکہ، یہ سارا سنہرا افسانوی منظر یورپین تھا۔ محض ان کی فارسی زبان اور دور سے آتی بلبل کی آواز یاد دلاتی تھی کہ یہ یورپ نہیں، ایران ہے۔

ایران مشرق و مغرب میں واقع ہے۔ ہمیشہ سے جب وہ یونان سے لڑا اور روم سے لڑا اور پچھلی چند صدیوں میں روس سے لڑا۔ جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے وہ مغرب سے قریب تر رہا ہے۔ دریائے مازندران یعنی بحیرہ کیسپین اور کوہستان قفقاز کے جنوب میں پھیلے کشور ایران اور اس کے پایہ تخت طہران کا رخ اب مغرب کی جانب بہت زیادہ ہے۔

طہران کا شاہی ایرپورٹ، جو صرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہے مرمریں ایوان، مخملیں پردے، بڑھیا صوفے، نیلی کوٹ والے افسر ٹپ ٹپ پھر رہے ہیں۔ میں نے مسعود بارزین سے پوچھا کیا رضا شاہ کبیر کے زمانے میں بھی یہ شاہی شان و شوکت اتنی ہی تھی یا اس سے کم۔

''بالکل اسی طرح تھی۔'' انھوں نے جواب دیا۔
شاہی خاندان صبح سویرے خراسان کے شہر برجند جا چکا تھا۔ ایک افسر نے آ کر کہا۔
''خانم حیدری کے لیے کمانڈ رتیار ہے۔''

3. نوشتہ من ایں نامہ پہلوی

اس چھوٹے سے چار سیٹ کے طیارے کو جو شاہ بانو کی ذاتی فضائی بیڑے سے تعلق رکھتا تھا، ایک نوعمر ایرانی ہوا باز اڑا رہا تھا۔

کمانڈر طہران سے اٹھ کر طلوع خورشید کی سرزمین کی طرف مڑا۔ گو اس وقت خورشید غروب ہونے والا تھا۔ نیچے خشک چٹیل میدان۔ جگہ جگہ گول غار سے، جیسے چاند کی سطح۔ خورشید دیکھتے دیکھتے خراسان کی عمیق گھاٹیوں میں اتر گیا۔ اندھیرا پڑے ہم شہر برجند میں اترے۔ تاریک رات میں ہوائی اڈے سے کار میں بیٹھ کر بہت دور ایک صحرائی امیر کے الف لیلوی مکان پر پہنچے۔ یہ فضائیں تہران کی فضاؤں سے مختلف تھیں۔ یہ بالآخر شرق تھا لیکن وہ خراسانی امیر اور اس کے گھر کی خانمیں سب فرانسیسی نما۔ کھانے کی طویل میز پر دریائے مازندران کے کیویار کے انبار۔ اعلےٰ درجے کی شراب۔ خانم حیدری شراب نہیں پیتیں؟ مے نوش میزبان خانموں کا اظہار استعجاب۔ ذرا سی بھی نہیں؟ شیری بھی نہیں؟ وائن بھی نہیں؟ حیرت

خراسانی امیر کے مکان سے بہت فاصلے پر ایک نیا اعلےٰ درجے کا ہوٹل چہار سُو دور دور تک صحرا۔ گھپ اندھیرا وسیع رات میں میں اپنے کمرے میں جانے کے بعد پھر باہر نکل آئی۔ چاروں طرف سناٹا اور اتھاہ تاریکی۔ پھاٹک پر جا کر دیکھا باہر کیا ہو رہا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ سکوت کامل۔ ایک دیہاتی خانم ہند کی دار عنابی چادر میں منہ لپیٹے سامنے سے گذر گئی۔

شاہی خیمہ گاہ۔ ریت پر بلوچی رقاص اور رقاصائیں ناچ میں مصروف۔ منڈیروں پر ٹکے شاہی مہمان رقص سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

دفعتاً شاہبانو خود آ کر رقص میں شامل ہو جاتی ہیں۔ شہزادگان اور شہزادی خانم فرح ناز نے امریکن کاؤبوائے اور کاؤگرل لباس پہن رکھے ہیں۔ شاہبانو سلیکس میں ملبوس ہر امپریل ہجینس کی والدہ مادام فریدہ دیبا بھی رقص میں حصہ لے رہی ہیں۔ شہنشاہ آریہ مہر ایک مسند پر بیٹھے ہیں۔ میں سرحد کے کچھ فاصلے پر دوسری طرف کوئٹہ میں پاکستانی بلوچیوں کا بالکل اسی قسم کا ناچ دیکھ چکی ہوں۔ عجیب۔

رقص کے خاتمے کے بعد بلوچیوں پر انعام واکرام کی بارش۔ اشرفیاں ریال۔ جدید الف لیلے کی ایک رات۔ بادشاہ اور ملکہ اور امرائے دربار کا رقاصاؤں کو انعام دینے کا منظر پرانی داستانوں میں پڑھا تھا۔ یہ درباری امرا ایران کے متمول ترین طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ طرزِ زندگی بالکل مغربی۔ آدھا وقت یورپ اور امریکہ میں گزارتے ہیں۔ ان کی اولاد بچپن سے مغربی ممالک کے مہنگے اسکولوں میں بھیج دی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی ثانوی زبان فرانسیسی ہے۔ ان کی خانمیں اپنے بال BLEACH کروا کر یوروپین نظر آنے کی پوری کوشش کرتی ہیں۔ (شہبانو اور ان کی والدہ مادام فریدہ دیبا کے بال بھی مصنوعی طور پر سنہری ہیں)۔

صبح کی تیز دھوپ میں برجند کا شہر، صاف ستھری گلیاں، صاف ستھرے مکانات۔ ایک دو منزلہ مکان پر مقامی ڈاکٹر کے نام کا بورڈ، سفید دیواروں سے لگے سفید شلواریں پہنے پٹھان نما مرد اور چادریں اوڑھے، چہرے چھپائے عورتیں۔ شاہ و شہبانو کی سواری دیکھنے کے منتظر۔ ان کی اور امرائے دربار کی زندگیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

شام — ایک گھنا سرسبز باغ۔ وضع قدیم کی دو منزلہ عمارتیں، باغ میں نہریں، ایرانی مصوروں نے سولھویں صدی میں جو منظر کشی کی تھی وہ قطعی خیالی نہیں تھی۔

برجند میں دوسری رات آقائے اسداللہ عالم منسٹر آف کورٹ کا کنٹری ہاؤس۔ خراسان کے دہقان یعنی جاگیردار عہدِ قدیم سے بہت دولت مند اور طاقت ور چلے آئے ہیں۔ شاہ کی زرعی اصلاحات کے بعد ان کی زمینیں چھن گئیں لیکن پرانی سطوت و دولت ابھی موجود ہے۔ شاہ پرست طبقہ امرا شہنشاہ آریہ مہر کا دستِ راست ہے۔

کنٹری ہاؤس کے چاروں طرف پائن کے اونچے درخت، چبوترے پر قالین۔ اندر کمروں میں ضیافت کے لیے میزیں چنی جارہی ہیں۔ ایک کمرہ حوض خانہ ہے۔ حوض میں فوارے۔ باہر باغ میں شاہی مہمانوں کا ہجوم کثیر جوسب طہران سے اُڑ کر آئے ہیں۔ ایوننگ گاؤنز اور ڈنر جیکٹ، ہیروں کی جگمگاہٹ، فرانسیسی میں گفتگو۔ باغ میں نصب چھوٹے چھوٹے خیموں میں امرائے دربار فروکش ہیں۔

صبح باغ کے سبزے میں مستعد ہیلی کوپٹر۔ ''ہزا یکسلینسی ڈاکٹر کمال پاشا بہادری اب آپ کو ایسکورٹ کریں گے۔'' مسعود بارزین نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر طہران واپس جانے کے لیے کمانڈر پلین پر سوار ہو گئے۔ ڈاکٹر بہادری امریکہ کے تعلیم یافتہ نوجوان — خوش شکل سیاست دان جوڈپٹی پرائم منسٹر رہ چکے ہیں۔ آج کل شہبانو کی کابینہ کے صدر ہیں۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آذر بائیجانی ہیں۔ ان کے بزرگ بھی شاہان قاچار کے امرا تھے۔ اگلے ہیلی کاپٹر پر شاہ و شہبانو بیٹھے ہیں۔ ہیلی کاپٹر شہنشاہ خود اڑا رہے ہیں۔ ہمارا ہیلی کاپٹر شاہ کے پیچھے پیچھے اڑ رہا ہے۔

ایک گاؤں جو پچھلے سال کے خوفناک زلزلے میں تباہ ہو گیا تھا سال بھر کے اندر اسے دوبارہ تعمیر کرلیا گیا ہے۔ گاؤں والے قرآن شریف اور حضرت علیؑ کی بڑی سی تصویر سنبھالے استقبال کے لیے موجود۔ شاہ و شہبانو مع پارٹی گاؤں کی جدید زلزلہ پروف عمارتوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ کیمونٹی سنٹر کے ہال میں بانات کی طویل میز۔ ایک چھوٹی میز پر گرامو فون رکھا ہے۔ ایک فولڈنگ میز کی مضبوطی ٹسٹ کرنے کے لیے شاہ اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کا تختہ ذرا ٹیڑھا ہو گیا فوراً اٹھے۔

دوسرے گاؤں میں قالین بافی کا کارخانہ۔ سرخ گالوں والی خراسانی لڑکیاں، سر پر پھول دار رومال باندھے کرگھوں کے سامنے بیٹھی ہیں۔ بستی کے سرے پر پائن کے جھرمٹ۔ ایک درخت کے نیچے فولادی ہیلمٹ اوڑھے ایک فوجی بت کی طرح کھڑا ہے۔

گاؤں کی عورتیں دوڑتی ہوئی آئیں۔ شہبانو کو گھیر لیا اور اپنے اپنے دُکھ درد سنانے لگیں۔ ایک افسر ایک ٹوکری لیے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گاؤں والوں کی درخواستیں اور خطوط جو انھوں نے شاہبانو کے نام لکھے ہیں وہ اس ٹوکری میں ڈالتا جا رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ آشوبِ چشم میں مبتلا ہے۔ اسے بذریعہ طیارہ اسی وقت برائے علاج مشہد روانہ کیا جاتا ہے۔

اچانک ایک دہقانی عورت مجمع سے نکلی اور چیختی چلاتی فرح پہلوی کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ "یہ عورت دیوانی ہو گئی ہے اس کے شوہر نے اس پر بے انتہا مظالم کیے ہیں۔" کسی نے مجھ سے کہا۔

وہ اسی طرح چیختی ہوئی شہبانو کا تعاقب کرتی رہی۔ پاگلوں کو بادشاہوں کا خوف نہیں ہوتا۔ اسے بھی برائے علاج مشہد روانہ کیا گیا۔

تیسرا گاؤں۔ چوتھا۔ پانچواں۔ ہیلی کاپٹر زلزلے سے تباہ شدہ علاقے کے اوپر اڑتے پھرے۔ ہر گاؤں میں ایک سی رسومِ استقبال۔ دہقان سامنے آ کر بادشاہ کو مخاطب کرتا "شہنشاہا!" اور رپورٹ پیش کرتا۔ زلزلے کے بعد ان گاؤں میں نئے شفا خانے، حمام، اسکول اور کتب خانے و مساجد تعمیر کی گئی ہیں اور ہر مسجد کے سامنے منبر پر رسول اللہ، حضرت علیؓ کی تصاویر جو پرانی ایرانی روایت ہے (عثمانی ترکوں نے سولھویں صدی میں حیاتِ نبوی کا پورا البم مصور کیا تھا۔ یہ البم استنبول کے توپ کاپو میوزیم میں موجود ہے۔ ایرانی تصاویر اور ان ترکی تصاویر میں صرف یہ فرق ہے کہ موخرالذکر میں رسول اللہ کی شبیہ مبارک کے بجائے چہرہ مبارک پر نقاب دکھائی گئی ہے۔)

بہرحال تو دیہی ایران کی ان مساجد کے باہر منبر پر رسولؐ و علیؓ کی تصاویر کے نیچے شاہ و شہبانو کے فوٹو گراف موجود ہیں۔ یہ بہت معنی خیز بات ہے۔

وہ بڑے سائز کا قرآن شریف ہمارے ساتھ رہا۔ میں اور ڈاکٹر کمال پاشا بہادری اسے باری باری ہاتھ میں لیتے۔ دیہات کے ان سارے مجمعوں میں عبا پوش ملا البتہ کہیں نظر نہ آئے۔

شہر گناباد۔ ہیلی کاپٹر سے شہر کے نیلے گنبد دکھائی دیے۔ مکانوں کی سپاٹ چھتیں۔ اونچی محرابوں والے دالان۔ ہر صحن میں حوض۔

گناباد ہوٹل میں ضیافت کی میز پر مشہد کے شیریں تربوز اور خربوزے۔ ایک درباری امیر نے مجھ سے کہا: "یہ نوش کیجیے۔ یہ پھل آپ نے پہلے کبھی نہ کھائے ہوں گے۔"

اہل ایران کی حب الوطنی قابل تعریف ہے۔ باہر کچھ فاصلے پر وہ مہیب فوج بردار طیارہ کھڑا تھا جس پر ہم سب تہران واپس جانے والے تھے۔ شہنشاہ آریہ مہر پائلٹ کی سیٹ پر جا بیٹھے۔ ان کے ساتھ معاون ہوا باز نہیں تھا۔ اتنا بھاری طیارہ خود اکیلے اُڑائیں گے۔ شہبانو ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ اندر فوجیوں کے دو رویہ بنکر BUNKS جن پر فروکش افراد کو مادام فریدہ دیبا سر دے کی قاشیں تراش تراش کر سب کو دیتی رہیں۔

4. اصفہان نصف جہان

طہران واپس آنے کے چند روز بعد اصفہان۔ شہنشاہ مع عملے کے ایک دن قبل جا چکے تھے۔ فرح پہلوی بعد میں مجھے اپنے ہم راہ لے کر جا رہی تھیں۔ میں اور ڈاکٹر بہادری شاہی ایر پورٹ پر شہبانو کے ہیلی کوپٹر کے منتظر تھے جس کے لیے وہ کاخ سعد آباد سے آنے والی تھیں۔ کچھ دیر میں ہیلی کاپٹر آن کر اترا۔ اس کے پنکھوں کی ہوا سے باغ کے سرو و شمشاد لرز اٹھے۔

فرح پہلوی اتر کر اپنے ذاتی چھوٹی پلین میں سوار ہوئیں جس میں کمانڈر سے زیادہ جگہ تھی۔ دس بارہ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک طرف ہر مجسٹی کی لیڈیز ان ویٹنگ (مکمل میک اپ، بہترین ہیئر اسٹائل) خاموش مؤدب بیٹھی تھیں۔ میں نے اندر جا کر شہبانو کے مقابل کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا! "یور مجسٹی میں دراصل رائلٹی سے ملتے رہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔"

"کیوں؟"

"ذرا میرے بال ملاحظہ کیجیے۔"

"انھوں نے میرے بے ترتیب جھوٴابالوں کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ دراصل وہ مسلسل اور مستقل انتہائی مؤدب، مکمل فیشن ایبل خواتین سے ملتے ملتے اس قدر اکتا چکی ہوں گی

کہ میری نسبتاً بے تکلفی اور نیچرل پن ان کو مختلف اور اچھا لگتا ہوگا اور میں کتاب کے لیے ان سے مستقل ہر طرح کے ذاتی سوال کرتی رہتی تھی۔ وہ ایک موضوع اور میں ایک مصنف اور جرنلسٹ تھی اور وہ ایک ذہین اور سمجھ دار خاتون کی حیثیت سے مکمل تعاون کرتی تھیں۔

فارس جاتے ہوئے طیارہ پھر چٹیل میدانوں پر سے گزر رہا تھا۔ وہی غار نما گول گڑھے۔ فرح پہلوی نہایت اشتیاق سے اس منظر کو دیکھتی رہیں۔ گو اسے انگنت بار دیکھا ہوگا۔

''تم کو یہ کیسا لگتا ہے؟''

''مُون اسکیپ۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں واقعی مُون اسکیپ۔ اور وہ دیکھو کریز۔ یہاں پانی جمع کیا جاتا ہے۔ اور وہ دیکھو کبوتروں کے مینار۔''

اصفہان ایرپورٹ پر شہنشاہ آریہ مہر مع اپنے جرنیلوں کے شہبانو کے استقبال کے لیے منتظر کھڑے تھے۔ شہبانو آگے آگے گئیں۔ میں اپنا سفید اوورکوٹ اور کارڈیگن اٹھا کر پلین سے اتری۔ ایک جنرل صاحب مجھے اسکورٹ کر رہے تھے۔ ایرپورٹ کے اندر پہنچ کر مجھے بہت ہلکا ہلکا سا لگا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا ایک اور جنرل میرا کوٹ اور کارڈیگن اٹھائے بسرعت چلے آ رہے تھے۔

''یہ آپ نے پلین سے اترنے میں نیچے گرا دیا تھا۔''

ایک بار پھر ہوٹل شاہ عباس جہاں گلاب کے پھولوں کے انبار لگے ہیں۔ گاؤں میں بھی جن قالین پوش طویل راستوں سے شاہی پارٹی گذرتی تھی ان پر قدم قدم پر گل ولالہ بکھیرے گئے تھے۔ ایسے خشک ملک میں گلاب کی یہ کثرت تعجب خیز ہے۔ بارش بہت کم ہوتی ہے۔ دریا بھی ناپید ہیں اور پھولوں اور سبزے کی یہ فراوانی۔ ضرور یہ زمین دوز کریز اور چشموں کی کارستانی ہے۔

''شاہ شہبانو مع وزرا امرا ہوٹل شاہ عباس کے فوئیر میں کھڑے تھے۔ میرا سوٹ کیس صبح سویرے تہران سے شاہ و شہبانو کے اسباب کے ساتھ شاہ کے بڑے طیارے پر بھیج دیا تھا۔ وہ سامان اب اتار کر فوئیر میں لایا جا رہا تھا۔ میں سنہرے منقش کاؤنٹر کے پاس اپنے سوٹ کیس کی منتظر کھڑی تھی جس میں حسبِ عادت مجھے تالا لگانا یاد نہ رہا تھا۔ سارا سامان آ گیا۔ مجھے اپنا اسباب

نظر نہ آیا۔۔ ہال میں شہنشاہ اور شاہ بانو کی موجودگی کی وجہ سے نہایت مؤدب خاموشی طاری تھی۔

میں نے اطمینان سے با آواز بلند دریافت کیا۔

''یہ کیا گڑ بڑ ہے؟ میرا سوٹ کیس کہاں ہے؟''

میں ایک جمہوری خاتون ہوں اور مراسم درباروداری کی عادی نہیں۔ لہٰذا میں نے دوبارہ با آواز بلند دریافت کیا۔ ایک افسر نے گھبرا کر جلدی سے کہا: ''خانوم آپ کا سوٹ کیس یہ رہا۔''

''ایک الف لیلوی پوشاک والے بل کیپٹن نے میرا سامان بذریعہ سنہری لفٹ اوپر میرے کمرے پر پہنچا دیا۔ کمرے میں گلاب کے انبار موجود تھے اور فواکہات اور خشک میوے اور دیگر اشیائے نفیس۔ شاہی پارٹی کے افراد کی ہوٹل شاہ عباس جتنی خاطر مدارت کرتا کم تھا۔

میں نے دریچے کے پردے سرکا کر اپنے پسندیدہ صحن چمن پر نظر ڈالی۔ چاند اوپر آ چکا تھا۔ صحن کے چاروں طرف مہمان سرائے کی محرابوں والے دالان نما کمروں سے روشنیاں چھن رہی تھیں۔ گل چمن میں فوارے جاری۔ برابر چھت کی دوسری طرف اسی مشہور مذہبی مدرسے کا نیلا گنبد چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ جہاں میں نے پچھلی مرتبہ جانا چاہا تھا مگر نہ جا سکی تھی کہ وقت کم تھا۔

مجھے اپنے کمرے میں پہنچے پندرہ بیس منٹ ہوئے تھے کہ آقائے مسعود بارزین کا فون آیا۔

''علیا حضرت آپ کو یاد فرماتی ہیں۔ وہ ہوٹل سے ملحق زیر تعمیر بازار کے معائنے کے لیے تشریف لے گئی ہیں آپ بھی وہیں آ جائیے۔''

ہوٹل کے نزدیک ایک قدیم مسقف بازار کو جو صفوی کاروان سرائے کی ملحقہ تجارت گاہ رہی ہوگی۔ دوبارہ علیا حضرت کی زیر نگرانی تعمیر کیا جا چکا تھا۔ اب اس کی آرائش کی جا رہی تھی۔ ٹپکل مڈل ایسٹرن مسقف بازار جہاں مغربی سیاحوں کے لیے ایرانی مصنوعات فروخت کی جائیں گی۔ علیا حضرت بحیثیت ایک آرکی ٹیکٹ اس عمارت کے معماروں سے چند ٹیکنیکل نکتوں پر تبادلۂ خیالات کرتی اس کی گلیوں میں گھوم رہی تھیں۔ اب ڈنر کے بعد شاہ عباس کے میکدے میں افسانہ خواں سے شاہنامہ فردوسی سنیں گی۔

ہوٹل میں امریکن اور یورپین سیاح اِدھر اُدھر کھڑے منہ کھولے یہ سب نظارے دیکھ

رہے تھے۔ طعام شب کے بعد شاہ و شاہ بانو محن کے دوسرے سرے پر روایتی میکدے میں جا کر بیٹھے۔

روایتی پوشاک میں ملبوس افسانہ خواں نے ڈرامائی انداز کے ساتھ ایک جھاڑی کے پیچھے سے نکل کر شاہنامہ سنانا شروع کیا۔

اہل ایران اپنی تاریخ کو RE-CREATE کرنے کا فن سیکھ گئے ہیں۔ شہبانو نے سارے ملک میں میڈیول سرایوں، چائے خانوں اور مدرسوں اور حماموں کو دوبارہ تعمیر کروا کر ان کو MODERNISE کر دیا ہے۔ طہران میں ایک روز میں ڈاکٹر کمال پاشا بہادری کے دفتر میں موجود تھی جب شہبانو کا فون آیا "مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ کاشان میں ایک نئی سڑک بنانے کے لیے ایک قدیم تاریخی عمارت کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ ان لوگوں کو فوراً منع کر دو کہ اس عمارت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔" اسی طرح شیراز پرس پولس کلچرل فیسٹیول میں جہاں ساری دُنیا کے نامی فن کار جمع ہوتے ہیں، ایران کا روایتی — PASSTONPLAY (تعزیہ جس میں واقعہ کربلا بطور تمثیل پیش کیا جاتا تھا) جدید ترین اسٹیج تکنیک سمیت ایک یونانی ٹریجڈی کی لرزہ خیز عظمت کے ساتھ ایرانی اداکار بین الاقوامی مجمع کے سامنے اسٹیج کرتے تھے۔ شیراز فیسٹیول بھی شہبانو نے اپنی نگرانی میں شروع کرایا تھا۔

صبح کو ہم لوگ اصفہان سے باہر جانے کے لیے فوئیر میں جمع تھے۔ ایک گیلری میں انیسویں صدی کے ایران کی بڑی بڑی یورپین لیتھوگراف تصاویر کے نیچے صوفے پر چند امریکن بڑھیا شاہی جوڑے کو دیکھنے کے لیے چوکس بیٹھی تھیں۔ اوپر ایک بالکنی جس کے پیچھے رائل سویٹ تھا۔ تر و تازہ منوں گلابوں سے بھر دی گئی تھی۔

ہز اکسیلنسی ڈاکٹر بہادری حضرت علی کی تصویر لیے پھر ساتھ ساتھ چلے۔ باہر سڑک پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شاہی قافلہ اصفہان سے باہر فولاد کے کارخانے کی سمت روانہ ہوا۔ کارخانہ روسی تعاون سے بنایا جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر شاہ نے ہیلمٹ پہنی اور جیپ میں بیٹھ کر کارخانے کا معائنہ شروع کیا۔ میں پچھلی کار میں آقائے عباس ہویدا وزیر اعظم اور ڈاکٹر بہادری کے ساتھ بیٹھی

تھی۔ عباس ہویدا کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا اور انگریزی اچھی بولتے تھے۔

کارخانے میں روسی سربراہ اور انجینئر پرانی یورپین کرٹسی کے ساتھ ایک بادشاہ سے جھک جھک کر گفتگو کر رہے تھے۔

بین الاقوامی سیاست۔

اصفہان سے باہر ایک پہاڑی۔ ہم سب شاہ کے ہیلی کاپٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ عباس ہویدا جو پورک پائی ہیٹ اور چھڑی ہاتھ میں لیے ایک کنزرویٹو انگلش جنٹلمین معلوم ہوتے تھے۔ ٹہل ٹہل کر شاہ کے انتظار میں مصروف تھے۔ مادام ریحانی میرے ساتھ کھڑی تھیں۔ میں نے پوچھا:

''آپ یہیں اصفہان میں رہتی؟'' کہنے لگیں ''نہیں میں بھی طہران سے آئی ہوں۔''

''وہاں آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں۔''

''وہ وزیرِ آب و برق ہیں۔'' ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

شاہی ہیلی کاپٹر آ گیا۔

ہم سب پھر کاروں میں سوار ہو کر زائندہ رود کے ڈیم پر پہنچے۔ نئے بجلی گھر کے اندر دیواروں پر موڈرن آرٹ کے فریسکو۔ ایک نوجوان فوجی انجینئر ایک طرف اٹینشن کھڑا تھا۔ شاہ نے ڈیم پر جا کر سوئچ دبایا۔ یک لخت ایک زوردار آبشار کی طرح پانی نیچے گرنے لگا۔

عمارت کے اندر ایک دریچے میں آقائے اسداللہ عالم کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

''زائندہ رود — آبِ حیات نو'' انھوں نے کہا۔

''اسی تخیل کو بائبل میں LIVING WATERS کہا گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اسداللہ عالم نے کوئی باموقع شعر پڑھا۔ اسی وقت شاہ کمرے میں داخل ہوئے۔

اسداللہ عالم منسٹر آف کورٹ نے خاموش ہو کر نظریں جھکا لیں۔ میں نے بھی خاموش

ہو کر نظریں جھکالیں۔ آداب شاہی۔ ایک جمہوری معاشرے کے پروردہ انسان کے لیے یہ سارے آداب وضوابط عجیب اور دلچسپ تھے۔

ڈیم غالباً فرنچ تعاون سے تیار کیا گیا تھا۔ اب شہنشاہ ایران دریا کے پختہ کنارے پر فرانسیسی سربراہوں اور انجینئروں سے فرنچ میں گفتگو کرتے شامیانے کی طرف جا رہے تھے۔ ایرانی کی طرح فرانسیسی بھی تہذیب وثقافت اور نفاست کا پتلا ہوتا ہے لہٰذا ہر فرانسیسی MAJESTI کہہ کہہ کر دوہرے ہوتے ہوئے ان کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔

زرنگار شامیانے کے نیچے دو سنہری کرسیاں۔ درباریوں اور وزیروں کی کرسیوں کی قطاریں ان کے پیچھے۔ شامیانے کے باہر دھوپ میں ایرانی کارکنوں اور فرانسیسیوں کی بھیڑ میں ڈاکٹر بہادری کے ساتھ ایک طرف کو کھڑی تھی۔ سنہری کرسی پر بیٹھ کر شاہ نے مجھ پر نظر ڈالی اور ایک اور افسر کو اشارہ کیا۔ وہ لپکا ہوا آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے جا کر شاہی کرسیوں کے پیچھے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ فرانسیسی خواتین نے گردنیں بڑھا بڑھا کر میری ساری پر نظر ڈالی۔

رات کو اصفہان کے ایک تھیٹر میں مزاحیہ ڈرامہ۔ شاہ شہبانو کی کرسیاں سب سے آگے رکھی تھیں۔ خانوم ریحانی جواب بہ حکم علیا حضرت میری دوسرا تھ کر رہی تھیں۔ کہنے لگیں: ''اصفہانی اپنے حس مزاح کے لیے سارے ایران میں مشہور ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تمثیلیں بے حد دلچسپ ہوتی ہیں۔''

اصفہان سے شاہی پارٹی ایک بار پھر ایک مہیب فوج بردار طیارے میں طہران روانہ ہوئی۔ طیارہ حسب معمول شہنشاہ آریہ مہر خود پائلٹ کر رہے تھے اور حسب معمول معاون ہواباز کے بغیر۔ شہبانو پہلے کی طرح کوک پٹ میں شاہ کے ساتھ اور ہم سب، اندر فوجی BUNKS میں۔

چند روز بعد رمیش سنگھوی لندن سے طہران آئے۔ ایک شام میں مسٹر رحمٰن سفیر ہند کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ رمیش کارخ نیاوران سے سیدھے وہیں آگئے اور آتے کے ساتھ ہی بولے۔

''شہبانو بے حد خوش ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ میری سوانح نگار سے میرا مکمل RAPPORT قائم ہو گیا ہے۔ وہ میرے کردار اور مزاج اور خیالات کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ میرے متعلق یہ کتاب بہت اچھی رہے گی۔ میں نے شہبانو کو بتایا کہ میں اسے امریکہ میں COLLIERS یا HARPERS میں SERIALISE کرنے کی بات چیت کر رہا ہوں۔''

5. شاہنامہ اور کنٹری کلب

طہران کا نیا میوزیم آف موڈرن آرٹ دنیا کے سب سے بڑے نوادر خانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ایک شام شہبانو اس کا افتتاح کرنے والی تھیں۔ جدید ایرانی سنگ تراش اور مصور جو زیادہ تر پیرس میں رہ چکے تھے ہر میجسٹی کے انتظار میں باہر ایک قطار میں کھڑے تھے (ان ہی میں ایوننگ گاؤن پہنے آقائے مسعود بارزین کی بے انتہا حسین خانم بہتین بھی شامل تھیں جو حکومت ہند کی دعوت پر ایک سال شانتی نکیتن میں بھی گزار آئی تھیں)

''میں فن کاروں اور ادیبوں کی معیت میں خود کو بہت ایٹ ہوم محسوس کرتی ہوں۔'' ایک بار شہبانو نے مجھ سے کہا تھا'' چند آرٹسٹ مجھے یور میجسٹی کی بجائے فرح خانم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں کیونکہ مجھے اپنی برادری کی ایک فرد سمجھتے ہیں۔

میوزیم کی طویل ایر کنڈیشنڈ گیلریوں میں دو رویہ دیوار دوز دریچوں میں ایران کے مختلف ادوار کے نوادر رکھے تھے۔ ڈپلومیٹک کور کے چند مغربی اراکین جو علیا حضرت کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے سفالی ظروف کے سامنے ٹھٹھک کر ان کو بے حد دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ ایک ہمسایہ ملک کے ڈپلومیٹ کی بیوی نے جو میرے نزدیک کھڑی تھیں بہ آواز بلند پنجابی میں کہا'' یہ لوگ بھی کتنے بے وقوف ہیں ان پرانے دھرانے کچے گھڑوں کو دیکھ کر پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ ایسے مٹی کے برتن تو ہمارے ہاں اب گاؤں میں بھی استعمال نہیں کیے جاتے۔''

ان کے شوہر نے ان کو اشارۃً منع کرنا چاہا مگر وہ بھی پچھلے میرے ٹرپ کے ساتھی مشرقی

ہندوالے پتر کاری کی بہن نکلیں، زور سے بولیں "اور برتن بھی ٹوٹے پھوٹے۔ ایک بھی سالم نہیں۔ ان کو اتنے بڑے میوزیم میں سجانے کی کیا ضرورت تھی؟"

مجمع آگے بڑھا۔ ایک کمرے میں شاہنامے کے قدیم نسخے رکھے تھے۔ شہبانو ان کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایرانی موڈرن آرٹ کا سیکشن بے انتہا، حد سے زیادہ موڈرن تھا۔ ایک جگہ ایک باقاعدہ انجن سا چھک چھک کر رہا تھا۔ لوہے کے ٹکڑوں کے ملغوبے سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں پوچھوں نہوں پھر اسے آرٹ کیوں کہو، مشین ٹول انڈسٹری کہو۔ ایک بورے میں بھوسہ بھر ارکھا تھا۔ اس قسم کے عصری آرٹ میں خلاق تخیل کو زیادہ دخل حاصل ہے۔ اب اس بھوسہ بھرے بورے کو آپ کچھ بھی نام دے سکتے ہیں۔ "انسان"، "احمق الذی"، "دنیا"، "زندگی" وغیرہ وغیرہ اور آرٹ کے نقاد اس پر ایک طویل مقالہ لکھ ڈالیں گے۔

میں ایک بے حد لمبے چوڑے سفید کینوس کے سامنے کھڑی تھی جس کے ایک کونے میں چھوٹا سا سیاہ نقطہ بنا دیا گیا تھا۔ اور وہ نقطہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس کو دیکھنے کے لیے خوردبین کی ضرورت پڑتی۔ اتنے میں مسعود بارزین ہجوم کو چیرتے ہوئے آئے اور کہا: "علیا حضرت نے فرمایا ہے رات کا کھانا آپ ان کے ساتھ کنٹری کلب میں کھایئے اس وقت ان کے ہم راہ ہی چلیے۔"

شہبانو میوزیم سے نکل کر اپنے ہیلی کوپٹر کی طرف جا چکی تھیں۔ جو باغ کے سبزے پر کھڑا تھا۔ میں مسعود بارزین کے ساتھ باغ میں پہنچی شہبانو مع اپنے اے ڈی سی اور لیڈیز ان ویٹنگ ہیلی کوپٹر میں سوار ہو رہی تھیں۔

فضائی مشین گھاس پر سے بلند ہوئی۔

"تم نے شاہنامے کے قدیم نسخے دیکھے؟" شہبانو نے مجھ سے دریافت کیا۔ نیچے طہران روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بڑے اشتیاق اور فخر سے نیچے جھانک کر کہنے لگیں: "دیکھو طہران کتنا خوب صورت ہے۔"

"چند منٹ بعد ہیلی کوپٹر ایک وسیع باغ میں اترا۔ شہبانو اور میں اتر کر ایک عالی شان عمارت کی طرف روانہ ہوئے۔

برآمدے کی سیڑھی پر ایک لمبا تڑنگا وردی پوش آدمی اٹینشن کھڑا تھا۔ ہم اندر ہال میں گئے۔ شہبانو نے کہا: "اب تم ہوٹل جا کر تیار ہو جاؤ"۔ وردی پوش سے کہا: "خانم کو ہوٹل لے جا کر وہاں سے کنٹری کلب لے آنا۔"

میں وردی پوش انسان کو کمرے کے دھندلکے میں شاہی شوفر سمجھی۔ میں نے کہا: "ہاں آپ مجھ کو پہلے ہلٹن لے چلیے۔" پھر میں نے شہبانو سے پوچھا: "اب آپ اپنے گھر جا کر تیار ہوں گی؟"

ذرا جھینپ کر انکسار سے جواب دیا: "یہ ہمارا ونٹر ہوم ہے۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اچانک مجھے یاد آیا ارے یہ تو کاخِ نیاوراں ہے۔ جہاں میں دن میں کئی مرتبہ آئی تھی اور شاہ و شہبانو چند روز قبل کاخِ سعد آباد سے منتقل ہو کر موسمِ سرما کے لیے یہاں آ چکے تھے۔

شاہ بانو اوپر چلی گئیں۔ ایک لیڈی اِن ویٹنگ نمودار ہوئی: "آپ میک اَپ وغیرہ یہیں کر لیجیے۔ ہوٹل جا کر ساری تبدیل کر لیجیے گا ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

وہ مہمان خانے کے ڈریسنگ روم میں لے گئی۔ سنگھار میز پر جو برش اور کنگھیاں اور پاؤڈر باکس وغیرہ رکھے تھے ان سب پر ہیرے، زمرد اور یاقوت جڑے ہوئے تھے، میں باتھ روم میں گئی۔ سوچا یہاں شاید ساری چیزیں خالص سونے کی ہوں گی مگر وہ عام چینی کی نکلیں۔

باہر برآمدے میں وردی پوش اسی طرح اٹینشن کھڑا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ اب جو دیکھا تو کار ایک اور شخص چلا رہا تھا اور یہ باوردی شخص جو غور سے اس کا یونیفارم دیکھا تو پتہ چلا کہ ایک اعلیٰ فوجی افسر تھا۔

کنٹری کلب کہرے میں ملفوف تھا۔ اندر ایک منزل پر چند معمر ایرانی امیرزادیاں ایک میز کے گرد برج میں مستغرق تھیں۔ اوپر ایک کمرے میں شاہی مہمان مع مادام فریدہ دیبا شہبانو کے منتظر تھے۔ جس وقت علیا حضرت کمرے میں داخل ہوئیں ان کی والدہ بھی تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔

شاہ بانو نے ایک جنرل صاحب سے ملوایا جوان کے ایک تندوئی تھے۔ کہنے لگیں: "یہ تمھاری کتاب کے فرنچ اور جرمن اڈیشن کی دیکھ بھال کریں گے۔"

باتوں باتوں میں مَیں نے شہبانو سے کہا آپ نے سابق ملکہ ثریا کی کتاب پڑھی ہے جو چند سال ہوئے ولایت میں چھپی ہے؟ انھوں نے اس کتاب میں شاہی خاندان پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔"

"پرنسس ثریا ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہیں لیکن ان کو ایسی باتیں نہیں لکھنی چاہیے تھیں۔ مغربی پریس خود میرے متعلق طرح طرح کی خبریں چھاپتا رہتا ہے ایک مغربی رسالے نے لکھا ہے کہ میں ایک صحرائی محل میں جا کر جادوگرنیاں جمع کرتی ہوں اور ان سے جادو ٹونے کرواتی ہوں۔ مغرب کے لیے ہم مشرقی اب تک ایک پُراسرار شئے ہیں۔"

گویہ کنٹری کلب مشرقی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد دوسرے کمرے میں ڈنر شروع ہوا۔ شیمپین کا دور چلا۔ کمرے میں شہبانو کے قریبی دوست انٹرنیشنل جٹ سیٹ کے چند افراد موجود تھے۔ ایران کی اعلیٰ ترین سوسائٹی اپنی شامیں اسی طرح گذارتی تھی۔ بیش قیمت ہیرے، منک کوٹ، یورپ کی اعلیٰ ترین تفریح گاہوں کے تذکرے کنٹری کلب کے باہر رات گہری ہوتی گئی اور دھند۔

6. شاہی بالکنی

"ایران ہمیشہ سے پہلوانوں کا ملک رہا ہے۔ آج بھی جگہ جگہ زور خانے موجود ہیں جہاں دنگل ہوتے ہیں۔ رضا شاہ کبیر نے ایران کی تجدیدِ نو کرتے ہوئے نوجوانوں کی تربیت بدنی پر بہت زور دیا تھا۔ خود سپاہی آدمی تھے۔ یہاں کے اسپورٹس اور ورزشی مظاہرے جو ہزاروں کی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ دکھاتے ہیں، واقعی حیرت انگیز ہیں۔" راشد صاحب نے کہا۔

ہم لوگ لنچ کے بعد قہوہ پی رہے تھے۔ پاکستان فارن سروس کے محبوب خزاں (جو ایک

نفیس اور حساس شاعر اور نہایت معقول انسان ہیں) یورپ جاتے ہوئے چند روز کے لیے طہران آئے تھے اور راشد صاحب کے ہاں مقیم تھے۔

میں نے سپاہ دانش کے مظاہرے کا وقت دیکھنے کے لیے پرس سے کارڈ نکالا۔ لفافے پر حسب معمول لکھا تھا "سرکار خانم قرۃ العین حیدری"۔

"اب معلوم ہوا ہمارے یہاں لفظ سرکار کا پرتکلف استعمال کہاں سے آیا"۔ میں نے کہا "مگر یہ لوگ مجھے ہمیشہ حیدری کیوں لکھتے ہیں؟"

"مجھے ہمیشہ راشدی لکھتے ہیں، آقائے راشدی۔" راشد صاحب نے جواب دیا۔

توانا بود ہر کہ دانا بود   وزارت آموزش و پرورش

در پیش گاہ مبارک اعلیٰ حضرت ہمایوں شہنشاہ آریہ مہر علیا حضرت فرح پہلوی شہبانوئے ایران۔ مراسم جشن آغاز سال تحصیلی و خاتمہ جائی سپاہ دانش و راستادیوم محمد رضا شاہ پہلوی برگزاری گردد۔ وزیر آموزش و پرورش از جناب عالی خواہش مند است در ساعت ۵ بعد از ظہر روز یک شنبہ بیست و ششم مہر ماہ در مراسم مذکور شرکت فرمائید۔

لباس: تیرہ

مسقف اور FLOODLIT استادیوم کی شاہی بالکنی میں ڈاکٹر بہادری درباری لباس ٹیل کوٹ دستانے پہنے شاہی پارٹی کے منتظر تھے۔ میں استادیوم کا سارا منظر اچھی طرح دیکھنے کے لیے بحیثیت ایک جوکس جرنلسٹ بالکنی کے ایک کنارے پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ شاہی آمد کے بعد نیچے اسمارٹ فوجی وردی پوش لڑکیوں اور لڑکوں نے پروگرام شروع کیا۔

"سلام شہنشاہی۔ سرود سپاہ دانش عرض سپاس یک سپاہی دانش۔ خطابہ یک معظم برگے از شاہنامہ۔ کمدی انتقادی (یعنی کومیڈی)" ہمیشہ معلم"۔ عطا جوائز۔

تیسرے روز امجدیہ استادیم میں تقریباً پچاس ہزار نوجوان لڑکوں لڑکیوں نے ورزشی مظاہرے کیے۔ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ کراٹے لڑیں۔ موٹر بائیک سوار زنانہ پولیس کی لڑکیوں نے محیر العقول کرتب دکھلائے۔ آگ کے چکروں میں سے اپنی موٹر سائیکلیں کودا کرلے گئیں۔

زنانِ ایران کی یہ ترقی واقعی قابلِ تعریف تھی اور اس کی شروعات رضا شاہ کبیر نے کی تھی۔

اس کے بعد "سازمان تربیت بدنی وتفریحات سالم ایران جشن فرخندہ زادروز مبارک علیا حضرت شاہ بانوے گرانمایہ ایران استادیوم ورزشی فرح پہلوی۔ ۲۵ مہر ماہ ۱۳۴۹ شمسی ملبوطہ دبیرستان شاہ کبیر۔"

دوپہر کو میں اپنے کمرے میں تھی۔ ڈاکٹر بہادری کا گھبرایا ہوا فون آیا۔ "آپ ابھی تک نہیں آئیں۔ شہبانو استادیم میں نزولِ اجلال کر چکی ہیں۔"

جلدی سے تیار ہو کر نیچے گئی۔ وزارت اطلاعات ونشریات کی کار مع شوفر چوبیس گھنٹے ہلٹن پر میرے لیے موجود رہتی تھی۔ فوراً استادیم کا رخ کیا۔ وہاں سب پھاٹک بند ہو چکے تھے۔ پولس کا کڑا پہرا۔ دعوت نامہ بھی ساتھ لانا یاد نہیں رہا تھا۔ دوسرے پھاٹک پر جا کر میں نے کھل جا سم سم والے طلسمی الفاظ یاد کیے۔ "میہمون علیا حضرت"۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ میہمون یعنی مہمان۔ اہلِ طہران الف کی جگہ واؤ پیش بولتے ہیں۔ تان کے بجائے تون قربان کے بجائے قربون وغیرہ۔ اندر جم غفیر میں سے ایک درباری افسر لپکے ہوئے برآمد ہوئے۔ "آپ کا منتظر تھا۔ تشریف لے چلیے۔"

اوپر شاہی بالکنی میں فرح پہلوی۔ ان کے پیچھے چند لیڈیز ان ویٹنگ اور ڈاکٹر بہادری۔ علیا حضرت کے برابر والی کرسی میرے لیے خالی تھی تاکہ حسبِ معمول بسلسلہ تصنیف کتاب اپنی سوانح حیات اور خیالات کا تذکرہ کرتی رہیں۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اس میں سارے ایران کے زنانہ کالجوں اور اسکولوں کی لڑکیاں حصہ لے رہی تھیں۔ اس وقت شہبانو کے سان وگمان میں نہ تھا کہ یہی طلبا وطالبات اور ان کے بعد آنے والے دانش ور جو شہنشاہیت کے خلاف اس قدر تاریخ ساز جدوجہد کا آغاز کریں گے، ان کی تصاویر نذرِ آتش کریں گے۔ مرگ بر شاہ کے نعرے لگائیں گے اور خوشی خوشی مشین گنوں کا نشانہ بنیں گے اور یہ موٹر بائیک سوار اور جوڈو کراٹے کرنے والی لڑکیاں قومی جدوجہد کے سمبل کے طور پر سیاہ چادریں اوڑھ کر اس انقلاب میں شامل ہوں گی۔ یہ ایشیا کا واقعی ایک حیرت انگیز انقلاب ہے۔ اس وقت بالکنی میں بیٹھی شہبانو مجھ سے تو یہی

کہہ رہی تھیں کہ وہ خود مڈل کلاس طالب علم لڑکی سے ملکہ ایران کس طرح بن گئیں۔ ان کو اس وقت معلوم نہ تھا، مجھ سمیت بہت سوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ نئی مڈل کلاس لڑکیاں آٹھ سال بعد شہنشاہیت کے خلاف مورچہ لگا کر طہران کے اس میدان میں گولیوں کا نشانہ بن جائیں گی۔ جسے اب ایرانی ''شکارگاہ شہنشاہی'' کہتے ہیں۔ تو واپس چلیے فرح اسٹیڈیم۔

''نواختن سلام شاہنشاہی۔ خواندن سرود راہ و روز توسط: دانش آموزان دبیرستان کوشش بریم۔ اژہ ورزشگاران۔

''اس وقت'' پیرامید دختران دانش جوئے موتور سوار شہربانی'' ہو رہا تھا پھر حرکات دست جمعی دانش آموزان دبیرستان مہرباختر وژیمناسٹک دستجمعی نو آموزان شبانہ روزی شمارہ3 فرح پہلوی'' کے بعد ''برنامہ موزوں دانش آموزان دبیرستان ژاندرک'' (یعنی کانونٹ آف جون آف آرک) شروع ہو گیا۔ بچیوں کا دستہ جھنڈا لیے ملکہ کو سلامی دیتا آگے بڑھا۔

اس وقت شہبانو نے مجھ سے کہا: ''میں تقدیر کی قائل ہو چکی ہوں۔ DESTINY ایک وقت تھا جب یہ اسٹیڈیم ثریا اسٹیڈیم کہلاتا تھا اور میں بہ عمر12 سال اپنے اسی اسکول ژندارک کے دستہ کا جھنڈا اٹھائے ملکہ ثریا کو سلامی دیتی اسی بالکنی کے سامنے سے گذری تھی اور وہ اسی جگہ اسی کرسی پر بیٹھی مظاہرہ ملاحظہ کر رہی تھیں۔''

7. کیپٹن سہراب دیبا

''کیپٹن سہراب دیبا تبریز (صوبہ آذربائیجان) کے ایک قدیم زمین دار علوی سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ طبرستان 864 عیسوی میں خلافت بغداد سے علاحدہ ہو گیا تھا۔ ہاں حسن بن زید نے خود کو داعی الکبیر کہلوا کر اپنی حکومت قائم کی۔ دیبا خاندان غالباً بہ عہد داعی الکبیر آذربائیجان میں آباد ہوا۔ ان کے مورث اعلیٰ امام حسنؑ کے ایک داماد تھے اور ہمیشہ دیبا کی پوشاک پہنتے تھے اور عہد قاچاریہ کے آغاز کے ساتھ ایران کا زوال شروع ہوا۔ گو ناصر الدین شاہ

قاچار کے دانش مند وزیر امیر کبیر ملک کی ترقی کے لیے بہت کوشاں رہے۔ انھوں نے 1850 عیسوی میں طہران میں ایک یورپین طرز کا دارالعلوم قائم کیا اور اپنی ترقی پسندی کے صلے میں قتل کیے گئے۔ ایران روسی اور یورپی حلقہ ہائے اثر میں بٹ چکا تھا۔ شمال میں روس، جنوب میں برطانیہ جہاں تیل نکل رہا تھا۔ ناصرالدین شاہ قاچار روسیوں کی طرف زیادہ مائل تھے۔ 1875 عیسوی میں انھوں نے روسی کوزیک بریگیڈ COSSACK BRIGADE کے ماڈل پر PERSIAN COSSACK BRIGADE کی تشکیل کی۔ اس کے اعلیٰ افسر تمام روسی تھے۔ نوجوان ایرانی فوجی افسر اعلیٰ تربیت کے لیے روس بھیجے جانے لگے۔

اسی زمانے میں تبریز کے دیبا خاندان کے ایک بزرگ عالم اور مورخ نظام العلما نے اپنے بیٹے مہدی دیبا کو ماسکو کی ملٹری اکیڈمی میں بھیجا۔ ماسکو سے واپس آ کر مہدی دیبا نے اپنی ایک کزن سے شادی کی۔ ان کو شعاع الدولہ کا خطاب بھی ملا اور یورپ کے کئی ممالک میں بطور سفیر ایران متعین رہے۔

اس زمانے میں ایران کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی۔ شاہ ناصرالدین (1896-1847) کے حرم میں ایک ہزار سات سو عورتیں تھیں۔ ان کے جانشین اور فرزند مظفرالدین شاہ قاچار نے صرف چونسٹھ پر اکتفا کیا۔ شاہ ناصرالدین 1896 عیسوی میں قتل کیا گیا۔ مظفرالدین اس وقت آذربائیجان کے گورنر تھے۔ تبریز میں مراسم تاج گذاری ادا ہوئے۔ 1900 عیسوی میں موصوف بہ غرض سیاحت یورپ گئے اور وہاں عیش و عشرت میں اس قدر روپیہ اڑایا کہ حکومت ایران کا دیوالیہ نکل گیا اور ملک کا انتظام چلانے کے لیے حکومت کو روس سے بھاری قرض لینا پڑا۔

شعاع الدولہ مہدی دیبا کے ہاں سہراب اور بہرام کی پیدائش کے بعد ان کی خانم نے ان سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی (مسلمان عورتوں کا طلاق حاصل کر کے دوسری شادی کرنا صرف اس برصغیر میں معیوب سمجھا جاتا ہے) 1911 عیسوی میں مہدی دیبا نے سہراب اور بہرام کو ماسکو کی اسی ملٹری اکیڈمی میں بھیجا جہاں انھوں نے خود پڑھا تھا۔

26 نومبر 1917 عیسوی کے روز سہراب اپنے کلاس روم میں مصروف مطالعہ تھے جب

پیٹروگراڈ سے خبر آئی کہ لینن نے ونٹر پیلس پر قبضہ کر لیا۔

مہدی دیبا کا ایران سے تار پہنچا کہ فوراً روس سے روانہ ہو جاؤ۔ دونوں بھائی مختلف خطرناک ایڈونچرز کا سامنا کرتے ماسکو سے بذریعہ ٹرین پیرس پہنچے۔ وہاں سہراب دیبا نے سوربون میں قانون پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ SAINT CYR کی ملٹری اکیڈمی میں شامل ہو گئے۔ 1926 عیسوی میں وطن واپس آئے۔

اس اثناء میں پرشین کوزیک بریگیڈ کے کرنل رضا خاں اور احمد شاہ قاچار کو معزول کر کے پہلے وزیر جنگ اور اب خود شہنشاہ بن چکے تھے۔ اور اتاترک کی طرح اپنے ملک کو جدید بنانے میں کوشاں تھے۔ سہراب دیبا فوج کے شعبہ قانون میں شامل ہو کر طہران میں تعینات کیے گئے۔ 1926 عیسوی میں فوج سے مستعفی ہو کر بنک آف انڈسٹریز میں ملازم ہو گئے۔ اسی سال ان کے والد شعاع الدولہ مہدی دیبا نے جو ہالینڈ میں ایران کے سفیر تھے، انتقال کیا۔ کچھ عرصے بعد کیپٹن سہراب دیبا نے مادموزیل فریدہ قطبی سے شادی کر لی جو طہران کے فرانسیسی کانونٹ ژاندرک کی تعلیم یافتہ تھیں۔

مادام فریدہ دیبا اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ کاخ سعد آباد کے احاطہ میں رضا شاہ کبیر کے بنوائے ہوئے ایک نہایت خوب صورت محل میں رہتی ہیں۔ شام کا وقت ہے اور باغ میں جگہ جگہ درختوں اور پھولوں کو منور کرنے کے لیے گھاس میں آرک لائٹس لگی ہوئی ہیں۔ اندر وسیع ایوان نشست کی پوری چھت پلیٹ گلاس کی ہے۔ اوپر رات کا گہرا نیلا آسمان نظر آ رہا ہے (شاہی خاندان کے رہن سہن پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں اور شاہ کے سسرالی رشتہ داروں پر بھی) مادام دیبا کہتی ہیں "رمضان شریف آنے والے ہیں اور میں اس کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ تم روزے رکھتی ہو؟" پھر وہ ایک منقش صندوقچہ منگوا کر اپنی چند پرانی تصاویر دکھلاتی ہیں۔"

"ہم لوگ بھی شمالی ایران صوبہ گیلان کے شہر لاہیج کے رہنے والے ہیں ہمارا خاندان

مولویوں کا گھرانہ تھا۔ میرے دادا نے لاہیجان میں ایک بڑا حسینیہ (امام باڑہ) تعمیر کروایا تھا۔ میرے والد کا سرکاری خطاب امجد السلطان تھا۔ والدہ احترام السلطانہ کہلاتی تھیں۔"

سنہرے بالوں والی اور مغربی پوشاک میں ملبوس مادام فریدہ دیبا ایک دوسری دنیا کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ "لاہیجان میں ہمارا بہت بڑا پرانا مکان تھا۔ عورتیں شدید پردے میں رہتی تھیں۔ میں تین سال کی تھی جب میرے والدین لاہیجان سے آ کر طہران میں خیابان اسٹریٹ پر رہنے لگے۔ جو اس زمانہ میں امریہ کہلاتی تھی۔ میرے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ماموں محمد علی قطبی کے ہاں رہی جو شہر کے نامور آرکیٹیکٹ تھے۔ دوسرے ماموں فوج میں جنرل تھے۔ ہم لوگ کاخ اسٹریٹ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ سہراب دیبا اپنے والد کے ساتھ پہلوی ایونیو میں مقیم تھے۔ شادی کے بعد وہ بھی ہمارے کاخ اسٹریٹ میں منتقل ہو گئے۔"

اپنے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے مادام دیبا نے رومال سے آنکھیں خشک کیں۔

اتوار کے بجائے جمعہ ایران میں چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ جمعرات 14 اکتوبر 1928 کے روز کیپٹن سہراب دیبا بنک آف انڈسٹریز میں اپنے دفتر میں بیٹھے اخباروں پر سرسری نظر دوڑا رہے تھے اور امریکن ہسپتال میں بار بار فون کرتے تھے۔ نمبر مصروف ملتا تھا۔ اخبار پر پھر نظر ڈالتے۔ انطونی ایڈن نے میونخ کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا۔ ہٹلر اور چیمبرلین کے درمیان خط و کتابت جاری تھی۔ طہران سے روسی سفیر ماسکو گیا ہوا تھا۔ فلسطین میں، یہودیوں اور انگریزوں کے درمیان خونریز لڑائی جاری تھی۔ طہران کے قریب رضا شاہ کبیر نے ایک نئی کیمیکل لیبارٹری قائم کروائی تھی۔ کیڈری کے افسروں نے ایک گارڈن پارٹی منعقد کی تھی اور وزارت تعلیم نے اسکول کی لڑکیوں کے لیے ایک نئی وضع کی مغربی ہیٹ کا اجرا کیا تھا۔ بچی جمعہ ۱۵ اکتوبر کی شام امریکن ہسپتال میں پیدا ہوئی امریکن مشنری ڈاکٹر ملک ڈاول نے باہر آ کر کیپٹن کو مبارکباد دی۔

بہت رات گئے جب کیپٹن کاخ اسٹریٹ واپس آئے سیلون میں بہت سے رشتے دار اس وقت تک جمع تھے۔ ایک خاتون اسی شام ریس کورس سے واپس آئی تھیں جہاں ولی عہد ہمایوں محمد رضا پہلوی نے عرب ترکمان اور بختیاری گھوڑوں کی دوڑ ملاحظہ کی تھی۔ ریس کورس پر ایرانی

خواتین نے چوڑے چھجے والی ٹوپیاں اوڑھی تھیں جو اسی سال انگلستان کی ڈچز آف کینٹ نے ولایت کے اعلیٰ فیشن طبقے میں رائج کی تھیں۔

یہ ایران کے اوپری طبقے کی خواتین تھیں۔ بے پردہ، تعلیم یافتہ اور مغرب کی طرف دیکھنے والی اور اتاترک کی طرح رضا شاہ کبیر نے یہ نیا سماج پچھلے چند سال میں تخلیق کر ڈالا تھا۔ ملاؤں کے اثر اور خوف سے آزاد۔ لیکن نجی طور پر مذہب فراموش نہیں کیا گیا تھا۔

چند روز بعد بچی ہسپتال سے کاخ اسٹریٹ لائی گئی۔ حسبِ دستور قرآن شریف کے سائے میں اسے گھر کے اندر داخل کیا گیا۔ مختلف ایرانی رسوم ادا ہوئیں۔ نام فرح رکھا گیا۔

دس روز بعد 25 اکتوبر ایک اور قومی تعطیل تھی۔ ولی عہد ہمایوں محمد رضا کا جشن سال گرہ۔ اس برس 25 اکتوبر 1928 عیسوی کے روز ولی عہد ہمایوں انیس سال کے ہو گئے۔ شام کو سارے ملک میں چراغاں۔ کاخ سعد آباد میں دعوت۔ ایک تھیٹر کمپنی نے فارسی اوتھیلو پیش کیا۔

(ایک سینما ہال میں سلوچنا کی ایک ہندستانی فلم بھی جسے فارسی میں ڈب کیا گیا تھا۔ کئی ہفتوں سے چل رہی تھی)۔ اس روز کے اخباروں میں ولی عہد کی تصاویر کے ساتھ یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی کہ مصر کے شاہ فاروق کی بہن شہزادی فوزیہ سے موصوف کی نسبت طے کر دی گئی ہے۔

فرح خانم کی پہلی سال گرہ سے چند ہفتے قبل عالم گیر جنگ چھڑ گئی۔ اتحادی فوجوں نے ایران پر قبضہ کر لیا۔ چرچل اسٹالین اور روز ویلٹ طہران کانفرنس کے لیے آئے۔ رضا شاہ کبیر کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا۔ انہیں برطانوی جزیرہ ماریشس جلاوطن کر دیا گیا یہ ایران کے لیے بہت تاریک اور اندوہ ناک زمانہ تھا۔

طہران میں آب رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ گھروں میں غسل خانے نہیں تھے۔ لوگ نہانے کے لیے حماموں میں جایا کرتے تھے۔ یہ حمام ایک قسم کے کلب بھی تھے جہاں لوگ باگ جمع ہو کر گپ شپ کرتے۔ اس حمام میں جہاں فرح خانم کے گھرانے کی خواتین جاتی تھیں۔ ایک

بہت بوڑھی عورت ملازم تھی۔ وہ ہمیشہ پرانے ایرانی لوک گیت گنگنایا کرتی تھی۔ فرح خانم کو نہلاتے ہوئے وہ اکثر ایک فارسی گیت گاتی جس کا مطلب تھا کہ ہم تمھیں کسی کو نہیں دیں گے۔ بادشاہ اگر اپنے وزیر اور سارے درباری اور سارے گھوڑے لے کر تمھیں اپنے محل لے جانے آیا تو اسے بھی نہیں۔

''جس وقت بادشاہ اپنے سارے وزیر، سارے درباری اور سارے گھوڑے لے کر آپ کو اپنے محل لے جانے کے لیے آیا، آپ کو وہ بوڑھی عورت یاد آئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت یاد آئی۔ اس کے متعلق معلوم کروایا لیکن اتنا عرصہ گذر چکا تھا کسی کو علم نہ تھا وہ کہاں گئی۔ شاید مر چکی ہو۔ شادی کی رات جب طہران کا آسمان آتش بازی اور چراغاں سے منور تھا مجھے خیال آیا اس حمام کی وہ بوڑھی ملازمہ ممکن ہے کہیں موجود ہو اور اس آتش بازی کو دیکھ رہی ہو لیکن اسے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ جس لڑکی کی شہنشاہ سے شادی ہو رہی ہے یہ وہی بچی ہے۔ حمام میں بے شمار بچے نہلائے جاتے تھے۔'' شہبانو نے اداسی سے جواب دیا۔

''شام کے وقت ہم لوگ حسبِ معمول کاخ نیاوراں کی دوسری منزل پر ایک فرنچ اسٹائل کمرے میں موجود تھے۔ باہر کہرا پھیلا ہوا تھا۔ شہبانو سگریٹ پیتے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔

جب میں وقت مقررہ پر کاخ نیاوران جاتی تھی۔ دوسری منزل پر اس دارالمطالعے میں شہبانو ہمیشہ میز کے پاس کھڑی ملتی تھیں۔ میرے پہنچنے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھتی تھیں۔ میں نے ایک روز اس کی وجہ پوچھی کہنے لگیں۔ ملکہ ایران بننے کے بعد میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملتی ہوں جو عمر یا تجربے یا اپنے کارناموں کی وجہ سے مجھ سے بڑے یا قابلِ احترام ہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں آتا کہ جس وقت ایسے لوگ مجھ سے ملنے آئیں میں صوفے پر بیٹھی رہوں اور ملکہ کے لیے احتراماً کسی کے لیے بیٹھے سے کھڑا ہونا بھی آدابِ شاہی کے خلاف ہے۔ لہٰذا میں نے ترکیب

نکالی کہ میں بعض مہمانوں کی کمرے میں آمد سے پہلے سے اِدھر اُدھر کھڑی رہتی ہوں تا کہ مجھے AWKWARD نہ محسوس ہونا پڑے۔"

انٹرویو کے دوران ایک درباری افسر چائے پیش کر کے چلا جاتا تھا۔

"اپنے والد اور اپنی آذربائیجان ترک دایہ منور خانم مرحومہ کا ذکر کرتے ہوئے فرح پہلوی افسردہ اور جذباتی ہو جاتی تھیں۔"

"میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ بابا مجھے بے انتہا چاہتے تھے۔ صبح جب وہ دفتر جانے لگتے میں مُصر ہو جاتی کہ وہ باغ میں آ کر میرے ساتھ کھیلیں۔ لہٰذا ان کے دفتر جاتے وقت مجھے کہیں چھپا دیا جاتا تھا تا کہ وہ چپکے سے نکل جائیں۔ اس قدر ناز و نعم میں میری پرورش ہوئی کہ بیماری، موت، دکھ اور غم کی خبریں بھی مجھ سے پوشیدہ رکھی جاتیں۔ میں نے کبھی کوئی جنازہ تک نہیں دیکھا تھا۔

1947 عیسوی میں ایک روز بابا بیمار پڑے اور بار بار ہسپتال جانے لگے۔ اس کے بعد ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ وہاں ان کا آپریشن کیا گیا۔ سرطان نکلا۔ بابا آپریشن کی میز پر ہی ختم ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سینتالیس سال کی تھی۔ جنازہ ہسپتال سے طہران کے متصل شہرِ رے میں امام زادہ عبداللہ کے قبرستان لے جایا گیا۔

"میں کانونٹ آف جون آف آرک (ژندارک) میں پڑھ رہی تھی۔ جہاں والدہ پڑھی تھیں۔ اس روز اسکول میں اسپورٹس تھے۔ میں شام کو دیر سے گھر لوٹی۔ حسبِ معمول اسکول بس سے اتر کر اچھلتی کودتی گھر میں داخل ہوئی تو سناٹا طاری تھا۔ سیلون میں چند مغموم سیاہ پوش رشتے دار موجود تھے۔

شاید وہ سب متفکر تھے کہ مجھے اس سانحہ کی اطلاع کس طرح دیں۔ میں نے تعجب سے پوچھا آپ لوگوں نے کالے کپڑے کیوں پہنے ہیں۔ وہ کہنے لگے دراصل تبریز میں ایک رشتہ دار کا

انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے اپنی چہیتی دایہ منور خانم کے لیے نظریں دوڑائیں۔ اتنے میں والدہ اور ان کے بھائی کمرے میں داخل ہوئے وہ بھی سیاہ پوش۔ وہ لوگ سیدھے قبرستان سے آرہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلے گئے۔"

انھوں نے بھی سیاہ کپڑے پہنے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

"کالج میں بھی ایک عزیز کی وفات ہوگئی ہے۔ ابھی اس کی اطلاع ملی۔" ایک چچا نے کہا۔ اتنے میں ممان کمرے میں واپس آئیں تب میں نے نوٹس لیا کہ انھوں نے سیاہ ماتمی جالی چہرے پر پہن رکھی تھی۔ میں نے پوچھا بابا کیسے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا اب بہت بہتر ہیں۔

ایک ماموں نے کہا: "دراصل آج صبح ہی ان کو بہ غرض علاج پیرس لے گئے ہیں۔"

"صبح مجھے کیوں نہیں بتایا کہ بابا علاج کے لیے یورپ جارہے ہیں۔ میں بھی ایرپورٹ جاتی۔"

"دراصل میں تمھیں بلانے تمھارے اسکول گیا تھا مگر تم کلاس میں تھیں اور وقت بہت کم تھا۔ طیارہ جلدی جارہا تھا۔"

میں چپ ہوگئی مگر مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا۔ اگر مجھے اسکول بلانے جاتے تو سسٹر مجھے ضرور چھٹی دے دیتیں کہ اپنے والد کو ایرپورٹ پر خدا حافظ کہہ آؤں۔"

"چند روز بعد مجھے معلوم ہوگیا۔ ایک دس سالہ بچے کو موت کے یہ معنی تو معلوم ہو جاتے ہیں کہ گیا ہوا انسان پھر واپس نہیں آتا۔ مگر ایک عجیب بات ہوئی کہ میں نے بابا کے متعلق کسی سے کوئی بات نہ کی۔ ممان سے بھی نہیں۔ اس بارے میں بالکل چُپ سادھ لی۔"

8. 'بالو' اور 'بگیرا'

"اب والدہ نے میری تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کی۔ پیانو، شہسواری، پیراکی، ایک ٹیوٹر انگریزی پڑھانے گھر آتا تھا۔ مذہبی تعلیم بھی دی گئی۔ سارا خاندان مذہبی تھا۔ آئے دن

زیارات کے لیے مختلف مقبروں پر جاتا رہتا تھا۔ اسکول میں اسپورٹس میں بہت اچھی تھی اور تصویر کشی میں بھی اور قدیم شاہانِ ایران کی تاریخ بڑی دلچسپی سے پڑھتی تھی اور بے حد قوم پرست تھی۔

جس وقت سوویت یونین نے شمالی ایران پر قبضہ کیا اور نوجوان شاہ فوج کی کمانڈ کرنے محاذ پر گئے اور ایرانی آذربائیجان روسیوں سے واپس چھین کر ظفر مند واپس آئے طہران میں فتح کا جشن منایا گیا۔ ہم اسکول کے بچے چھوٹے چھوٹے ایرانی پرچم لہراتے جاوید شاہ! جاوید شاہ کے نعرے لگاتے سڑکوں کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ بھیڑ میں سے اُچک کر بھی شاہ کی سواری نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آخر میں نے ہم عمر ساتھیوں سے کہا آؤ اس گیراج کی چھت پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ چھت پر چڑھ کر ہم نے شاہ کا جلوس دیکھا اور قومی فخر اور مسرت سے بھرپور خوب نعرے بلند کیے اور تالیاں بجائیں۔

1950 عیسوی میں ہم اسکول کی لڑکیوں نے یہ خوش خبری سنی کہ شاہ معظم دوسری شادی کر رہے ہیں۔ ملکہ فوزیہ سے طلاق کے دو سال بعد۔ موزیل ثریا اسفندیاری سے ان کی نسبت طے پائی۔ وہ ایک طاقت ور بختیاری قبیلے کے سردار کی لڑکی تھیں بے حد حسین اور سوئٹزرلینڈ میں پڑھ رہی تھیں۔ ان کی والدہ جرمن تھیں۔ اسکول میں ہم لوگ بے انتہا اشتیاق سے شادی کے متعلق ساری خبریں پڑھا کرتے۔ ان کا جہیز فرانس میں خریدا جارہا ہے۔ شادی کے لیے فلاں فلاں ملک کے بادشاہ اور صدرِ مملکت آئیں گے وغیرہ۔ یہ سب پڑھ کر ہم کو بے حد خوشی اور اکسائٹمنٹ ہوتا۔

جنوری 1951 عیسوی میں دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ایک بار پھر میں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑی تہنیتی نعرے لگا رہی تھی۔ شاہی دولہا دلہن کی موٹر سامنے سے گذری۔ ان دونوں کی جھلک نظر آئی اور ہم لوگ بے حد مسرور ہوئے۔

شادی کے بعد اب ساری قوم نے ولی عہد کی پیدائش کا انتظار شروع کیا کیونکہ ملکہ فوزیہ کو بھی اسی وجہ سے طلاق ملی تھی کہ ایرانی آئین کے مطابق ولی عہد کی ولادت ضروری تھی۔

ملکہ ثریا کی سال گرہ کے روز ثریا اسٹیڈیم میں میں اپنی ٹیم لیڈر کی حیثیت سے ہر امپیریل میجسٹی کو سلامی دیتی شاہی بالکنی کے سامنے سے گذری۔ اسکول کی اسپورٹس ریہرسل میں اوّل آئی

تھی۔ اس روز اسٹیڈیم میں میرا تیسرا نمبر تھا۔ مجھے بے حد مایوسی ہوئی اور اپنے اوپر غصہ آیا۔ افسوس سب سے زیادہ اس بات کا تھا کہ علیا حضرت کے ہاتھ سے مجھے تمغہ نہیں ملے گا۔ جب میں گھر پہنچی تو مجھے بخار آ گیا۔ دوسرے روز سہ پہر کے وقت کاخ سعد آباد میں اسپورٹس کے مقابلے جیتنے والی ساری لڑکیوں کو ایک گارڈن پارٹی پر بلایا گیا تھا۔ بخار کی وجہ سے وہاں بھی نہ جا سکی اور اس رنج اور مایوسی کی وجہ سے اور زیادہ نڈھال ہوئی۔ اس روز بستر پر کروٹیں بدلتے بخار میں مبتلا میں نے سوچا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ ایک روز اولمپک اسٹار بن کر ایران کے لیے طلائی تمغہ حاصل کروں گی۔ اولمپک اسٹار بننا میری سب سے بڑی تمنا تھی۔

موسم گرما میں ہم لوگ شمران چلے جاتے تھے جہاں ہماری ذاتی ولا تھی۔ وہاں ہم سب کزن پہاڑیوں پر کھیلتے، خچروں پر سواری کرتے۔ رات کو رستم و اسفندیار کے قصے سنتے۔ کبھی گرمیوں میں لاہیج یا تبریز جاتے۔ لاہیج کے چائے کے باغات میں کام کرنے والوں کا ہاتھ بٹاتے۔ شہسواری کرتے اور رات کو گھر کے بڑے بوڑھوں سے شاہنامہ مثنوی شیریں خسرو سنتے۔ اکثر زیارت کے لیے مشہد مقدس جاتے۔

طہران آج جیسا موڈرن نہیں تھا اور ہمارا گھرانہ کافی قدامت پسند تھا۔ لہٰذا ہم لوگوں کا ''ڈیٹ'' کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اور میری سہیلیاں امریکن مغنیوں کے گانے ٹیپ کر کے فون پر ایک دوسرے کو سناتے یا ایک دوسرے کے ہاں پارٹیوں میں۔ میں اسکول میں بہت ہر دل عزیز تھی اور میری نیک دلی اور دوسروں کے کام آنا بہت مشہور تھا، ایک بار میں نے ایک غریب طالب علم کو اپنا سارا لنچ پیک دے دیا تھا۔ کم مایہ لوگوں کی مدد کرتی تھی اور گھر پہ اور اسکول میں جب میری تعریفیں کی جاتیں تو میں سوچتی چونکہ میرے بابا کا انتقال ہو چکا ہے لوگ میرے اوپر اتنے مہربان ہیں اور میری دل جوئی کے لیے میری تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ اتنی کم عمری میں اس قدر توصیف سے کسی بھی لڑکی کو اپنے متعلق مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرے سینس آف ہیومر نے مجھے ایک بور قسم کی نیکی کی پتلی بننے سے بچا لیا۔

1954 عیسوی میں میں نے اسکول کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ میں بڑی جوشیلی گرل گائیڈ بھی

تھی۔ رازی اسکول اور ایک اور فرانسیسی مدرسے کے اسکاؤٹ پروگرام کو ایک فرنچ راہب فادر گویا ڈائریکٹ کرتے تھے۔ انھوں نے کپلنگ کی جنگل بک کے کرداروں کے نام ہم لوگوں کو عطا کر رکھے تھے میں بالو (بھالو) کہلاتی تھی اور میری سہیلی لیلیٰ بگیرا (بگھیرا) البرٹ شوئٹزر میرے آئیڈیل تھے۔

21 مارچ جشن نوروز ہمارا تہوار ہے۔ اس روز لوگ دربار شاہی میں سلامی کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ میرے ایک چچا اعلیٰ حضرت کے چیمبر لین تھے۔ ہر سال سلامی کے روز ہز میجسٹی اپنے اراکین دربار کو سلامی کے وقت ایک ایک پہلوی (اشرفی) عطا کرتے تھے۔ چچا وہ اشرفیاں لاکر مجھے دے دیتے کہ بطور نیک شگون ان کو اپنے پاس رکھو۔ اس طرح میرے پاس بہت اشرفیاں جمع ہوگئیں۔

1956 عیسوی میں رازی اسکول سے (جہاں میں ڈانڈارک کے بعد داخل ہوئی تھی) میں نے تعلیم مکمل کی۔ گھر کے بزرگوں نے طے کیا کہ میں پیرس جاکر فنِ تعمیر کی تربیت حاصل کروں۔ پیرس روانگی سے قبل صبح کو میں نے اپنی والدہ سے کہا شام کو میرے کمرے میں آیئے گا۔

والدہ ذرا متعجب ہوئیں کیونکہ میں جذباتی اور اسرار پسند کبھی نہیں تھی۔ شام کو جب وہ میرے کمرے میں آئیں میں نے ان سے کہا کہ یورپ روانہ ہونے سے قبل بابا کو خدا حافظ کہنا چاہتی ہوں۔

ضرور۔ یقیناً۔ ماماں نے جواب دیا۔

لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ کیا میں منور خانم کو اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں۔ 1947 عیسوی کے اس روز جب خاندان قبرستان سے لوٹ کر آیا تھا اس کے بعد آج پہلی بار میں نے بابا کا نام لیا تھا۔ منور خانم نے اپنی چادر اوڑھی اور ہم دونوں کار میں قبرستان امام زادہ عبداللہ گئے۔ اسی شام میں پیرس روانہ ہوگئی۔"

9. ہالینڈ پویلین، پیرس

"1956 عیسوی کے اکیڈمک ٹرم کے آغاز میں نو جوان ایرانی لڑکیاں بین الاقوامی درس گاہ میں وارد ہوئیں جو پیرس کے نزدیک طلبا کا بین الاقوامی مرکز ہے۔ کیمپس کے ہالینڈ پویلین میں پانچ عدد ایرانی دانش ور جو اقامت گزیں ہوئے ان میں یہ تین لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ماموزیل مہری کبوجیہ جو سوربون میں ریاضی پڑھنے آئی تھیں۔ ماموزیل آزاد بانیاں بایوکیمسٹری کی طالب علم تھیں اور ماموزیل فرح دیبا اسکول آف آرکی ٹیکچر میں داخل ہوئیں۔

کیمپس پر شروع شروع میں مجھ کو اسی قسم کے احمقانہ سوالات کا سامنا کرنا پڑا جو اہل مغرب اوبدا کر مشرقیوں سے پوچھتے ہیں تمھارے باپ کے حرم میں کتنی بیویاں ہیں؟ تمھاری شادی کے وقت بہ طور BRIDE PRICE تم کو کتنے اونٹ دیے جائیں گے؟ تمھارا ریگستان تو بے حد گرم ہوگا۔ تم لوگ خیموں میں رہتے ہوگے وغیرہ۔ دوسرا مسئلہ ڈیٹ کا سامنے آیا۔ میں نے سمجھایا کہ میرے ملک میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ ڈیٹ نہیں کرتیں۔ اس پر بھی جب لوگ مصر رہے تو میں نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ وطن میں میری ایک ایرانی نو جوان کے ساتھ نسبت طے ہو چکی ہے۔

نئے طلبا کو تنگ کرنا وہاں کا قاعدہ بھی تھا۔ دوسرے سال خود میں نئے طلبا کو RAG کرنے کے ہنگامے میں شامل تھی۔

RAGGING ذرا زیادہ ہوگئی تھی بہ طور سزا ملزموں کو دو ہفتے کے لیے کلاس بدر کر دیا گیا تھا۔ جب ملزم واپس آئے تو ان کے ساتھیوں نے مجاہدوں کی طرح ان کا استقبال کیا۔ ہر مجاہد کو ایک ایک تمغہ عطا کیا گیا۔ ملزم فرح خانم کو جو تمغہ ساتھیوں کی طرف سے ملا اس پر بلی کی تصویر بنی تھی۔ فرنچ زبان میں بلی LECHAT کا تلفظ شا ہے اور یہ فرح دیبا کے ملک کے شاہ سے ملتا جلتا تھا اس وجہ سے یہ رعایت لفظی استعمال کی گئی۔

ہر سال جنوری کے مہینے میں فرنچ طلبا FEST OF KINGS مناتے تھے۔ اس میں یہ

ہوتا تھا کہ ایک کیک تیار کرتے ہیں اس کے اندر دو بیج ڈال دیے جاتے جس لڑکے یا لڑکی کے ہاتھ میں اتفاقیہ وہ ٹکڑے آتے جن سے وہ بیج نکلتے ان کو بادشاہ اور ملکہ بنایا جاتا۔ ایک جنوری میرے کیک کے ٹکڑے میں سے بیج برآمد ہوا لہٰذا مجھے کاغذ اور پنی کا نقلی تاج پہنایا گیا۔ جشن کے بعد میں اپنا تاج اتارنا بھول گئی اور بے دھیانی میں اسے پہنے پہنے اپنی کلاس میں چلی گئی۔ ایک مرتبہ کالج کے فینسی ڈریس بال میں قدیم روما کی ملکہ بنی۔

میں بہت محنتی طالب علم تھی۔ رات گئے تک پڑھا کرتی۔ کھانا کالج کیفے ٹیریا میں کھایا جاتا تھا۔ ہوسٹل میں میرا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ رات کو کافی بنانے کے لیے عمارت کی سب سے اونچی منزل پر جہاں پینٹری تھی کیتلی لے جانا پڑتی تھی لہٰذا میں نے یہ ترکیب نکالی کہ ایک چرخی کے ذریعے ایک ٹوکری رسی سے اپنی کھڑکی کے نیچے لٹکا دیتی۔ اس میں کیتلی رکھ دی جاتی نچلی منزل پر مہری کیبو جیہ اپنی کھڑکی میں سے وہ کیتلی لے لیتی۔ رسی کے دونوں طرف گھنٹیاں لگا دی گئی تھیں اور اکثر یہ ''ٹیلیفون'' خفیہ پیغام رسانی کا کام بھی انجام دیتا۔

موسم بہار میں ہم تینوں ایرانی لڑکیاں نوروز منانے کے لیے ''ہفت سین'' کا سامان اکٹھا کرنا شروع کرتیں ہفت سین میں سبزہ و سمنو سنجد و سماق و سیر و سنبل و سرکہ شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آئینہ، قرآن، اسپند، شمع ہائے رنگی، ماہیائے قرمزہ ظرف، بلورۂ آب، گل، شرینی، آجیل و میوہ بھی چاہیے۔ لیکن ہفت سین کی اشیا لازمی ہیں۔ یہ سات چیزیں ہم تینوں کئی دن پہلے سے جمع کرنا شروع کر دیتے مہری کے کمرے میں 21 مارچ کے روز جشن منایا جاتا۔

نوروز سے چند دن قبل مارچ کی ایک روشن صبح ہفت سین کے لیے سرکہ لانے ہوسٹل کے کیفے ٹیریا میں گئیں۔ خادمہ نے سرکہ کی بوتل دیتے ہوئے کہا ''ماموزیل! آپ نے آج کی تازہ خبر پڑھی؟''

''میں نے ابھی اخبار نہیں دیکھا۔''

''یہ لیجیے۔ بڑا افسوس ہوا۔'' خادمہ نے اخبار سرکاتے ہوئے کہا۔ ایک سرخی تھی:

''شاہ ایران نے ملکہ ثریا کو طلاق دے دی کیونکہ وہ لاولد رہیں۔ شاہ نے چند سال قبل

ملکہ فوزیہ کو بھی اسی وجہ سے طلاق دے دی تھی کہ وہ ولی عہد کو جنم نہ دے سکیں۔

اکثر نوعمر طلبا کی طرح رات کو سونے سے پہلے میں بھی ڈائری لکھا کرتی تھی۔

اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہمایوں نے شہبانو کو طلاق دے دی۔ بڑے افسوس کی بات کہ شہبانو کے ہاں ولی عہد پیدا نہ ہوا اور شاہ کو المناک قدم اٹھانا پڑا۔

پیرس میں آج کل بہار آئی ہوئی ہے۔ ایران میں بھی موسم گل آ گیا ہوگا لیکن ملکہ ثریا کے لیے یہ موسم بہار کتنا کرب ناک ثابت ہوا۔

اب فرانس کے اخباروں نے شاہ کی تیسری شادی کے متعلق قیاس آرائیاں شروع کیں۔ میرے فرانسیسی دوستوں نے مجھے چھیڑا۔ LECHAT والا لطیفہ پھر دہرایا جانے لگا۔ اخباروں میں آ رہا تھا کہ فلاں فلاں حسین جمیل امیر زادیاں دربار میں پیش کی جا رہی ہیں۔ فلاں فلاں بین الاقوامی شہرت کی حسینہ کے متعلق خیال کیا جا رہا ہے وغیرہ۔ ایک روز ایک انگریز کلاس فیلو لڑکی نے مجھ سے مذاقاً کہا ارے تم ہی جا کر اپنے شاہ سے شادی کر لو نا۔ تم بھی تو اچھی خاصی ہو۔"

"ہاں ہماری فرح کیا بُری ہے وہ خود لاکھوں میں ایک ہے۔" ایک فرنچ لڑکی بولی۔

میں نے بھی مزاحاً جواب دیا "ہاں ہاں بالکل۔ خیال بُرا نہیں۔"

"اس سال گرمیوں کی تعطیلات میں ہم تینوں برٹنی کے ساحل پر گئے۔"

باز کے جزیرے سے واپسی پر سمندر میں طوفان آ گیا۔ تیز بارش اور ہوا کے تھپیڑے۔ کشتی پانی سے بھر گئی۔ کشتی میں سیاحوں کی بھیڑ تھی۔ تینوں پانی سے شرابور مسافروں کے دھکے کھاتے کیچڑ میں پچ پچ کرتے ساحل پر اتر کر کسی سرائے کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ تیز ہوا ہم کو اڑائے دے رہی تھی: اگر میں نے کبھی دنیا میں نام پیدا کیا یہ خوفناک دن ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ میں نے سردی سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ شدید بارش کی دھند کی وجہ سے راستہ بھی صاف بھائی نہیں دے رہا تھا۔ بدقت تمام ہم تینوں ایک ہوٹل تک پہنچے، ہوٹل کے مالک اور اس کی بیوی نے ہم کو فوراً خشک کپڑے پہننے کے لیے دیے۔ آتش دان کے سامنے بٹھال کر گرم کافی پلائی اور انتہائی

شفقت کے ساتھ ہماری دیکھ بھال کی۔ میں ان مہربان بوڑھے میاں بیوی کو بھی نہیں بھولوں گی۔ میں نے دل میں کہا۔

اگلی مرتبہ ہم تینوں سہیلیاں انگلستان گئیں لندن میں دوسرے سیاحوں کے ساتھ بکھنگم پیلیس کے پھاٹک پر کھڑے ہوکر گارڈز کی تبدیلی کا نظارہ کیا اور ٹاور میں جا کر کراؤن جویلز دیکھے۔ میڈم تُسّاں کا عجائب خانہ اور جان اور بورن کا تازہ ڈرامہ ملاحظہ کیا اور خوش خوش پیرس آ گئے۔"

"اوائل 1959 عیسوی میں مَیں اپنے ہم جماعت طلبا کے فرانس کے ایک صوبے میں ROMANESQUE طرزِ تعمیر کا مطالعہ کرنے گئی۔ ہاسٹل واپسی پر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی میز پر رکھے ایک دعوت نامے پر نظر پڑی جو ایرانی سفیر کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے فوراً چرخی سے لگی رسی کی گھنٹی تین دفعہ ہلائی جس کا مطلب تھا اشد ضروری۔ فوراً اوپر آؤ۔

مہری کبوجیہ بھی وہی دعوت نامہ لیے اوپر پہنچیں۔ ہالینڈ پویلین کے پانچوں ایرانی طلبا کے نام وہ کارڈ آئے تھے جو بے حد عزت افزائی کی بات تھی۔ ہزامپیریل میجسٹی محمد رضا پہلوی اسٹیٹ وزٹ پر فرانس آئے ہوئے تھے اور فلاں تاریخ کو اپنے سفارت خانے میں ایرانی طلبا سے ملنا چاہتے تھے۔"

"ایرانی سفارت خانے کی دعوت بہت ہی خیرہ کن عالی شان منظر تھا۔ فرانس کے اہم ترین لوگ اور ان کی بیویاں ہیرے اور منک گاؤن۔ وردیاں۔ ہال کے ایک سرے پر آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ آتش دان کے اوپر شاہ کے برابر جہاں ملکہ ثریا کی تصویر لگی رہتی تھی اب وہ جگہ خالی تھی۔ اس خالی جگہ کو دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔

کچھ دیر بعد ہزامپیریل میجسٹی کی آمد کا اناؤنس منٹ کیا گیا۔ مجمع میں مؤدب سکوت طاری ہو گیا۔ سب دیواروں کے برابر برابر کھڑے ہو گئے۔ اعلیٰ حضرت اندر داخل ہوئے۔ اپنی تیز گہری نظروں سے چاروں طرف نگاہ کی اور شاہانہ تبسم سے مسکرائے۔ بہت سنجیدہ متین انسان تھے

اور بہت دلکش۔

پہلے وی آئی پی ان سے ملوائے گئے۔ ان میں سے چند سے اعلیٰ حضرت نے مختصر گفتگو کی۔ اس کے بعد طلبا پیش کیے گئے۔

اپنی باری پر میں آگے بڑھ کر گھٹنوں سے ذرا سا جھکی۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ بادشاہ کے سامنے کتنا جھکنا چاہیے کیونکہ جس وقت ایرانی اور یورپین خواتین کرٹسی کر رہی تھیں میں نے ان کو نہیں دیکھا تھا اور اپنے دوستوں سے باتوں میں مشغول تھی۔''

''لیکن مجھے معلوم تھا کہ رائلٹی پہلے بات کرتی ہے۔''

شاہ نے پوچھا: ''پیرس میں کیا پڑھ رہی ہو؟''

میں نے بتایا

''یہاں رہنا اچھا لگتا ہے؟''

''جی ہاں یور میجسٹی''

''گریجویشن کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

''اپنے وطن واپس جا کر لوگوں کے لیے مکان بناؤں گی یور میجسٹی''

''شہنشاہ مسکرائے'' لگتا تھا ان کو یہ جواب پسند آیا۔

''دوسری طالب علم پیش کی گئی۔ میں نے پھر کرٹسی کی اور پیچھے ہٹ گئی۔''

چند ماہ بعد 1959 عیسوی کے موسم گرما میں فرح، مہری اور ثریا چھٹیاں گذارنے وطن واپس گئیں۔ تہران تیزی سے بدل رہا تھا۔ نئی عمارتیں، نئی سڑکیں، حال ہی میں ایران ڈاکٹر مصدق والے المناک سیاسی کرائسس سے گذر چکا تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے سے ذرا قبل مجھے یاد آیا کہ پیرس کی تعلیم کے سلسلے میں وزارت تعلیم میں کچھ کام اٹکا ہوا ہے۔ میں نے اپنے چچا سے اس کا ذکر کیا۔ یہ وہی چچا تھے جو مجھے نوروز پر بادشاہ

سلامت کی عطا کردہ پہلوی اشرفیاں دیا کرتے تھے اور جواب بھی اعلیٰ حضرت کے چیمبرین تھے۔ یہ چچا بزا اپیریل ایجنسی کے داماد اور اردشیر زاہدی کے بھی دوست تھے۔ اردشیر زاہدی شاہ محمد رضا پہلوی کی اکلوتی لڑکی شاہ دخت شہناز کے شوہر تھے اور وزارتِ تعلیم میں اس شعبے کے سربراہ تھے جو بیرونی ممالک میں پڑھنے والے طلبا کے معاملات سے تعلق رکھتا تھا۔

چچا نے کہا کہ میں آقائے اردشیر زاہدی سے اپوائنٹمنٹ کروائے دیتا ہوں تم جا کر دفتر میں ان سے مل لو۔

چنانچہ ایک سہانی صبح میں وزارتِ تعلیم پہنچی اور ہال میں بیٹھی ریسپشنسٹ لڑکی سے کہا کہ اردشیر زاہدی صاحب سے وقت ملاقات مقرر کیا جا چکا ہے۔ لڑکی نے مجھے فوراً اندر پہنچا دیا۔

اردشیر زاہدی اپنی میز پر ایک فائل میں مستغرق تھے۔ ایک نوجوان خاتون کو اندر آتا دیکھ کر تعظیماً اٹھے اور مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ چائے منگوائی میں نے پیرس میں اپنی مزید تعلیم سے متعلقہ مسئلے کا تذکرہ کیا۔ آقائے زاہدی نے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد ان کی فائل منگوا کر دیکھیں گے۔ اس کے بعد وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

اچانک انھوں نے کہا "خانم آپ پیرس واپس جانے سے قبل کسی روز ہمارے ہاں آ کر کھانا کھایئے۔ شاہ دخت آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

میں نے جواب دیا کہ کسی روز ضرور ان کے ہاں آؤں گی۔ آقائے زاہدی دروازے تک پہنچانے آئے۔ میں ان فائلوں اور پیرس کے کالج میں اپنے نئے کورس کے متعلق سوچتی ہوئی گھر واپس لوٹی۔

اگلے ہفتے ایک ڈنر میں شاہ دخت شہناز سے میری اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے پہلی ملاقات ہی میں مجھے پسند کیا۔ آئندہ چند دنوں میں پھر مختلف پارٹیوں اور دعوتوں میں ہم ایک دوسرے سے ملے۔ ایک ہفتے بعد میرے نام شاہ دخت کا دعوت نامہ پہنچا۔ انھوں نے اپنے محل واقع شمران، طعام شب کے لیے مدعو کیا تھا۔"

اس ڈنر کے بعد شاہ دخت نے فرح خانم کو دوبارہ اپنے ہاں بلایا۔

''وہ ایک گرم روشن سہ پہر تھی۔ میں پیرس واپس جانے کے لیے اسباب باندھنے میں مصروف تھی اور متفکر تھی کہ وزارتِ تعلیم سے اس مسئلے کے متعلق اب تک کوئی سرکاری جواب موصول نہیں ہوا۔ شام ہونے والی تھی۔ میں اپنے سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہی تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی چچی اندر آئیں۔''

میرے لیے منسٹری سے کوئی خط آیا۔ میں نے پُرامید لہجے میں دریافت کیا۔

خط—؟ نہیں تو۔ میں تو تمھیں یہ یاد دلانے آئی ہوں کہ آج شام کو تمھیں شاہ دخت کے محل جانا ہے۔ تم سفر کی تیاری میں اتنی مصروف ہو کہ مجھے خیال آیا کہ تم وہاں جانا بھول نہ جاؤ۔

''نہیں...... میں نہیں بھولوں گی لیکن چچی مجھے بڑی فکر ہے۔ آپ چچا سے کہیے کہ کل صبح آقائے زاہدی کو میرے فائل کے متعلق ضرور بہ ضرور فون کر دیں۔''

''ہاں ہاں کہہ دوں گی لیکن تم آج شام ہی آقائے زاہدی سے ان کے محل میں ملنے والی ہو۔''

اتنا کہہ کر چچی کمرہ سے غائب۔''

''اندھیرا پڑے شمران جاتے ہوئے فرح خانم نے دیکھا۔ شاہراہ پہلوی کے دونوں جانب استادہ اونچے پوپلر اپنی پتیاں گرانے لگے تھے۔ موسم خزاں کی خنک اور فرحت بخش ہوا چلنی شروع ہوئی تھی۔ آفتاب کوہ البرز کے پیچھے غروب ہونے والا تھا۔ جب فرح خانم کی کار شاہ دخت شہناز کے قصر میں داخل ہوئی، باغ پر ارغوانی روشنی پھیل رہی تھی جو بہت جلد شام کے سرمئی دھندلکے میں تبدیل ہو گئی۔

شاہ دخت لاؤنج میں اپنی مہمان کی منتظر تھیں۔ وہ مامو زیل فرح دیبا کو اپنے عالی شان ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

''فرح خانم نے ہر رائل ہائی نس سے کہا کہ ابھی تک منسٹری آف ایجوکیشن سے ان کے خط کا جواب نہیں آیا ہے۔

یہ تاخیر غالباً سرخ فیتے کی وجہ سے ہے۔ ریڈ ٹیپ۔
شاہ دخت نے مسکرا کر جواب دیا: سب ٹھیک ہو جائے گا۔
میں صوفے پر بیٹھی شاہ دخت سے باتیں کر رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ہز امپریل میجسٹی ڈرائنگ روم کے صدر دروازے میں کھڑے ہیں۔ مجھے ذرا تعجب ہوا۔ غالباً اعلیٰ حضرت اتفاقیہ اپنی بیٹی سے ملنے آ گئے تھے۔ مجھے علم نہ تھا کہ شاہ بھی اس مختصر نجی دعوت میں شرکت کرنے والے ہیں۔
جب شہنشاہ اپنے شاہانہ وقار سے چلتے کمرے میں داخل ہوئے ہم دونوں فوراً تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ شاہ دخت نے اپنے والد سے میرا تعارف کرایا۔
"ہز میجسٹی نے مسکرا کر کہا کہ ان کو مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن مجھ پر انھوں نے جس انداز سے نظر ڈالی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکے حالانکہ صرف چند ماہ قبل میں پیرس کے ایرانی سفارت خانے کی دعوت میں ان کے حضور میں بہ طور طالب علم پیش کی گئی تھی۔
اس کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں بالکل نروس نہیں تھی۔ اعلیٰ حضرت نے دیکھا کہ صرف 21 برس کی عمر اور میں اپنی گفتگو بڑی خوداعتمادی سے کر رہی تھی اور خیالات سے ذہنی پختگی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ میں شاہ کو امپریس کرنے کی کوشش نہیں کر رہی نہ ضرورت سے زیادہ اسمارٹ اور ذہین بننے کی سعی میں مصروف ہوں۔
شہنشاہ دنیا دیکھے ہوئے تھے اور انسانوں کو پرکھ سکتے تھے۔ زیادہ تر لوگ جو اُن سے ملتے تھے ان کو بے انتہا مؤدب رہنا پڑتا تھا یا وہ حد سے زیادہ مرعوب ہو جاتے تھے۔ کوئی شخص شہنشاہ ایران کے ساتھ بے تکلفی کا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر آپ رائلٹی سے دوستانہ حیثیت سے بھی ملیں تب بھی آپ کو ایٹی کیٹ اور پروٹوکول کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور ایک حد فاصل قائم رکھی جاتی ہے۔ ایک نوعمر لڑکی کے لیے جو اپنے بادشاہ سے پہلی مرتبہ سوشل طریقے سے مل رہی تھی۔ یہ وقت

بہت کٹھن ہوسکتا تھا۔

شہنشاہ چالیس سال کی عمر میں یہ بھی جانتے تھے کہ ان کو بیوی کی حیثیت سے کس نوع کی عورت درکار ہے۔

"ہزامپریل مجسٹی اپنی بیٹی کے گھر پہ طعام شب کے لیے بھی ٹھہر گئے۔"

کھانے کی میز پر بھی وہ زیادہ تر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ شاہ وخت ہی نے چند روز قبل اعلیٰ حضرت سے کہا تھا کہ ان کی ایک اعلیٰ شریف خاندان کی لڑکی سے ملاقات ہوئی ہے اور فلاں شام میرے ہاں آکر ان سے مل لیجیے۔ اور اب یہ ملاقات کامیاب معلوم ہورہی تھی۔

کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہوئے اعلیٰ حضرت کو معلوم ہوا کہ مجھے اسپورٹس سے بے حد دلچسپی ہے۔ شاہ خود بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ کسی روز ان کے محل آکر ان کے گھر والوں کے ساتھ ٹینس کھیلوں۔

موسم گرما کی تعطیلات عنقریب ختم ہوا چاہتی تھیں۔ مہری اور قمر واپس پیرس چلی گئیں۔ لیکن وہ بہت متعجب تھیں کہ میں ان کے ہم راہ فرانس کیوں نہیں گئی۔"

ہالینڈ پویلین واپس پہنچ کر مہری اور قمر نے اپنی سہیلی کا انتظار شروع کیا۔ ہر روز وہ صبح صبح ایک تازہ گلدستہ خرید کر اسے فرح خانم کے کمرے کے گل دان میں سجا دیتیں اور متوقع رہتیں کہ آج کی فلائٹ سے فرح خانم طہران سے آ جائیں گی۔

ایک صبح وہ گل دستہ خرید کر ہاسٹل واپس آرہی تھیں کہ راہ میں ان کو ہاسٹل کی بوڑھی کونسی ارژ (عمارت کی دیکھ بھال کرنے والی خادمہ) ملی۔ اس نے کہا میں تم دونوں کو روز بلا ناغہ اپنی سہیلی کے لیے پھول خریدتے دیکھتی ہوں۔

"ٹرم شروع ہو چکی ہے لیکن وہ اب تک نہیں آئیں۔" مہری نے جواب دیا۔

اوہ۔ بڑھیا نے کندھے اچکائے۔ "پھول مت خریدتی جاؤ، تمھاری سہیلی نے غالباً شاہ سے بیاہ کرلیا ہے اب وہ یہاں نہیں آئے گی۔"

دوسرے روز فرانس کے اخباروں نے جلی سرخیاں شائع کیں" شاہ ایران پیرس میں زیر

تعلیم ایک ایرانی دوشیزہ سے شادی کرنے والے ہیں۔"
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بوڑھی خادمہ علم غیب جانتی تھی۔

"ہر رائل ہائی نس شاہ دخت شہناز کے محل میں ڈنر کے چند روز بعد مجھ کو اعلیٰ حضرت اور ان کے احباب کے ساتھ شام گذارنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ٹینس کھیلنے میں ایک مرتبہ جب گیند بہت دور جا گری۔ فرح خانم نے اس کا انتظار نہ کیا شاہی خادم اسے اٹھا کر لائے، دوڑتی ہوئی جا کر جھاڑیوں میں سے خود تلاش کر لائیں۔ ہز مجسٹی نے یہ نوٹس لیا۔

چائے کے وقت اعلیٰ حضرت نے چند اہم معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فرح خانم نے بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے اختلافات کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے یہ بھی نوٹس لیا۔ اور میں ان سے اتنی چھوٹی تھی کہ جب ان کی پہلی شادی مصر کی شہزادی فوزیہ سے ہوئی اس سال میں پیدا ہوئی تھی۔"

10. رضا شاہ کبیر اور سلطانہ تاج الملوک

"دو دن بعد مس دیبا کو ہر مجسٹی تاج الملوک مادر شاہ نے اپنے قصر میں مدعو کیا۔ رضا شاہ کبیر کی بیوہ اگلے وقتوں کی ایک پُر جلال سلطانہ معلوم ہوتی تھیں حالانکہ ملکہ بننے سے قبل وہ بھی ایک مڈل کلاس خاتون تھیں۔ شاہ محمد رضا پہلوی اپنی ماں کو بے حد چاہتے تھے۔ مادر شاہ کا قصر ان کی اولاد کے لیے اب بھی ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

رائل فیملی دراصل پشتینی شاہی خاندان نہیں (گو ابھی چند سال قبل شاہ محمد رضا پہلوی کا سلسلہ نسب سائرس سے ملا دیا گیا ہے) رضا شاہ پہلوی ایک عام آدمی تھے جو شمالی صوبہ ماژندران کے ایک سخت کوش سپاہی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے وہ چھ ہفتے کے تھے جب ان کے باپ چل

ہیے۔ ان کی والدہ ان کو رشتہ داروں کے پاس لے جانے کے لیے طویل خطرناک سفر پر روانہ ہوئیں۔ برف پوش کوہستان البرز کی پیچیدہ راہوں میں پہنچ کر ان کا کارواں بھٹک گیا۔ شدید برف باری کی وجہ سے راستے مسدود تھے۔ نوزائیدہ رضا خاں کی والدہ گود میں بچے کو سنبھالے گھوڑے پر سوار تھیں۔ بچہ سردی کی وجہ سے نیلا پڑ چکا تھا۔ انھوں نے دہشت زدہ ہو کر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اچانک انہیں چٹان کے پیچھے ایک چھوٹا سا مقبرہ دکھائی دے گیا۔ انھوں نے گھوڑا مقبرے کی طرف دوڑایا جس میں چراغ روشن تھا۔ کارواں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ مقبرے کے برابر ایک چائے خانہ بھی تھا۔ جس کے اندر سموری فرغلوں میں ملفوف چند پہاڑی سماوار کے گرد بیٹھے صبر سے برف باری کے خاتمے کے منتظر تھے۔ آگ جل رہی تھی۔ وہ ایک امام زادہ کا روضہ تھا۔ رضا خاں کی والدہ نے قریب المرگ بچے کو مزار کے سامنے رکھ کر اس کی زندگی کی دعا مانگی۔

چائے خانے کی گرمی یا امام زادے کے معجزے سے بچہ بچ گیا۔ اگر شمالی ایران کے پہاڑوں کی اس یخ بستہ رات وہ بچہ سردی سے ہلاک ہو گیا ہوتا تو تاریخ ایران آج مختلف ہوتی۔

رضا خاں کا بچپن ایران کے سیاسی تنزل و انتشار کا زمانہ تھا۔ چودہ سال کی عمر میں رضا خاں اپنے خاندان کی روایت کے مطابق شہسوار رسالے میں معمولی زیر تربیت سپاہی بھرتی ہو گئے۔ وہ قطعی اَن پڑھ تھے۔ حرف شناسی بھی نہ جانتے تھے۔ اس زمانے میں تعلیم صرف دولت مند طبقے کے بچوں کے لیے مخصوص تھی۔ اپنی ذہانت و صلاحیت کی بنا پر رضا خاں سپاہی سے ترقی کر کے افسر بن گئے۔ وہ دن میں روسیوں کے خلاف میدانِ جنگ میں جا کر مورچہ سنبھالتے اور رات کو اپنی بارک کے کمرے میں آ کر لالٹین کی روشنی میں خود اپنی کوشش سے فارسی پڑھنا لکھنا سیکھتے۔

ان کی خانم ایک فوجی افسر کی سمجھدار بیوی تھیں۔ جب وہ طہران کے ایک اپر مڈل کلاس محلے کے ایک مکان میں رہتے تھے جہاں ان کے توام بچے محمد رضا اور اشرف خانم پیدا ہوئے۔ اس وقت شاہ قاچار مع اپنے شاہی خاندان کے اپنے پر شکوہ محلات میں قیام پذیر تھے اور نہ

جانتے تھے کہ چند برسوں میں تختہ الٹنے والا ہے۔

اسی وجہ سے مادر رضا شاہ خدا کی کارسازیوں کی بے انتہا قائل تھیں (ان دنوں یعنی 1979 عیسوی میں وہ مع دوسرے شاہی افراد کے ایران سے فرار ہو کر کیلی فورنیا میں تشریف رکھتی ہیں)۔

رضا شاہ کبیر کو معلوم تھا کہ خاندانِ ساسانیہ کا بانی بھی ایک معمولی سپاہی کا بیٹا تھا۔ سلاطین عثمانیہ کا جدِ امجد ایک سپاہی اور شاہانِ صفویہ کا مورثِ اعلیٰ مازندران کا ایک بے مایہ درویش تھا۔ رضا شاہ کبیر کو اس امر پر فخر تھا کہ وہ سپاہی آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کو سپاہیانہ تعلیم دلوائی۔ ملک کے نوجوانوں کی تندرستی (یہ ایک قدیم زرتشتی اصول بھی ہے) کا پروگرام شروع کیا۔ ان کے سارے لڑکے لڑکیاں ماہر شہسوار، نشانہ باز، چوگان کھیلنے اور طیارے اڑانے میں ایکسپرٹ ثابت ہوئے۔ شہزادیوں نے زنانِ نو کی رہبری شروع کی۔ ریڈ کراس کے طور پر "شیر و خورشید" کا ادارہ قائم کیا۔ شاہ کی سب سے چھوٹی بہن شاہ دخت فاطمہ ایک ماہر ہوا باز ہیں۔

چنانچہ اس غیر معمولی قسم کے سیلف میڈ بادشاہ کی بیوی اور اولاد سے ملنے اس شام خانم فرح دیبا مادر شاہ کے قصر پر پہنچیں۔ کاخ اسٹریٹ سے آئی ہوئی اس نا حال گمنام لڑکی سے ملنے کے لیے وہ سب موجود تھے۔

مجھے سب سے پہلے مادر شاہ سے ملوایا گیا۔ اس کے بعد شہزادوں ان کی بیویوں اور شہزادیوں اور ان کے خاوندوں سے متعارف ہوئی۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ شاہی خاندان مجھ میں اچانک اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ چند منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے پرکھا جا رہا ہے۔ شاہی خاندان کے افراد دزدیدہ نگاہوں سے بغور دیکھ رہے تھے کہ کس طرح چلتی ہوں، کس طرح بات کرتی ہوں، اندازِ گفتگو کیسا ہے۔ تب اچانک پہلی مرتبہ مجھے قدرے گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ اتنی ساری شاہی آنکھوں کا مرکز بننا خاصے پریشان کن حالات تھے مگر بہت جلد میں نے اپنی خفیف گھبراہٹ پر قابو پالیا۔

مادر شاہ نے مجھے بہت پسند کیا۔ ان کے سارے خاندان نے بھی۔ ایک قدامت پرست ایرانی خاتون کی حیثیت سے مادر شاہ کو یہ بات بھی اچھی لگی کہ میں خالص ایرانی تھی۔ ملکہ فوزیہ

البانی نژاد مصری تھیں اور ملکہ ثریا نصف جرمن۔

شہزادیوں کو میری ELEGANCE اور شائستگی بے حد پسند آئی۔ شہزادوں کو میری آؤٹ ڈور زندگی اور اسپورٹس میں دلچسپی اچھی معلوم ہوئی۔

سب سے بڑی بات یہ کہ خانم فرح دیبا ان کے برادر معظم شہنشاہ ہمایوں کو پسند آئی تھیں اور اعلیٰ حضرت لوگوں کو پرکھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ (اپنی رعایا کے اصل جذبات بھی ناپنے میں البتہ غلطی کر گئے)

ڈنر بہت دلچسپ تھا لیکن قدرے تکلف شامل ہو چکا تھا کیونکہ شاہی خاندان کو معلوم تھا کہ مہمان خصوصی غالباً بہت جلد ان کی ملکہ بننے والی ہیں۔"

11. شمران کی ایک سنہری شام

"شاہ دخت شہناز کے ڈرائنگ روم میں پہلی ملاقات کے ٹھیک ایک ہفتے بعد اسی کمرے میں شاہ نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

وہ اکتوبر کا آخری ہفتہ تھا۔ شام کی خنکی میں سردی کی لہر شامل ہو چکی تھی۔ باہر باغ میں خزاں کی خنک ہواؤں میں چلین کے درختوں کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ سارا شمران خزاں کے زرد پتوں کی وجہ سے سنہرا ہو چکا تھا۔ کہرے کے لطیف مرغولے باہر مکانات اور باغوں پر تیرتے پھر رہے تھے۔ سیلون پر گہری خاموشی تھی۔ اعلیٰ حضرت دریچے کے نزدیک ایک لوئی چہاردم کرسی پر فروکش تھے۔ وہ کچھ دیر سے مجھے اپنے بارے میں بتلا رہے تھے۔ ان کے فرائض، تصورات، مشن، گذرے ہوئے کل، آنے والے کل، خدا اور رسولؐ اور علیؑ اور آئمہؑ پر شدید اعتقاد۔ بین الاقوامی سیاست میں ایران کا رول۔

یہ ایک زندگی سے بڑا انسان تھا جو زندگی سے وسیع تر معاملات کے متعلق باتیں کر رہا تھا اور اپنی اس زندگی میں شرکت کرنے کی دعوت دے رہا تھا اور اس شخص کو میں بحیثیت شہنشاہ بچپن

سے اپنا آئیڈیل اور قومی ہیرو تصور کرتی آئی تھی اور اس شخص کی شریکِ حیات بننا ایک بہت عظیم ذمہ داری تھی۔"

"کیا تم میری ذمہ داریوں میں شامل ہونا پسند کرو گی؟" شاہ نے معاً دریافت کیا۔

میں نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔

"جی ہاں۔"

"مع اپنی والدہ اور ایک ممانی میں فرانس اپنا جہیز خریدنے بھیجی گئی۔ میں ایران کی ہونے والی ملکہ کی حیثیت سے یورپ جا رہی تھی۔ پروٹوکول کے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ لہٰذا مجھے ایک پرائیویٹ شہری کی طرح روانہ کیا گیا۔ لیکن "فرح دیبا اسٹوری" فرانسیسی پریس میں پہلے ہی چھپ چکی تھی۔ لہٰذا جنیوا کے ایرپورٹ پر رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کا جم غفیر موجود تھا۔"

پیرس پہنچنے سے قبل جرنلسٹوں نے ان کی سہیلیوں اور ساتھیوں کو کالج کیمپس پر ڈھونڈ کر ان کے پروفیسروں اور شناساؤں کو انٹرویو کیا مگر کوئی قابلِ ذکر بات کہیں سے معلوم نہ ہوئی۔ ایک نارمل قسم کی ایشیائی لڑکی جو سینکڑوں مشرقی طلبا کی طرح فرانس میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔ اور بس لیکن یہی معمولی پن "فرح دیبا اسٹوری" کے سحر کا راز تھا جیسے کوئی لڑکی آپ کے پڑوس میں رہتی ہو اور وہ اچانک ایک بادشاہ سے شادی کر لے۔

"دوسرے روز سارا پریس اور ٹی وی ایرپورٹ پہنچا۔ فرح خانم کی سہیلیاں بھی موجود تھیں۔ جب فرح خانم طیارے سے اپنی سہیلیوں کی طرف بڑھیں ایک لمحے کے لیے ان لڑکیوں نے تذبذب کا سامنا کیا۔ ہونے والی ملکہ سے کس طرح بات کی جائے؟ کیا اسے YOUR FUTURE MAJESTY کہہ کر مخاطب کیا جائے؟ ایک فرنچ لڑکی نے سوچا۔ کیا اب مجھے فرح کے سامنے CURTSEY کرنا چاہیے؟

سفیر ایران برائے فرانس فرح خانم اور ان کی ماں اور ممانی وغیرہ کو ایسکورٹ کر رہے تھے۔ فرح خانم اپنی سہیلیوں کو دیکھ کر بسرعت ان کے پاس پہنچیں اور آہستہ سے کہا "میں وہی ہوں بدلی نہیں۔"

فرح خانم اور ان کی پارٹی کو پریس کی یلغار سے بچانے کے لیے ایک چور دروازے کے راستے باہر لے جایا گیا۔ اور ان کے ہوٹل کا نام بھی صیغۂ راز میں رہا مگر پریس والوں نے اسے سونگھ نکالا۔ ایک رپورٹر ہوٹل کے ویٹر کا بھیس بدل کر عین اس سویٹ میں جا پہنچا جہاں ایران کی ہونے والی امپرا طریس قیام پذیر تھیں۔ سارا فرانس بے حد اکسائیٹیڈ تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اہل فرانس اہل ایران سے ایک نوع کی تہذیبی و نفسیاتی مناسبت و یگانگت رکھتے ہیں اور بالخصوص اس لیے کہ پیرس کی ایک طالب علم یعنی گویا ایک "ہوم ٹاؤن گرل" نے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔

میری ایران واپسی پر منگنی کی اطلاع باقاعدہ اناؤنس کی گئی۔ مغربی عوامی پریس شاہ کے متعلق حسب معمول فنٹاسٹک خبریں چھاپتا رہا۔ مثلاً یہ کہ شاہ ایک شوقین اور ماہر ہواباز ہیں۔ فرح دیبا کو اپنے طیارے میں بٹھا کر سطح سمندر سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر لے گئے اور وہاں کہا "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔ جب لڑکی نے ہاں کہا انھوں نے خوشی کے مارے طیارے کو چند قلابازیاں کھلائیں اور زمین پر واپس اترے۔

دوسری مقبول کہانی اس نسبت کے بارے میں "سنڈریلا اسٹوری" تھی کس طرح ایک مفلوک الحال اور غریب گھرانے کی لڑکی جو پیرس میں برتن دھو کر کالج کی فیس ادا کرتی تھی اور محنت مزدوری کر کے کچھ پیسہ اپنے کنبے کی گذر اوقات کے لیے ایران بھی بھیجتی تھی معاً پرنس چارمنگ کی اس پر نظر پڑی اور کدو کی بنی ہوئی گاڑی بلوریں کوچ میں تبدیل ہو گئی جس میں سفید گھوڑے جتے تھے۔

سنڈریلا کا جہیز کئی لاکھ پونڈ کی مالیت کا خریدا گیا۔"

میں نے ایمپریس فرح پہلوی سے دریافت کیا: "آپ نے شادی کے فوراً بعد خود کو ایک ملکہ کے رول میں کس طرح ڈھالا؟"

"کہنے لگیں کہ مجھے خیال نہیں آیا کہ آج سے میں ملکہ بن گئی ہوں تو میری ایک دم قلب

ماہیت ہو جانی چاہیے لیکن میں نے رفتہ رفتہ بہت جلد اپنے نئے ماحول سے مطابقت اختیار کر لی۔ دنیا کے قدیم ترین امپریل دربار کے آداب نظروں میں رکھے۔ لوگوں کا انداز رفتار و گفتار۔ ایک ملکہ کو کس طرح وقار سے چلنا چاہیے۔ تیز تیز قدم نہیں اٹھانے چاہئیں۔ کس طرح مسکرانا چاہیے کس طرح نہیں۔ کس طرح مجمع عام میں لوگوں کے خیر مقدم کے جواب میں ہاتھ ہلانا چاہیے۔ کس طرح ملاقاتی سے مصافحہ کرنے کے لیے خود پہلے ہاتھ بڑھانا چاہیے۔ اور ہمیشہ مکمل سکون، وقار اور متانت کی تصویر بنا رہنا چاہیے۔

لیکن ایرانی زندگی بنیادی طور پر اتنی مہذب اور پُر تکلف ہے کہ مجھے یہ سب عادات و آداب اختیار کرنے میں مطلق دقت نہ ہوئی۔"

"ایک بات بتائیے۔ جب ساری دنیا کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی تھیں بالخصوص آپ کا اپنا ملک ولی عہد کی ولادت کا متوقع تھا اور دنیا کے پریس نے آپ کے ہاں ولی عہد کی پیدائش کو ایک قسم کا عالمی مسئلہ بنا دیا تھا اس وقت آپ کو کبھی یہ پریشانی نہیں ہوئی کہ بہ فرض محال خدانخواستہ آپ کے ہاں بھی لڑکا تولد نہ ہوا تو......" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ میں اس قدر مسرور اور پر اعتماد تھی، نوعمر اور صحت مند مجھے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آیا کہ اس سلسلے میں مجھے کوئی مایوسی اٹھانی پڑے گی۔"

1960 عیسوی بہت اہم سال تھا۔ اس برس اعلیٰ حضرت نے انقلاب سپید کا آغاز کیا اور ہمارے ہاں ولی عہد ہمایوں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد میں خود اپنے آپ کو انقلاب سپید کی ایک سپاہی تصور کر کے تجدید و تعمیر نو کے کاموں میں منہمک ہو گئی۔ بہت جلد ایرانی عوام خصوصاً دیہات کے کسان، ہم دونوں کو "آفتاب و مہتاب" اور "پدر و مادر" کہنے لگے۔"

12. تختِ طاؤس

غالباً یہی شاہ کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی۔ دیہات میں شاید اب بھی پرانی وضع کی شاہ

پرستی موجود ہو مگر شاہ نے یہ قطعی نظر انداز کیا کہ شہری مڈل کلاس اور اعلیٰ جنسیاں اس میڈیول تصور کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکے گی۔ "ظلِ سبحانی" اور ایک کرم گستر بادشاہ جو اپنی وفادار رعایا کا خیال رکھتا ہو لیکن باغیوں کو بغیر ٹرائل شدید ترین سزائیں دیتا ہو سولھویں صدی کے تصورات ہیں مگر آپ سوچیے جب ہمارے منسٹر کرسی آسانی سے نہیں چھوڑنا چاہتے تو ایک مطلق العنان بادشاہ تختِ طاؤس کیوں چھوڑنا چاہے گا۔ اور شاہ پر نکتہ چینی اور تنقید پر پابندی ایران میں مدتوں سے موجود ہے۔ راقم الحروف کے ماموں سید غضنفر علی نقوی 1942 سے 1947 عیسوی تک برطانوی ہند کے قونصل خانے واقع طہران میں شاردی افیرز تھے۔ انھوں نے واپس آ کر اس وقت بتایا تھا کہ شاہ کے خلاف کوئی شخص ایک لفظ نہیں کہہ سکتا نہ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں نہ سرکاری معاملات کے سلسلے میں۔

"قصہ مختصر یہ کہ" آفتاب و مہتاب" اور" مادر و پدر" کا جشن تاج گذاری انتہائی تزک و احتشام سے منایا گیا (جس کا تذکرہ آپ کوہ دماوند حصہ اوّل میں پڑھ چکے ہیں) اور اکتوبر 1967 عیسوی میں شہبانوے ایران کاخِ گلستان میں شہنشاہ ایران کے سامنے دوزانو جھکیں اور اعلیٰ حضرت نے ان پر افسرِ شاہی رکھا۔

پیرس کے ایرانی سفارت خانے میں طالب علم فرح خانم کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہز میجسٹی کے سامنے کس انداز سے جھک کر کرٹسی کرنی چاہیے۔ ان کو اس وقت بھی یہ معلوم نہ تھا کہ چند سال بعد کاخِ گلستان کے دربار ہال میں تختِ طاؤس پر بیٹھے ہوئے اعلیٰ حضرت ان کے سر پر ہیروں سے جگمگاتا تاج رکھیں گے اور جب فرنچ جشن FEASTO E KINGS میں فرح دیبا نے کاغذ اور پنی سے بنا نقلی تاج پہنا تھا تب بھی۔ اور اکتوبر 1967 عیسوی میں ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ صرف آٹھ سال بعد اس تختِ طاؤس کے لالے پڑ جائیں گے۔

"آپ نے کبھی ان جلاوطن طلبا کا سامنا کیا جو مغرب میں مقیم اور شہنشاہیت کے خلاف ہیں؟" میں نے ایک روز سوال کیا۔ کہنے لگیں: "جب ہم پچھلی مرتبہ مغربی جرمنی اسٹیٹ وزٹ پر گئے تھے تو ایرانی طلبا نے ہم دونوں کے خلاف خوفناک نعرے بلند کیے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان

کا وطن کتنی ترقی کر رہا ہے اور جن اصلاحات کے وہ خواہاں ہیں نافذ کی جا چکی ہیں۔ رہا میرا تاج تو اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک روایت کا سمبل ہے اور پہننے میں بہت وزنی ہے۔ میں پبلک میں منی اسکرٹ نہیں پہنتی اور نوجوانوں کے مجمع میں سگریٹ نہیں پیتی کہ میری نقل میں وہ بھی تمباکو نوشی شروع کر دیں گے۔"

"آپ نے کبھی ایرانی خواتین کے لیے اس مغربی لباس کی بجائے ایک قومی لباس کے متعلق سوچا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بہت سوچا لیکن ہماری ساری موجودہ دور میں بھی پہنی جا سکتی ہے ہماری روایتی پوشاکیں اس قدر بھاری اور متنوع ہیں کہ ان کو دور حاضرہ میں پہن کر روزمرہ کے کام انجام نہیں دیے جا سکتے مگر میں نے ان قومی پوشاکوں کے بہت سے موتیف لے کر نئے ڈریس ڈیزائن کیے ہیں اور روایتی موتیف کی ہینڈلوم کپڑوں کو فروغ دینے کی کوشش میں مصروف ہوں۔"

"قومی رقص؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے قومی رقص روس کے لوک ناچوں سے اس قدر مشابہ ہیں کہ اگر ہم ان کو فروغ دیں تو بالکل معلوم ہوگا کہ روسی لوگ ناچ رہے ہیں۔ پھر بھی ان کی ترویج کی جا رہی ہے اور قومی موسیقی کی بھی۔"

"آپ کی تعریف و توصیف میں ایرانی پریس میں اتنے مضامین چھپتے ہیں ان کو پڑھ کر آپ کا کیا ردِعمل ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر آپ ایک انسان کو ایک سو تمغے عنایت کر دیں تو اس شخص کے دل میں ان تمغوں کی کوئی وقعت نہیں رہے گی۔ مجھے قصیدہ خوانی پسند نہیں اور میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ اگر میں نے اپنی قوم کے لیے کچھ نہ کیا ہوتا تب میری اس طرح قصیدہ خوانی کی جاتی کیونکہ میں ملکہ ہوں اور مبالغہ آمیز ثنا خوانی مشرق کی روایت ہے۔"

13. ایرانِ نو کی نئی خانم

''ایران میں عورتوں کی تحریکِ آزادی ستر اسی سال پرانی ہے سوا سو سال قبل طاہرہ زریں تاج کو ملاؤں نے شہید کیا تھا (گو طاہرہ کا بالکل تذکرہ نہیں کیا جاتا)۔

ڈاکٹر مہر انگیز دولت شاہی ممبر پارلیمنٹ، ہائیڈلبرگ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کا مکان بولیوار الیزبتھ پر ہے جس روز میں ان سے ملنے گئی۔ وہ ایک دن قبل کسی زنانہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کر کے یورپ سے لوٹی تھیں۔

کیہان، اطلاعات اور زنانہ رسالوں کے عالی شان دفاتر میں جو پرانے فائل میں نے دیکھے تھے، ان سے اندازہ ہوا کہ ایرانی عورتوں کی یہ ترقی واقعی حیرت انگیز ہے۔ خود ہمارے ہاں ہندستان میں اور ترکی، مصر، شام وغیرہ میں عورتوں کی جدو جہد متوازی خطوط پر ہوئی ہے یعنی سب سے پہلے اوپری طبقہ کے چند روشن خیال بزرگوں نے اپنی لڑکیوں کو پردے کے اندر مغربی تعلیم دلوائی۔ اس سے قبل مشنریوں نے اسکول قائم کیے اور نئی تعلیم یافتہ خواتین کو ایک ہی قسم کا محاربہ قدامت پرست طبقے اور ملاؤں سے کرنا پڑا۔

امریکن مشنریوں نے طہران میں 1838 عیسوی میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولا تھا۔ اس میں زیادہ تر عیسائی لڑکیاں داخل ہوئیں کیونکہ ملاؤں نے فتوے دے دیا تھا کہ مغربی تعلیم حاصل کرنا شیطانی فعل ہے لیکن اواخر انیسویں صدی میں چند لبرل امرا نے اپنی لڑکیوں کو گھر پر فرانسیسی تعلیم دلوائی پھر ان لڑکیوں نے پرائیویٹ مدرسے قائم کیے۔ 1905 عیسوی کے دستوری حقوق کی جدو جہد کے زمانے میں نئے ادیبوں اور شاعروں نے تعلیم نسواں کے متعلق مضامین لکھنے شروع کیے۔ بالکل اسی زمانے میں ہمارے ہاں علی گڑھ میں مدرسۂ نسواں کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ متعدد ایرانی وطن پرستوں نے اسی دور کے ''نوجوان ترکوں'' کے مانند یورپ کی جلاوطنی میں وہاں سے ترقی پسند رسالے شائع کیے۔ ایران میں اس قسم کے مضامین لکھنے والوں کو جیل بھیج دیا گیا لیکن خود پردہ نشین عورتوں نے قومی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ 1906

عیسوی میں انھوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے نیشنل بنک قائم کرنے کے پروجیکٹ کی مدد کی۔ تبریز کی خواتین نے مظفر الدین شاہ قاچار کی رجعت پسند افواج کا مقابلہ کرنے میں اپنے مردوں کی اعانت کی۔ فوجی محاصرے کی وجہ سے قحط پڑ گیا۔ اس وقت زنانِ تبریز نے جنگلوں اور کھیتوں میں جا کر خودرو سبزیوں اور جڑی بوٹیوں سے اپنے بچوں کا پیٹ بھرا اور لڑائی میں مردوں کی ہمت افزائی کی۔ انقلاب 1908 عیسوی کے دوران عورتیں اپنی چادروں میں پستول چھپا لیتی تھیں۔ بنک آف ایران کو تیس کروڑ تومان کی حاجت ہوئی، ایرانی عورتوں نے زیور فروخت کر ڈالے۔ ایک غریب دھوبن مجلس (پارلیمنٹ) صرف ایک تومان لے کر بنک کو چندہ دینے پہنچی تھی۔

1907 عیسوی میں خانم طوبیٰ آزمودہ (جو فرانسیسی تعلیم حاصل کر چکی تھیں۔ اور یوسف خان موبد الملک نے طہران میں گرلز اسکول قائم کیے۔ یوسف خان فرانسیسی نژاد تھے۔ ان کے والد کو ناصر الدین شاہ قاچار نے مدرسہ الفنون میں پڑھانے کے لیے پیرس سے بلوایا تھا۔ یہاں انھوں نے ایک ایرانی خانم سے شادی کی۔ یوسف خان ان کی اولاد تھے۔ ان کے قائم کردہ اسکول رازی میں جو ایران کے بہترین مدارس میں شمار کیا جاتا ہے، ماموزیل فرح دیبا نے پڑھا۔

1908 عیسوی میں ایک ایرانی مسلمان لڑکی بہ غرض اعلیٰ تعلیم امریکہ گئی۔

1911 عیسوی میں ایرانی عورتوں نے پارلیمنٹ کے سامنے روسی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف پُر زور مظاہرے کیے۔ برقعہ پوش خانموں نے اس موقع پر بہارستان اسکوائر میں زوردار تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں۔ ان کی بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ ان کی جوشیلی مقرروں میں خود طہران کے چیف آف پولیس کی بیوی شامل تھیں۔ ملاؤں کے خوف سے خواتین ایک دوسرے کے گھروں پر جمع ہو کر جدوجہد حقوق کے لیے خفیہ میٹنگیں کرتی تھیں۔ روسی شکر کی امپورٹ کے خلاف انھوں نے مظاہرے کیے۔ طہران ٹراموے ایک بلجیین کمپنی کی ملکیت تھی۔ اس بیرونی اجارہ داری کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا۔ وہ ٹراموے کے مسافروں کو روک روک کر کہتیں "ہم سے گھوڑا گاڑی کا کرایہ لے لو مگر ٹرام کمپنی کو استعمال نہ کرو۔"

خانم ستورہ افشاری ایک آذر بائیجانی امریکی بیٹی تھیں۔ وہ طفلس (جارجیا) اور استانبول میں رہ چکی تھیں اور روسی، فرنچ اور ترکی کی ماہر تھیں۔ انھوں نے ایک زنانہ انجمن قائم کی۔ 1914 عیسوی میں انتقال ہوا۔ خانم صدیقہ اصفہانی علمائے اصفہان کے ایک خاندان کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے 1917 عیسوی میں لڑکیوں کا مدرسہ اصفہان میں قائم کیا اور ایک اخبار جاری کیا جسے وہ خود ایڈٹ کرتی تھیں۔ 1922 عیسوی میں انھوں نے فرانس جا کر پڑھا۔ رضا شاہ کبیر نے 1937 عیسوی میں گرلز کالج قائم کیا۔ اس میں نامور شاعرہ پروین اعتصامی نے پڑھایا۔ جواں مرگ پروین نے 1941 عیسوی میں انتقال کیا۔

رضا شاہ کبیر نے عورتوں کی دنیا ہی بدل دی۔ پردے کو 7 جنوری 1936 عیسوی کے شاہی فرمان کے ذریعے قانوناً ختم کیا اور مغربی لباس پہننے کا حکم دیا۔ 1959 عیسوی میں شاہ دخت اشرف پہلوی نے خواتین کی انجمنوں کی کونسل قائم کی۔ شاہ ایران نے 1962 عیسوی میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق عطا کیا۔

ہندستان کی دیہاتی مسلمان عورتوں کی طرح دیہی ایران کی عورتوں نے بھی کبھی پردہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر مہرانگیز دولت شاہی جو خواتین کی عالمی کونسل (ہیڈکوارٹر پیرس) کی نائب صدر رہیں، سے میں نے پوچھا "آپ لوگ فراک پہن کر نماز کس طرح پڑھتی ہیں؟" انھوں نے فوراً اپنی ایک عزیزہ کو بلایا جو فراک میں ملبوس تھی۔ وہ اپنی چادر اور جائے نماز لے کر آئی۔ جائے نماز بچھا کر چادر اوڑھ کر اس نے مجھے بتایا کہ ایسے۔

قصہ مختصر جس طرح ہندستان میں جدید قوم پرستی، مشنریوں کے اثر اور انگریزی حکومت کی وجہ سے عورتوں نے جدید تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اسی طرح ایران میں جدید قوم پرستی، مشنری اور فرانسیسی تہذیبی اثر سے تعلیم نسواں کا چرچا ہوا۔ ہندستان ایک غلام کولونیل ملک تھا۔ ایران اپنی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ میں کبھی غلام نہیں رہا۔ لہٰذا وہاں ایک بار مجھے شاہ بانو فرح پہلوی نے بتایا کہ جب وہ پیرس میں زیر تعلیم تھیں وقتاً فوقتاً افریقی اور ایشیائی طلبا کالج میں اپنے اپنے یوم

آزادی کی تقریبات منعقد کرتے رہتے تھے۔ فرح خانم سے ایک مرتبہ ان کے فرنچ ساتھیوں نے پوچھا تم ایرانی اپنا یوم آزادی کس مہینے میں مناتے ہو؟ میں نے کہا ہم کبھی غلام ہی نہیں رہے۔"

14. دفتر مخصوص علیا حضرت

طہران کے سرکاری دفاتر دولت اور ایرانی خوش ذوقی کی بدولت محلات کی طرح آراستہ ہیں۔ طویل و عریض بیش قیمت قالین، جھاڑ فانوس، فرانسیسی فرنیچر، بزنجشی کے بیورو کے دفاتر بھی اسی وضع کے تھے۔ پہلوی فاؤنڈیشن اور سرکاری امداد سے چلنے والے یہ ادارے جن کے بجٹ کئی لاکھ ڈالر سالانہ ہیں، مغرب میں تربیت یافتہ ایرانی خواتین چلا رہی تھیں۔ ایک محل جس میں پہلے ولی عہد رہتے تھے: فرح پہلوی سوسائٹی کا مرکزی دفتر تھا۔ اس کے باغ میں سیب سے لدے درخت استادہ تھے۔ کمرے تازہ پھولوں سے معطر و مفرح۔ یہ سوسائٹی سارے ایران میں پچاس یتیم خانے چلاتی تھی جس میں پندرہ طہران میں تھے اور یتیم خانے کی بجائے ہوسٹل کہلاتے تھے۔ ماڈرن تصاویر اور قالینوں سے آراستہ ایک زنانہ یتیم خانہ ایک پارک میں بنی خوب صورت کاٹجوں پر مشتمل تھا۔ باغ میں لڑکیوں نے شمالی ایرانی گاؤں کی وضع کے گھر تعمیر کیے تھے۔ یتیم بچے تعطیلات میں کیسپین کے کنارے ہولی ڈے کیمپس میں بھیجے جاتے تھے۔ نیاوران میں یتیموں کا ہولی ڈے ہوم ایک بے حد شاندار موڈرن طرز تعمیر کی عمارت میں واقع تھا جس کی شاہ بانو نے خود ڈیزائن کی تھی۔ ڈائرکٹر کے دفتر میں میز پر ایک نقرئی فریم میں دونوں طرف دو بزرگوں کی تصاویر۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہیں" فرمایا "رسول کریمؐ اور علیؑ"۔ ایران میں یہ تصاویر اس قدر دیکھ چکنے کے باوجود میں نے پھر تعجب سے پوچھا "آپ ان کی تصاویر کیوں بناتے ہیں؟"

انھوں نے میرے سوال پر حیرت کا اظہار کیا۔ پوچھا "کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟"

بچوں کے کتب خانے میں ہزار ہا کتابیں جدید ایرانی فن کاروں کی مصور کی ہوئی رکھی تھیں۔ شہبانو نے بھی ایک کتاب مصور کی تھی۔ وہ انھوں نے مجھے اپنے دستخط کر کے دی۔ وہ

ہینس کرسچین اینڈرسن کی جل پری کا فارسی ترجمہ تھا۔ برف پوش کوہستانی علاقوں کے لیے گشتی کتب خانے قائم کیے گئے۔ ورکنگ کلاس محلوں میں نرسری اسکول وغیرہ۔ اکثر فلاحی ادارے فرح پہلوی کی سہیلیاں چلا رہی تھیں۔ ان میں خانم لیلےٰ امیر طہماسپ نے پیرس میں سوشل ورک کی تربیت حاصل کی تھی۔ ہما زرابی اور پروین خلعت باری ہارڈنگ کالجوں کی سربراہ تھیں۔ پیرس والی سہیلیاں مہری کبوجیہ اور لڑا الوتیال ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد ایک یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں۔ ایک شام انھوں نے اپنی چند سہیلیوں کو مجھ سے ملوانے کے لیے کاخ نیاوران میں بلوایا۔ جس وقت میں پہنچی، شہبانو وہاں موجود نہیں تھیں۔ ایک سہیلی نے مجھ سے کہا ابھی ابھی علیا حضرت کا فون آیا ہے، وہ معذرت خواہ ہیں کہ بروقت نہیں آسکیں۔ ولی عہد کی ایک تقریب میں خلاف توقع ذرا دیر لگ گئی، ابھی آدھ گھنٹے میں آجائیں گی۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ان کا ہیلی کوپٹر کاخ نیاوران کے باغ میں پہنچا۔ ہمارے ہاں سیاسی وی آئی پی تو خیر فلم اسٹار تک گھنٹہ لیٹ پہنچنا باعث فخر جانتے ہیں، معذرت خواہی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس وقت طہران کی ہزار ہا آفس گرلز، ماڈلز، ویٹرسیں، استانیاں، پولیس افسر، فوجی لڑکیاں، جرنلسٹ، فن کار، بیلے ڈانسر، مصور، سیاست داں، ٹیلی ویژن والی لڑکیاں، اراکین پارلیمنٹ یہ تصور نہیں کرسکتیں کہ ان کی نانیاں دادیاں کیسی قید و بند میں زندگیاں گزار گئیں۔ شادی کے موقع پر دلہن مغربی سفید لباس اور باریک سفید ویل پہنتی ہے مگر روایتی ایرانی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ قدیم و جدید کا سنگم ہر جگہ نظر آتا ہے۔ طہران کے زورخانوں میں (جن کے پیٹرن سینٹ حضرت علیؓ ہیں) قدیم سیستانی پہلوانوں کے نام لیوا زورآور دنگل لڑتے ہیں۔ امجدیہ اسٹیڈیم میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے پہلے وہ قدیم دستور کے مطابق شاہی بالکنی کے سامنے سربسجود ہوئے اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے۔ ان کو دیکھ کر مجھے جاپانی پہلوان یاد آگئے اور کابوکی تھیٹر کے اداکار جو اسی طرح اپنے تماشائیوں کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

شاہ بانو کا اپنا سکریٹریٹ تھا اور سارا کام باقاعدہ ایک وزارت کے پیمانے پر ہوتا تھا

لیکن ان کو اپنے اس رول کے متعلق کوئی خوش فہمی اور خود فریبی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا ہزاروں ذاتی خط جو میرے نام آتے ہیں ان کے متعلق میرا رویہ حقیقت پسندانہ ہے۔ غربت اور دکھ بھی امداد یا خیرات کے ذریعے دور نہیں کیے جا سکتے۔ غربت اسی وقت ختم ہوگی جب سارے ملک کا معیارِ زندگی بلند ہوگا۔"

سڑک چلتے لوگ شہبانو کو روک کر ان سے مدد کی درخواست کرتے تھے۔ ایک روز ٹہلنے جا رہی تھیں ایک عورت نے راستہ روک کر کہا مالک مکان اسے نکال رہا ہے۔ ہز مجسٹی نے دوسرے روز اسے دوسرا مکان دلوا دیا۔ کار پر کہیں جا رہی تھیں ایک بچے کو دیکھا جبڑے پر پٹی باندھے بھاری بالٹی اٹھائے جا رہا ہے۔ کار روک کر اس سے پوچھا۔ اس نے بتایا باپ بے کار ہے بہن بیمار اور خود مزدوری کر کے کنبے کا پیٹ پالتا ہے چونکہ اس کے باپ کے لیے فوری ملازمت تلاش نہ کی جا سکی۔ شہبانو نے اسے کاخ نیاوران کے باغات میں جھاڑو دینے کے کام پر لگا دیا۔ لڑکے کو اسکول میں داخل کیا۔ بہن کو ہسپتال میں بھیجا۔ وہی BENEYOLENT مخیر ملکہ کا رول۔

"وہ پہاڑی بڑھیا والا قصہ کیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

شہبانو نے ذرا جھینپ کر کہا: "وہ دراصل قصہ یہ تھا کہ ہم لوگ دریائے ماژندران کے ساحل پر گئے ہوئے تھے۔ نوروز کی چھٹیاں تھیں۔ ایک سہ پہر میرے بچے شہسواری کے لیے نکلے اور دیر تک واپس نہ آئے تو میں نے گھبرا کر جیپ نکالی اور ان کی تلاش میں پہاڑ کی طرف چلی گئی۔ سیکورٹی افسر فوراً دوسری جیپ پر میرے پیچھے پیچھے آئے۔ میں ایک سنسان پہاڑی سڑک پر ڈرائیو کرتی جا رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا ایک دیہاتی عورت سر پر اسکارف باندھے بھاری فل بوٹ پہنے وزنی بنڈل اٹھائے ہانپتی کانپتی چڑھائی طے کر رہی ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر لفٹ مانگی۔ میں نے گاڑی روک کر فوراً اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اس دور افتادہ پہاڑی علاقے میں نہ ٹیلی ویژن تھا نہ اخبار پہنچتا تھا۔ اس نے شاید میری تصویر بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہر حال وہ مجھے نہیں پہچان سکی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں واپس جا رہی ہے۔ اپنی لڑکی کے لیے کپڑا

خریدنے قریب کے مارکیٹ ٹاؤن گئی تھی۔"

"کیا تمھاری لڑکی کی شادی ہو رہی ہے"؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں خانم! میری لڑکی اسکول جاتی ہے میں اس کے لیے گرل گائیڈ یونیفارم کا کپڑا خریدنے گئی تھی۔"

"اس بات کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ یہ غریب پہاڑی عورت بھی اپنی لڑکی کو اسکول بھیج رہی تھی۔ وہ لڑکی گرل گائیڈ بن چکی تھی اور اس غریب عورت نے پیسہ اس لیے بچایا تھا کہ اس کے لیے یونیفارم خرید سکے۔ ایران واقعی ترقی کر رہا ہے۔"

پھر اس عورت نے مجھ سے پوچھا۔

"خانم آپ کون ہیں؟"

"میں......علیا حضرت"۔

"عورت نے آنکھیں جھپکائیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔"

میں نے کہا" شاہبانو۔ وہ تب بھی نہ سمجھی۔ یہ درباری القاب اس پس ماندہ کوہستان میں کسی نے نہیں سُنے تھے۔ وہاں کے لوگ ملکہ کو خاصے جمہوری انداز میں "زن شاہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔" چنانچہ میں نے کہا:

"زن شاہ ہستم۔"

"عورت ہکا بکا رہ گئی ہوگی؟" میں نے شہبانو سے کہا:

اس کے بعد اس کی قسمت بدل گئی۔ اس کے شوہر کو طہران میں بہتر ملازمت دی گئی۔ لڑکی کو وظیفہ دے کر طہران بلایا گیا۔

"ہمارے ہاں ایک فارسی کہاوت ہے" شہبانو نے مجھ سے کہا: "نیکی کر اور دجلہ میں ڈال"۔ لیکن نیکی کے علاوہ عموعی آل راؤنڈ ترقی لازمی ہے اور میں امام علیؑ کے زریں اقوال ہمیشہ اپنے ڈیسک پر اپنے سامنے رکھتی ہوں۔

سڑک پر عطا دینے کے لیے لوگ جب میری طرف دوڑتے ہیں تو سادہ کپڑے سیکورٹی

افسروں کو ان کے ساتھ ساتھ بھاگنا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو مجھے پسند نہیں۔ میں ٹیلی ویژن پر لوگوں سے کہتی ہوں کہ میں آپ کے خط پڑھ کر جو کچھ ممکن ہے کر رہی ہوں لیکن یہ خطوط کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شاہ کو بھی بہت خطوط ملتے ہیں۔''

شاہ بانو کے نام خطوں کا یہ سلسلہ ساری دنیا سے آئے پھر جب اطلاع ہوئی کہ ان کے ہاں ولادت ہونے والی ہے۔ بہت سے ایرانیوں نے ان کو تعویذ دعائیں لکھ کر بھیجیں کہ لڑکا پیدا ہو۔ فرانس سے ایک اجنبی خاتون نے اپنے خاندان کا ایک بیش قیمت ورثہ ایک سنہری جالی روانہ کی جس میں ان کے ہاں نسلاً بعد نسلاً نومولود بچے کا پنگوڑہ ڈھانپا جاتا تھا۔ ایک اور اجنبی فرانسیسی نے فرانس سے ایک انتہائی مقدس مذہبی تحفہ جو کوئی بھی خوش عقیدہ رومن کیتھولک اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرے گا اٹھا کر فرح پہلوی کو اس دعا کے ساتھ ارسال کیا کہ وہ ایک فرزند کی ماں بنیں۔ یہ مقدس تحفہ ایک لبادے کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا جسے کسی زمانے میں ایک مشہور کیتھولک سینٹ نے پہنا تھا۔ مختلف ملکوں سے مختلف مذاہب کے لوگوں نے علم نجوم وغیرہ سے اخذ کی ہوئی خوش خبری روانہ کی کہ ان کے ہاں بیٹا ہی پیدا ہوگا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں اتنے نرم دل اور مہربان لوگ اتنی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔'' شہبانو نے مجھ سے کہا۔

شہریار وقت کی خدمت میں اپنے مسائل کے متعلق عرضیاں بھیجنا پرانی ایرانی رسم ہے لیکن فرح پہلوی کے نام خطوط کے بندوبست کے لیے ایک پورا محکمہ قائم ہے۔ اس کے ڈائرکٹر کے پاس سوربون پیرس کا ڈاکٹریٹ ہے۔ ''ترقی پذیر ممالک میں عوام پر اخبارات کا اثر'' ان کے مقالے کا موضوع تھا جس پر ان کو ڈاکٹریٹ ملا۔ ان کے تحت ماہرین نفسیات اور سوشل ورکرز کی ایک ٹیم کام کرتی ہے۔ جب میں یہ دفتر دیکھنے گئی اس میں ہر مہینے سات ہزار خطوط موصول ہوتے تھے یعنی ہر تین منٹ کے بعد ایک خط۔

نوجوان کم مایہ لڑکیاں نئے جوتے یا نئے فراک کی فرمائش کرتی ہیں۔ ''جس طرح کا آپ اس روز فلاں تقریب میں پہنے ہوئے تھیں۔'' اس طرح کے جوتے اور ڈریس بھیج دیے جاتے ہیں۔ یہ اس قسم کی عنایات تھیں جیسے ہمارے ہاں کے ''غریب پرور'' راجہ نواب اپنی رعایا

کے ساتھ بعض اوقات اچھا سلوک کرتے ہیں۔ 1970 عیسوی ہی میں بغاوت کا ایک منظر میں نے دیکھا۔

طہران میں بچوں کی فلموں کا فیسٹیول ہو رہا تھا۔ سینما ہال کے سامنے جم غفیر جمع تھا۔ میں آقائے مسود بارزین اور خانم مہین بارزین کے ساتھ نیچے بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی۔ شہبانو جیوری کے افراد اور بیرونی فلم ڈائرکٹرز کے ساتھ بالکنی میں بیٹھی تھیں جب ہم لوگ پروگرام کے خاتمے پر باہر نکلے اور شہبانو اپنی کار میں سوار ہوئیں یک لخت ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ چمڑے کے فراک میں ملبوس ایک حسین ایرانی لڑکی نے شہبانو کی چلتی کار کے آگے آ کر گرنے کی کوشش کی۔ وہ ہسٹریائی آواز میں چلا رہی تھی۔ سیکورٹی افسروں نے اسے سنبھالا اور اس کا خط علیا حضرت کو پیش کیا۔ خط میں لکھا تھا کہ وہ خود اور اس کا شوہر بے روزگار بیلے ڈانسر ہیں۔ لکھا تھا میں یہ خط آپ کو دوں گی اور اس کے بعد آپ کی کار کے سامنے لیٹنے کی کوشش کر کے ہنگامہ کھڑا کروں گی تاکہ آپ میرے کیس پر فوری توجہ دیں اور میرے شوہر کو ملازمت دلوائیں۔ مہربانی سے میرے شوہر کی امداد کیجیے۔

بعد میں اس لڑکی نے پریس کو بیان دیا کہ ایسے موقع پر جب ہزامپریل میجسٹی وی آئی پی لوگوں، بیرونی فلم اسٹاروں اور ڈائرکٹروں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھیں میں ہسٹریکل شور و غوغا کر کے ہی ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکتی تھی۔

بیلے ڈانسر کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس ہنگامے کی وجہ سے وہ راتوں رات مشہور ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی کو ایک بیلے کمپنی میں کام بھی مل گیا۔

ہزمیجسٹی کے بیورو میں کام کرنے والی ایک یہودی ایرانی بے حد حسین لڑکی ایک روز بڑے اصرار سے مجھے اپنے گھر لے گئی جو شہر کے ایک متمول محلے میں زمین دوز فلیٹ تھا۔ ہال میں حسب معمول میز پر پھول اور ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے لیے پستے بادام سے پُر قاب رکھے تھے۔ دیوار پر حضرت موسیٰ کی بڑی تصویر، آتش دان پر اس لڑکی کے بھائی بھاوج کا رنگین فوٹوگراف جو اسرائیل میں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ لڑکی کی اماں صرف فارسی بولتی تھیں۔ کہا۔ ہم لوگ یہاں شاہ خورس (یعنی سائرس) کے وقت سے آباد ہیں پھر حضرت موسیٰ کا تذکرہ کرنے

لگیں۔ تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولیں "مرد کامل بود"۔

وہ مرد کامل واقعی ایک عجیب و غریب اَست اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ ایران کی قالینوں کی تجارت اور بہت سا کاروبار ایرانی یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔

ایران اسرائیل کو تیل بھی سپلائی کر رہا تھا اور اس چیز کا تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا تھا اور آقائے مسعود بارزین اور ڈاکٹر کمال پاشا بہادری سے جب بھی میں نے کوئی سیاسی سوال کیا یا کوئی بھی سیاسی موضوع چھیڑا وہ نہایت خوب صورتی سے گفتگو کا موضوع بدل دیتے تھے۔

طہران سے باہر نئی آریہ مہر یونیورسٹی کے کیمپس پر تیز دھوپ میں جگمگاتے کارچوبی سیاہ گاؤن پہنے جواں سال خوش شکل خواتین اور مرد اساتذہ کی قطار۔ ملک کی نئی دولت کا اندازہ ان پروفیسروں اور لیکچراروں کے بڑھیا چوغوں ہی سے ہو رہا تھا۔ نئی نویلی یونیورسٹی نئے نویلے چوغے ہز میجسٹی کانوکیشن کے لیے آئے۔ بعد تقسیم اسناد نئے ڈینٹل کالج کے افتتاح کے لیے گئے۔ یونیورسٹی کی طرح جس کا سارا ساز و سامان اعلےٰ اور جدید ترین تھا۔ ایک ترک جرنلسٹ لڑکی مع اپنے فوٹوگرافر میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تمہارے ہاں اتنی بڑی یونیورسٹی قائم ہو گئی ہے۔" اس نے متانت سے جواب دیا: "ہماری یونیورسٹی آف مڈل ایسٹ مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی درس گاہ ہے جس میں ایک لاکھ طالب علم پڑھتے ہیں۔"

آریہ مہر کے کیمپس میں ہر جگہ فارسی میں قطعات اور بورڈ لگے تھے۔ ترک لڑکی کہنے لگی میں جب بھی طہران آتی ہوں مجھے بڑا عجیب سا احساس ہوتا ہے، ایک لفظ نہیں پڑھ پاتی، جاہلوں کی طرح گھومتی ہوں۔

اتاترک نے لاطینی رسم الخط اختیار کر کے یورپ سے حرفی رشتہ جوڑا لیکن ترک بہ لحاظ حرف شناسی مشرقِ اوسط سے بالکل کٹ گئے۔

دوسری شام "نئے ہاؤس آف آرٹسٹس" میں جو اداکاروں اور پرفورمنگ فن کاروں کا محل نما کلب ہے، شہبانو تشریف لائیں۔ سارے مشہور فلم اسٹار لوگ ایک قطار میں کھڑے ہوئے۔ اندر سیلوں میں نامور مغنیہ گوگوش نے پیانو پر ایک تہنیتی نغمہ سنایا۔ دھن مغربی، الفاظ فارسی۔ ترک

لڑکی ایک ستون کے پیچھے کھڑی اپنے فوٹوگرافر سے تصویریں کھنچوا رہی تھی۔

ترکی کے خیال سے میں بہت مغموم ہوتی ہوں، بہت غریب ملک ہے، کاش وہاں بھی تیل نکل آئے۔ ترکی پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔ ایک چھوٹا سا نادار ملک۔ اللہ میاں وہاں بھی تیل نکال دیجیے نا پلیز۔

ترک لڑکی ہاؤس آف آرٹسٹس کا فارسی پروگرام دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگی "یہ کیا لکھا ہے؟" پھر اس نے کہا "میں بہت دنوں سے علیا حضرت سے انٹرویو حاصل کرنے کی کوشش میں لگی ہوں لیکن معلوم ہوا ان دنوں وہ بہت مصروف ہیں۔"

اگلی صبح وہ انقرہ واپس جا رہی تھی۔ جب میں ہلٹن پہنچی، کاؤنٹر پر تحفے کا پیکٹ رکھا ملا۔ نفیس سبک ترکی زردوزی کے ہلکے سلیپر۔ اس لڑکی سے میں دوبارہ کہاں ملوں گی؟ اس کا نام اور پتہ تک معلوم نہ تھا لیکن میرا ہمیشہ کا تجربہ ہے کہ شرقِ اوسط میں ترکوں سے زیادہ محبت شعار، نرم مزاج اور دل سے ملنے والی قوم اور کوئی نہیں ہے اسی قوم کو ساری دنیا ہمیشہ سے خوں خوار اور خون ریز سمجھتی آئی ہے۔

راقم الحروف کی بھابھی کی بہن صادقہ بیگم کئی برس سے طہران میں مقیم تھیں جہاں ان کے شوہر مصطفیٰ جعفری "ایران پاکستان، ترکی ریجنل ڈیولپمنٹ کارپوریشن" کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ صادقہ کے مکان کا پتہ بھی نہایت شاعرانہ تھا۔ کوچہ آبشار، خیابانِ سیکدہ، بولیوار ایلز بتھ۔ افراطِ زر کی وجہ سے بے حد مہنگا مکان جدید ایرانی طرز کا تھا۔ سامنے ہال میں صرف ایک گول میز، اس پر گل دان میں تازہ پھول، پائیں باغ میں حوض، ڈرائنگ روم میں فرانسیسی فرنیچر۔

ایک شام میں صادقہ کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات کے آقائے رشید یاسمی مجھ سے ملنے وہیں آ گئے۔ تسبیح ہزار دانہ پھیرتے رومی کا تذکرہ کرنے لگے۔ وہ رومی و حافظ کے معتقد نہیں تھے۔ کھانے کا وقت آ گیا اٹھنے لگے۔ صادقہ نے کہا کھانا کھا کر جائیے، مان گئے۔

ان کے جانے کے بعد مصطفےٰ جعفری نے کہا: "میں شرط لگاتا ہوں یہ ایرانی نہیں تھے

آذری ترک تھے۔ ایرانی اس قدر تکلف کرتا ہے کہ اسے گڑھا کھود کر گاڑ دو مگر اسے پہلے سے مدعو نہیں کیا گیا ہے، وہ کسی کے ہاں اس طرح بے تکلفی سے کھانا کھانے کو راضی نہ ہوگا۔ صریحاً یہ صاحب ترک تھے۔''

''گویا ایرانی یہاں کے لکھنوی ہیں اور ترک پنجابی۔'' میں نے کہا۔

''کچھ یہی حساب ہے'' مصطفیٰ جعفری بولے۔ ''ارے صاحب یہاں اخلاق و تکلفات کا یہ عالم ہے کہ چور کو آقائے دُزد کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو قدر ہیرے جواہرات کی ہے اسی مالیت کے یہاں قالین ہیں۔ لہٰذا قالینوں کا ایک سے ایک ماہر چور پڑا ہے۔ ایک بار اس محلے میں ایک مکان پر چور ایک قالین دھونے کی فرضی کمپنی کا ٹرک لے کر آئے اور قالین لے کر چلتے بنے۔ پکڑے گئے۔ تھانے میں پولیس افسر نے پوچھا: آقائے دُزد آپ نے فلاں جگہ سے قالین چرانے کی زحمت کس روز گوارا فرمائی تھی؟''

''یہ گپ ہے!'' میں نے کہا۔

''آپ کو یقین نہ آئے تو یہاں کچھ عرصہ رہ کر دیکھ لیجیے۔'' صادقہ بولی۔

''میں نے یہاں کا طبقہ امرا بہت دیکھ لیا اب ذرا عوام کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ آپ کو یہاں امام زادوں کے مزاروں پر ملے گا۔'' مصطفیٰ جعفری بولے۔

''یہاں بھی زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے؟'' میں نے پوچھا۔

15. امام زادوں کی دُنیا

روضۂ شاہ عبدالعظیم جو غالباً برادر امام رضاؑ ہیں۔ ایران کے روضے قابل دید ہیں، سونے کے گنبد، اندر نہایت بیش قیمت سامان آرائش، متوسط الحال اور غریب لوگوں کا ہجوم روضہ شاہ عبدالعظیم کے نزدیک ایک جدید وضع کا عالی شان سنگلاخ مقبرہ رضا شاہ کبیر کا استادہ ہے جس کے

جسدِ خاکی کو جو ہمبز برگ جنوبی افریقہ سے لا کر یہاں دوبارہ دفن کیا گیا تھا۔ مقبرہ اندر سے بالکل سادہ اور مرعوب کن ہے۔ اوپر ایک دیوار پر صرف ایک کاشانی قالین آویزاں ہے جس میں بنے ہوئے ایک بزرگ ہاتھ میں قرآن شریف لیے آسمان کو دیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوا رسول اللہؐ ہیں۔

طہران کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر قدیم شہر رے روضہ امام زادہ عبداللہؒ ایک سحر انگیز جگہ ہے۔ روضے کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے اور صادقہ کو پاکستانی زائرین سمجھ کر معلم نے انتہائی خوش الحانی سے زیارت پڑھوانی شروع کی۔ نقرئی ضریح کے اندر مرمریں مزار، انتہائی پُرسکون راحت بخش جگہ، قالین، جھاڑ فانوس، مرمریں ایوان۔ ایک ایوان میں ایک خانم کونے میں بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ روضہ امام زادہ عبداللہ پر بھیڑ نہیں ہوتی اور اپنے سکون اور طمانیت بخش خاموشی کے لیے مشہور ہے۔ باہر قبرستان میں سطحِ زمین کے برابر سنگ ہائے مزار پر مختلف صدیوں اور برسوں کی تاریخیں اور نام کندہ ہیں۔ ان ہی میں ایک قبر شاہ بانو کے والد کیپٹن سہراب دیبا کی ہے۔ اس نہایت بارونق اور بشاش سے گورستان میں چاروں طرف سرو کے درخت کھڑے ہیں۔

روضہ ایک گلی کے ذریعے شاہراہ سے ملحق ہے۔ چوڑی گلی میں دونوں طرف انڈر ٹیکرز اور کتبہ سازوں کی دوکانیں ہیں۔ چکیلی شوونڈوز کے اندر اونچے سنگی گل دان اور گل دستے، بوڑھی عورتیں موم بتیاں اور اگر بتیاں بیچ رہی ہیں اور آگے جا کر لوگوں کے خاندانی مرقدوں کی بارہ دریاں اور گوشکیں۔ سارا ماحول کچھ تر کی، کچھ یورپین سا ہے۔ اندر حوض میں فوارے چل رہے ہیں اور چند بوڑھے مرمریں کناروں پر بیٹھے تسبیح پھیرنے میں منہمک ہیں۔ گلی سے باہر نکلتے ہی زندوں کی دنیا میں واپس شاہراہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ شور شغب، ٹریفک، ہجوم، موٹروں اور بسوں کی ریل پیل۔

قم (جسے اہلِ ایران غوم کہتے ہیں غ سے) صادقہ نے کہا وہاں جانے کے لیے برقعہ کی ضرورت ہے ورنہ کم از کم موزے پہننے لازمی ہیں۔ قم مشہد کے بعد ایران کا دوسرا بڑا دینی مرکز ہے اور قدامت پسند علما کی آماجگاہ۔ ہم لوگوں نے جا کر بازار سے موزے خریدے۔ میری سرکاری کار کے شوفر آقائے احمد عرب نژاد اور بہت دوست آدمی تھے۔ مجھے اور صادقہ کو لے کر قم روانہ ہوئے۔ طہران سے شاید سو میل دور تیز دھوپ۔ دونوں طرف چٹیل بے برگ و گیاہ میدان،

آبادی ناپید۔ آدھے راستے جا کر تازہ دم ہونے کے لیے ایک گاؤں کے کنارے آقائے احمد نے کار روکی۔ شاہراہ کے کنارے چند خستہ قدیم مکان کھڑے تھے۔ ایک دراز قد عورت سیاہ چادر میں ملفوف ایک ڈیوڑھی سے نکل پر چھائیں کی مانند ایک گلی میں غائب ہوگئی۔ سامنے چائے خانے میں لوگ باگ بنچوں پر بیٹھے حقہ اور چائے پی رہے تھے۔ یہ وہ "پُراسرار شرق" ہے جس کی تصاویر یورپین مصور تین سو سال سے بناتے چلے آئے ہیں نہ کہ طہران کی ہولنگ ایلی۔

ساتھ لایا ہوا ناشتہ کر کے اور چائے خانے سے خرید کر کوک پینے کے بعد ہم لوگ پھر منزل مقصود کی سمت روانہ ہوئے۔

اچانک دور تیز نیلے آسمان کے افق پر ایک جگمگاتا آفتاب نمودار ہوا خیرہ کن سونے کا عظیم الجثہ ڈلا۔

"معصومہ قوم۔" آقائے احمد نے لرزاں آواز میں کہا۔

یا بنت رسول اللہ! یا خواہر امام رضاؑ۔ ہم لوگوں نے بے اختیار درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ اور بے طرح جی بھر آیا۔ لاشعوری مذہبی جذبات کا سائنٹفک تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہم شہر میں سوو بانہ داخل ہوئے۔ ایک سنسان چوراہے سے گزرے۔ اونچے پوپلر کے نیچے ایک بنچ پر بیٹھی سیاہ لباس میں ملفوف چند معمر عورتیں باتوں میں معروف تھیں۔ اب یہاں سے پھر نیم شرقی یورپ شروع ہو گیا۔ یہ منظر ترکی، یوگوسلاویہ اور یونان کا بھی ہو سکتا تھا۔

16. ایرانی عوام

عظیم الشان روضہ معصومہ قم سارا کا سارا سونے چاندی اور جواہرات میں ڈھلا ہوا ہے۔ سوزے پہن کر اور ساری کے آنچل سے سر اچھی طرح ڈھانپ کر میں اور صادقہ صحن میں گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک معلم لپکا ہوا آیا۔ ایرانی روضوں پر پاکستانی زائرین کی کثرت کی وجہ سے ساری پوش خواتین کو دیکھتے ہی معلمین ان کی طرف دوڑتے ہیں اور ان کی خوش الحانی اور قرأت

اس قدر مسحور کن اور حیرت انگیز ہے کہ اسے سن کر بغیر کچھ سمجھے ہی انسان مسلمان ہو جائے۔ مقبرہ کا روضہ (روضہ یعنی باغ) لہلہا رہا تھا۔ حوض، نہریں، سرو شمشاد، غربا کے ہجوم، مقبرے کے اندر ضریح مقدس کے گرداگرد کھچا کھچ غربا کا ہجوم۔ ایک کونے میں ایک مسکین صورت جوان منگول خستہ شلوار پہنے دروازے میں کھڑا ایک پرانا شکستہ قرآن شریف پڑھنے میں مصروف تھا۔ ایک مصیبت کی ماری عورت ضریح کی جالی پکڑ پکڑ کر چلا چلا کر یا بی بی! یا بی بی پکار رہی تھی۔ اور رو رو کر جناب معصومہؑ سے اس طرح باتیں کر رہی تھی، گویا وہ سامنے موجود ہیں۔ ضریح کے اندر سنگِ موسیٰ کا سادہ مزار جس کے اوپر جناب معصومہؑ کا ذاتی قرآن شریف رحل میں رکھا تھا۔

مجھ پر اور صادقہ پر بڑی رقت طاری ہوئی کہ اچانک ایک دیہاتی عورت نے مجھے ایک جھانپڑ رسید کیا اور غصہ سے بولی "کافر بچی لپ اسٹک لگا کر یہاں آئی ہے۔"

میں اور صادقہ بھیڑ کے دھکے کھاتے فی الفور وہاں سے سٹک لیے۔ روضہ سے ملحق اس شیش محل میں پہنچے جہاں شاہانِ قاچار کی جڑاؤ قبریں موجود تھیں۔ عوام الناس کے دھکے کھاتے باہر آئے۔ ایک معلّمہ نے کہا زنانہ مسافر خانے میں جا کر آرام کر لیجیے۔

روضے کے قریب گلی میں ایک دو منزلہ مکان کھڑا تھا۔ جس کے معمولی کمروں کے فرش پر ایران کے دُور افتادہ صوبوں سے آئی ہوئی عورتیں برقع اوڑھے بیٹھی تھیں۔ بالکل جس طرح ہمارے ہاں اجمیر شریف کے زنانہ مسافر خانوں کا منظر ہوتا ہے۔ تہران بلٹن کے بعد قم کی سرائے ایک اور دنیا تھی۔ یہی شہر علما اور ملاؤں کا بڑا مرکز اور موجودہ انقلاب کا ایک گڑھ ہے۔

تہران واپس آ کر ایک روز میں نے صادقہ اور مصطفےٰ جعفری سے کہا: "شاہ بانو نے ذکر کیا ہے کہ تہران سے باہر حضرت شہربانو کا مزار بھی ہے۔ اسے ضرور دیکھنا۔ گو اس کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے۔"

جمعہ کے روز جو ایران میں چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ میں کوچۂ آبشار خیابان میکدہ سے صادقہ اور مصطفےٰ کو ساتھ لے کر شہر سے باہر روانہ ہوئی۔ مزار ایک پہاڑی پر تھا۔ اس روز بھی دھوپ بہت تیز تھی۔ پہاڑی کے نزدیک سنسان سڑک کے کنارے کوکا کولا کی چند دوکانیں نظر آئیں۔ میں

نے آقائے احمد سے کہا "کار روکیے تاکہ ہم لوگ کوک پی لیں۔ آقائے احمد کار چلاتے رہے"۔ میں نے دوبارہ کہا۔

"آغا بہت گرمی پڑ رہی ہے۔ کیا آپ کا جی کوک پینے کو نہیں چاہ رہا۔ یہ اتنی دوکانیں سامنے موجود ہیں۔"

آغائے احمد کار چلاتے رہے۔

اب مصطفےٰ جعفری نے ان سے کہا۔ ان کی اس "حکم عدولی" پر ہم سب متعجب تھے۔ چند منٹ بعد آغائے احمد نے فرمایا:

"وہ دوکانیں سب یہودیوں کی تھیں، میں آپ کو مسلمان کی دوکان پر لیے جا رہا ہوں۔"

ہم لوگوں نے ایک مسلمان کی دوکان پر ٹھہر کر کوک پیا۔ کار پہاڑی راستے پر چڑھنے لگی۔ آغائے احمد نے اطمینان سے فرمایا:

"اس پہاڑی میں کان کنی کے لیے MINES بچھادی گئی ہیں۔"

"توبھیا..... چلو واپس۔ ورنہ بھک سے اُڑ جائیں گے۔" مصطفےٰ جعفری بولے ہم لوگ فرازِ کوہ پر پہنچ چکے تھے۔

جس ملک میں امام زادوں کے مقابر ایسے عالی شان ہوں وہاں جناب شہربانو کا مزار ایسا معمولی۔ جیسے ہمارے ہاں کسی مقامی پیر فقیر کی چھوٹی سی درگاہ برگد تلے۔ اس مزار کی تاریخی حیثیت یقیناً بے حد مشتبہ تھی۔

مزار کی معمولی سی عمارت کے صحن میں مجاور صاحب موجود۔ زائرین مفقود اندر ایک کمرے میں ایک اونچی تربت پر سادی سبز چادر۔ اُوپر حضرت علی اور امام حسینؑ کی "تصاویر" فریم میں۔ دیوار پر پورا "فیملی گروپ۔"

"اہل بیت اطہار....." مجاور نے "فیملی گروپ" کی طرف اشارہ کیا۔ مصطفےٰ جعفری چیں بچیں ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ صریحاً مزار بالکل فرضی تھا۔ لیکن میں نے اور صادقہ نے فاتحہ پڑھ ڈالی۔

باہر آئے مجاور نے کہا" پہاڑی پر پانی نہیں پہنچتا۔ بہت تکلیف ہے" مصطفےٰ فوراً بولے
"ان خانم سے کہیے یہ علیا حضرت کی ہمنوں ہیں۔ علیا حضرت سے کہہ دیں گی۔"

میں فوراً باہر نکلی۔ ٹین کی چھت والے برآمدے کے نیچے ایک چٹان آدھی ٹوٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مجاور بولے" پاکستانی زائرین آ کر پتھر ٹکڑے توڑ توڑ کر لے جاتے ہیں اس وجہ سے چٹان آدھی رہ گئی۔ آپ کو بھی ٹکڑے چاہئیں؟"

"جی نہیں۔ مگر اس چٹان میں کیا خاص بات ہے؟" میں نے کہا۔

"جناب شہر بانو نے جنگ کربلا کے بعد دعا مانگی تھی کہ اپنے وطن واپس چلی جائیں۔ چنانچہ ایک گھوڑا نمودار ہوا۔ آپ اس پر سوار ہوئیں۔ وہ ہوا میں اُڑتا ہوا سیدھا ہماری شہزادی کو یہاں لے آیا۔ اور اس چٹان پر اُترا۔ وہ دیکھیے چٹان پر اس کے سُم کے نشان موجود ہیں" مجاور نے کہا۔ ہم لوگ مسکرائے۔

"توبہ کیجیے۔ توبہ کیجیے۔ کیا پتہ صحیح واقعہ ہو۔" آقائے احمد بولے۔ حالانکہ مزار کے متعلق وہ بھی کافی ڈھلمل یقین معلوم ہو رہے تھے۔

واپسی میں شہر جانے والی شاہراہ پر شلوق شدید تھا۔ موٹریں، ٹرک، بسیں ٹریفک جام۔
"شلوغ شدید ست۔" آقائے احمد نے کہا۔ عمارتوں پر مسلسل چوبیس گھنٹے چراغاں رہتا تھا۔ برقی قمقموں کی عظیم الشان مالائیں، طرح طرح کے برقی گل بوٹے۔ اسراف اور فضول خرچی مسلمانوں کی عادت ہے۔

راستے میں ایک نہایت عالی شان ڈپارٹمنٹ اسٹور نظر آیا۔ میں نے کہا چلو اسے بھی دیکھتے چلیں۔ وہ ورکنگ کلاس ایریا تھا اور ڈیپارٹمنٹ اسٹور بذاتِ خود ایک پورا شہر۔ ہر منزل پر فوارے چل رہے تھے۔

مصطفےٰ جعفری نے کہا۔ یہ یہاں کے نچلے متوسط طبقے والوں کے لیے ہے گویا مارک اینڈ اسپنسرز۔ یا بارکرز۔ بڑھیا ڈیپارٹمنٹ اسٹور تو آپ شہر کے دوسرے حصے میں دیکھ ہی چکی ہیں مثلاً ہماری خانم جو ہمارے ہاں برتن دھونے آتی ہے۔ وہ اپنے فراک یہاں سے

خریدتی ہوگی۔"

"چلیے ایک خالص عوامی علاقے میں چل کر ایرانی فلم دیکھیں"۔ میں نے کہا۔ آغائے احمد آج کل کون کون سی اچھی فلمیں چل رہی ہیں۔"

انھوں نے تین چار امریکن فلموں کے نام گنائے۔

"لیکن ایرانی فلم—؟" میں نے پوچھا۔

"میں صرف امریکن یا مصری یا ہندستانی یا ترکی فلم دیکھتا ہوں۔ ایرانی فلم دیکھنے کے لائق نہیں ہوتے۔"

"ہم کو آپ کسی ایرانی فلم ہی میں لے چلیے۔" میں نے اصرار کیا۔

وہ بادل نخواستہ ایک بازار میں پہنچے۔ "وہ دیکھیے سامنے ایک ترکی فلم چل رہا ہے، وہ دیکھ لیجیے۔"

"نہیں۔ ایرانی فلم"۔ میں مصر رہی۔ ہم لوگوں نے اتر کر ٹکٹ خریدے۔ بے حد عوامی سنیما ہال تھا۔ چادر پوش عورتیں۔ مزدور اور کاریگر حضرات۔ آٹھ برس بعد ابادان کے سنیما ہال میں ایک ایرانی فلم دیکھتے ہوئے اسی طرح چار سو ایرانی مرد و زن و بچہ جل کر خاک ہوا۔

طہران کے اس عوامی سنیما گھر کے باہر صاف ستھرے چائے خانے۔ فیروزے کی دوکانیں۔ گہما گہمی، جیسی ایک مشرقی بازار میں ہونی چاہیے۔ یورپین نما الٹرا فیشن ایبل ڈاؤن ٹاؤن سے مختلف یہاں کی فروشگاہوں پر پیرس اور لندن کی دوکانوں کا دھوکا ہوتا ہے۔

راقم الحروف کے والدین کے پرانے دوست کرنل رحمٰن اور بیگم کشور رحمٰن کے صاحب زادے رشی رحمٰن جوان دنوں ایران میں سفیر ہند تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ ہم تبریز جارہے ہیں۔ آپ بھی چلیے ایرانی آذربائیجان گھوم آیئے۔

''لیکن مجھے ایک ٹیلی ویژن پروگرام کے لیے رکنا تھا۔ طہران ٹی وی کا شاید ہفتہ وار آدھ گھنٹے کا پروگرام MEET THE WORLD PRESS ہوتا تھا۔ پون گھنٹے کے انٹرویو میں انھوں نے ہندستانی صحافت کے متعلق سوالات کیے۔ تیسرے روز میں نے صادقہ کے ہاں وہ پروگرام دیکھا۔ انگریزی انٹرویو کا بیک وقت فارسی ترجمہ کیا گیا تھا۔ وقفے وقفے سے انگریزی مکالمے کو مدھم کرکے فارسی ترجمے کی آواز SUPER IMPOSE کردی جاتی تھی۔ دوسری شام ایک ڈپلومیٹک دعوت میں مجھے ایک ایرانی نوجوان قانون دان ملے جو غالباً زیر زمین بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے اور شاہ کے مخالف تھے۔ انھوں نے بہت طنزیہ انداز میں دریافت کیا'' آپ شاہ بانو کی سوانح حیات لکھنے آئی ہیں؟'' میں نے کہا'' میں ایک صحافی ہوں اور کسی بھی موضوع پر لکھ سکتی ہوں''۔ وہ مسکرا کر چپ ہو گئے اس پورے دوران قیام میں صرف یہی ایک سیاسی بات مجھ سے کسی نے کہی تھی۔

سیاست کی حد تک موضوع گفتگو صرف ایک تھا شاہ اور شاہ بانو اور ان کے کارنامے۔ ہر جگہ ان دونوں کی تصاویر۔ اخبارات ان کی تصاویر سے پُر۔ ایک روز ن۔م۔راشد کہنے لگے'' یہاں صرف ایک چرچا ہے۔ خدا اور اس کی بیوی''۔ راشد صاحب جدید ایرانی شاعری کے بے حد مداح تھے۔ میں نے پوچھا'' آپ عرب دنیا سے بھی خوب واقف ہیں۔ عربی شاعری کیسی ہے''؟ کہنے لگے بس جیسے عرب ہیں ویسی ہی ان کی شاعری ہے۔

مسز خشونت سنگھ اور مسز بدرالدین طیب جی طہران پہنچے۔ دونوں کویت سے آرہے تھے۔ ہلٹن میں ٹھہرے۔

17. کاخ نیاوراں

لندن سے ریمش سنگھوی۔ مع انگریز مشہور فوٹوگرافر کے آئے۔ شاہی خاندان کی تصاویر کھینچیں۔ پبلشر نے مجھ سے کہا'' اگر تم چاہو تو ہز میجسٹی کی فرنچ ساتھیوں سے ملنے کے لیے پیرس کا

چکر یہیں سے لگا آؤ"۔ میں نے کہا" جب میں مسودے کی آخری دیکھ بھال کے لیے مارچ میں لندن آؤں گی تب دیکھا جائے گا۔" یہاں میں شاہ بانو، ان کے رشتہ داروں، سہیلیوں، کارکنوں، اراکین حکومت، فن کاروں اور ماہرین تعلیم وغیرہ وغیرہ سے مل کر کتاب کے لیے تقریباً سارا مواد جمع کر چکی تھی۔ نومبر کا مہینہ ختم ہونے والا تھا۔ کاخ نیاوراں میں اس آخری شام ٹیل کوٹ میں ملبوس انسان نے امپریل کریسٹ والے ٹی سیٹ میں (جس کے چمچے خالص سونے کے تھے) حسب معمول چائے لا کر رکھی اور دبے پاؤں واپس آ گیا۔ شاہ بانو نے چائے بناتے ہوئے آہستہ آہستہ سے کہا" خزاں کا موسم میرے لیے بہت اہم ہے یہ ایران میں حرکت کا موسم ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں یہاں اکٹھے اتنے جشن منائے جاتے ہیں" ہندوستانی پریس اتاشی نے جو ایک سردار صاحب تھے۔ عصرانہ دیا (اس میں بلراج مدھوک بھی موجود تھے) ایک شام خوشونت کو تہران پی۔ای۔این نے مدعو کیا۔ وہاں ہال میں بالکل اسی قسم کے پارسی نما بوڑھے اور بوڑھیاں موجود تھے۔ جو بمبئی پی۔ای۔این کی میٹنگوں میں نظر آتے ہیں۔ خشونت سنگھ ایسا غیر دلچسپ مجمع دیکھ کر کافی پژمردہ ہوئے۔ کہنے لگے تم میرا تعارف کرا دینا"۔ میں نے آٹھ دس منٹ موصوف کے تعارف میں صرف کیے۔ اس کے بعد آپ نے حسب عادت ایک دلچسپ تقریر کی مگر مجمع پر کوئی ردِ عمل نہ ہوا۔ اسی طرح سنجیدہ شکلیں بنائے بیٹھے رہے۔ میٹنگ میں چند سردار صاحبان بھی تھے۔ وہ مسز خشونت سنگھ کو مدعو کرنے آئے تھے۔ ہم لوگ اتر کر نیچے سڑک پر پہنچے۔ فٹ پاتھ سنسان تھی۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے ہو کر ایک سردار صاحب نے کہا" سیاسی قیدیوں کو چوراہے پر پھانسیاں دی جاتی ہیں۔ ابھی حال میں ایک نوجوان کو سولی پر لٹکایا گیا ہے۔"

"کوڈ آف نپولین یہاں اب رائج ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

سیاست کے متعلق صرف یہ دو جملے اور تھے جو میں نے سُنے۔

"امام محمد المہدی القائم ال منتظر" کا یوم پیدائش۔ تمام شاہی سالگرہیں۔ اکتوبر میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں اسی مہینے میں پیدا ہوئی۔ میرا پہلا بچہ اکتوبر میں پیدا ہوا اور 1967 عیسوی

میں اسی مہینے میں مجھے تاج شاہی پہنایا گیا۔ میری سہیلیاں مجھ سے کہتی ہیں میں ایک بے حد خوش نصیب لڑکی ہوں۔ ایسا لائق شوہر، اتنے پیارے اور ذہین بچے۔ اتنی عزت میرے پاس سب کچھ موجود ہے مگر اس کے باوجود میں بعض دفعہ بہت اداس ہو جاتی ہوں۔ دنیا میں اتنی بے انصافی اور اتنی ریاکاری اور اتنا دکھ ہے۔ اس لمحاتی قنوطیت کو جھٹک کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہوں۔"

دریچوں کے باہر باغ میں زرد پتوں کے قالین بچھ چکے ہیں۔ گلشن میں فوارے منور ہو جاتے ہیں۔ شاہ بانو کا ایک کتا اندر آ کر اطمینان سے صوفے کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کہتی رہتی ہیں "خزاں ایران میں طمانیت کا موسم بھی ہے۔ لائف ان سلوموشن آہستہ خرام اور پرسکون۔ مناظر قدرت میرے لیے بہت اہم ہیں۔ ہوا کے جھونکے کی لائی ہوئی ایک خوشبو گزرے وقت کی یاد دلا جائے۔ صبح و شام کی بدلتی پرچھائیاں۔ موسیقی کی کوئی دھن جو کسی دور دیس میں سنی ہو اور وہ کوئی اور دھن سن کر اچانک یاد آ جائے۔ درختوں کے نیچے بہتا نہر کا پانی۔ سڑکوں پر گرتے پتے۔ پہاڑوں پر پھیلتی صبح کی روشنی۔ رات کو دریچوں میں سے باہر چھنتی زرد روشنیاں۔"

"میں لوگوں کے بارے میں بہت جذباتی ہوں۔ ایسے لوگ جن کو میں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ میں نے اپنی دایہ منور خانم مرحومہ کی آواز ٹیپ کر کے رکھی ہوئی ہے۔ مجھے اپنے سارے رشتہ داروں سے بہت محبت ہے وہ چچا جو ہز ایجنسی کے چیمبرلین تھے، اور ہر سال نوروز پر درباری انعام کی پہلوی اشرفی لا کر مجھے دیا کرتے تھے اب پیرس میں رہتے ہیں۔ پیرس سے بھی ہمارے گھرانے کی قسمتیں عجیب طرح وابستہ رہی ہیں۔ میرے والد اور چچا سہراب اور بہرام دیبا 1917 عیسوی میں ماسکو سے ریفیوجی بن کر وہاں پہنچے تھے۔ وہیں 1921 عیسوی میں ایک فرنچ اخبار میں میرے بابا نے پڑھا کہ ایران میں انقلاب آ گیا ہے اور چالیس سال بعد پیرس کے اسی فرنچ اخبار نے میرے ہاں ولی عہد تولد ہونے کی خبر خوشی کے مارے بہ طور خاص فارسی رسم الخط میں شائع کی۔ اہل فرانس کے اور میرے درمیان ایک خاص قسم کا جذباتی رشتہ

موجود ہے۔"

میں نے سوچا اس تمام عرصے میں روس، یورپ اور ایران کتنا بدلا۔ ان پچھلی دہائیوں کے متعلق تصور کیجیے تو پڈوکن کی کسی فلم کے مناظر معلوم ہوں۔

جمعہ کی ایک خنک خوشگوار صبح علیا حضرت سے آخری ملاقات کے بعد میں نیچے آئی۔ ایک کمرے میں چند درباری تاش میں مصروف تھے۔ ایک ڈرائنگ روم میں وزیرِ صنعت آقائے ہوشنگ انصاری موجود تھے۔ ہال میں مادام فریدہ دیبا کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ باہر باغ میں سرد ہوا چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ خانم لیلیٰ امیر طہماسپ اپنی انتہائی بیش قیمت فرنچ کار تیزی سے ڈرائیو کرتی محل کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھیں۔ پھاٹک کے دفتر سے سیکوریٹی افسر نے آقائے احمد کو کار اندر لانے کے لیے فون کیا۔

کار نیاوراں سے اتری۔ دور کسی پہاڑی راستے پر ایک چادر پوش عورت خچر پر بیٹھی ہوئی جا رہی تھی۔ ایران لازوال ہے۔

اب کوہستانی اور صحرائی اور دیہاتی چائے خانوں کے اندر سمور میں ملبوس لوگ سماواروں کے گرد بیٹھ کر گزرے وقتوں اور آنے والے وقتوں کی باتیں کریں گے ان کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیستون کے پتھروں سے تراشے گئے ہیں یہ بوڑھے اور جوان کسان، گڈریے، پھل فروش شاہنامہ فردوسی سنتے ہیں۔ رستم و سہراب و سائرس و شاہ عباس اور رضا شاہ کبیر و محمد رضا پہلوی و فرح پہلوی — یہ سب کیا ہے؟ پرتی پولس کے زینے کی دیوار پر یک رخی مجسمے؟ تقدیر و تدبیر کیا ہے اور انسان مجبور ہے یا خود مختار؟ اور کاشان کے کارخانوں میں لڑکیاں کرگھوں کے سامنے بیٹھی قالین بنتی چلی جا رہی ہیں۔ تاریخ کے نمونوں اور گلکاریوں کا تانا بانا۔

ایران کا موسم خزاں نرم جذباتی گہرائی اور نوسٹلجیا کا موسم ہے۔ جب پرانی حکایات آتش دان کے شعلوں میں سنہرے پیکر حاصل کر لیتی ہیں کیونکہ موسم خزاں میں ماضی اور مستقبل دونوں شامل ہیں۔ پرانے پتے گر رہے ہیں۔ بہت جلد نئے پتے نکلیں گے۔

کاخ نیاوراں کے اونچے درخت بادشالی میں سرسرا رہے تھے۔ عنقریب موسم سرما

کے بادل کوہ دماوند پر چھا جائیں گے۔ اس کے بعد بہار آئے گی اور شہران میں نغمہ ہزار گونجے گا۔ •

اختتامیہ، میری انگریزی کتاب "دی ایمپریس" یورپ کی چھ زبانوں میں شائع کی جانے والی تھی۔ اسی زمانے میں مشہور ماہر ایرانیات اور برطانوی مورخ رچرڈ فرائی تاریخ ایران پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھے "دی ایمپریس" اور رچرڈ فرائی کی کتاب کا اجرا رمیش سنگھوی اکتوبر 1971 عیسوی میں ڈھائی ہزار سالہ جشن کے پہلے روز کرنے والے تھے۔ شروع دسمبر میں تہران سے بمبئی واپس آ کر میں نے کتاب لکھنی شروع کر دی۔ ڈیڑھ ماہ میں اسے مکمل کر کے شروع فروری میں مسودہ لندن بھیج دیا۔ حسب عادت مسودے کی نقل اپنے پاس نہیں رکھی۔ مارچ کے مہینے میں رمیش سنگھوی وہ مسودہ لے کر نیویارک گئے۔ کتاب لندن و نیویارک سے بیک وقت چھپنے والی تھی۔ پبلشر نیویارک میں HARPERS یا COLLIERS رسالوں میں اسے بالاقساط شائع کرنے کی گفت و شنید بھی کر رہے تھے اسی ماہ مارچ میں بے چارے رمیش ایک مہلک مرض میں گرفتار ہو کر راہی ملکِ عدم ہوئے ان کی اچانک علالت کی وجہ سے میں اس دوران میں لندن جا کر معاہدے کے کاغذات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ ان کے اچانک انتقال کے بعد ان کے پبلشنگ ہاؤس میں افراتفری مچی۔ ان کی سکریٹری نے میرا مسودہ گنوا دیا۔ غلطی سراسر میری تھی کہ نہ میں نے اس کی نقل اپنے پاس رکھی نہ پہلے سے معاہدہ کیا (اس قسم کی حماقتیں میں ہمیشہ کرتی رہتی ہوں کوئی نئی بات نہیں) قصہ مختصر آں دفتر را گاؤ خورد۔

بے تحاشا دولت کی ریل پیل۔ افراطِ زر اور شدید کرپشن 1974 عیسوی سے شروع ہوا۔ لیکن اس وقت بھی ایران کا تمول خیرہ کن تھا۔ اوپری طبقہ تکبر میں مبتلا اور عیش و عشرت میں

مصروف لوگ باگ بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھور ہے تھے۔ برسبیل تذکرہ بحیثیت "ہمئون علیا حضرت" طہران کی جس دکان سے جو چاہتی خریدتی اور اس کا بل منسٹری آف کورٹ کو بھیج سکتی تھی لیکن میں نے بوجہ ایمان داری ایسا نہیں کیا۔ جیسی گئی تھی ویسی واپس آ گئی۔ پٹرو ڈالرز کے اس سیلاب میں یار لوگوں نے کروڑوں کے وارے نیارے کر لیے جہاں موقع ملا ہاتھ مارا۔ اس سارے کرپشن کا نتیجہ آج سامنے موجود ہے۔ حال ہی میں مجھ سے ایک ایرانی دوست نے کہا کہ "جس وقت آپ ایران گئی تھیں۔ اس وقت حالات اتنے خراب نہیں تھے اور شاہ اور خصوصاً شاہ بانو کافی حد تک مقبول تھے۔"

کسی ملک میں چند ہفتے یا دو ماہ گزارنے کے بعد اس ملک و قوم کے متعلق فیصلے صادر کرنا صحافیوں کی عام کمزوری ہے اکثر یہ تحریریں سرسری تاثرات، سنی سنائی باتوں، سرکاری پبلسٹی ٹورسٹ لٹریچر اور چند ذاتی تجربات پر مبنی ہوتی ہیں۔ ایران کے متعلق میں بھی یہی غلطی کر سکتی ہوں۔ گو ایران ہمارے لیے ایک اجنبی ملک نہیں ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہے لیکن 1967 عیسوی یا 1970 عیسوی کے ایران جا کر کوئی بھی دھوکہ کھا سکتا تھا کہ یہ ملک جو دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور فخریہ اپنے آپ کو خاورمیانہ کا جاپان کہنے لگا ہے اس کا شاہی نظام کم از کم کراؤن پرنس رضا کی تخت نشینی تک تو برقرار رہے گا۔ "اعلیٰ حضرت ولی عہد ہمایوں" کی تصاویر ہر طرف جلوہ افروز تھیں اور انھوں نے تھوڑا تھوڑا پبلک لائف میں آنا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں نے ان کو تاج گذاری کے موقع پر والدین کے تخت کے پاس بیٹھے دیکھا تھا اور وہ اس کم سنی میں شاہانہ انداز اختیار کر چکے تھے۔ لیکن مرحوم شاہ فاروق کیا 1964 عیسوی میں پٹرو ڈالرز کی بات کہہ گئے کہ بادشاہ صرف پانچ بچیں گے۔ تاش کے چار اور پانچویں شاہ برطانیہ مجھے یاد آتا ہے۔ اکتوبر 1967 عیسوی میں جشن تاج گذاری کے بعد جب میں بلقن سے ایئرپورٹ روانہ ہو رہی تھی۔ اُسی وقت بمبئی کے ایک امریکن دوست مل گئے جو چند گھنٹے قبل تہران پہنچے تھے۔ شہر روشنیوں سے بقعہ نور ہر طرف شاہ، شاہ بانو اور ولی عہد ہمایوں کا چرچا۔ انھوں نے آنکھیں پھیلا کر مجھ سے کہا—

" GEE THIS KING BUSINEES IS BUSINESS"

اور آج 5 جنوری 1979 عیسوی کے روز جب ایران میں تختِ طاؤس ڈانواڈول ہے، پرانے کاغذات میں سے وہ شاندار دعوت نامہ نکلا۔

''بیاری پروردگار توانا۔ مراسم فرخندہ تاج گذاری اعلیٰ حضرت محمدؐ

رضا پہلوی آریہ مہر شاہنشاہ ایران وعلیا حضرت فرح پہلوی

شاہ بانوے ایران درکاخ گلستان برگزاری شود۔

وزیر دربار شاہنشاہی دعوت میکاند۔ ساعت ۲را ۹ صبح روز پنج شنبہ چہارم آبانماہ یک ہزار و سیصد و چہل و شش درکاخ گلستان حضور بہم رسانند۔''

''لیکن وقت کی دیوار پر جو حروف نمودار ہوئے ہیں کیا ان کو پڑھنے کے لیے اب بھی کسی دانیال نبی کی حاجت ہے؟

('آجکل'، مارچ 1978)

• جہانِ دیگر

نوٹ: یہ مضمون سن 1960 عیسوی سے قبل شائع ہوا تھا اور اسے میں نے پروفیسر مرزا محمد سعید کے صاحبزادے کامذر حسن عسکری کے اس مضمون کے لیے بطور فوٹ نوٹ لکھا تھا جو غالباً نقوش کے شخصیات نمبر میں شائع ہوا تھا۔

شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ:

''موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوسِ قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے اُلفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اُن کے کمروں کا رنگ ہلکا آبی ہے۔ پردے چمپئی۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے مہکتے ہیں۔''

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح 'شخصیت نگاریاں' اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ہم نہایت ذوق شوق سے رسالہ 'شمع' بھی پڑھتے ہیں اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہوتی ہے تو ایک چنڈوخانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے ماشاء

اللہ۔ ایک کمرے میں ریڈیو دہاڑ رہا ہے۔ دوسرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں "چو ہے دوڑ بلی آئی" کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ (یعنی تایازاد بہن کی لڑکی) اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہندو فنون لطیفہ سے شدید انس ہے اور کوکش کی تو آپ عاشق ہیں۔ لیلل لولو اور ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علاحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ سب گپ ٹھوکی ہے) ایک روز ہم حسب معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شنکرا کو کیدار میں نقل کرنے میں مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز مصنف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے۔ (کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن واقعتہً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہرصورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہوگئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاحی حس فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی اس کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اُٹھ کر کینیڈا چلا گیا)۔

میری تین عزیز سہیلیاں[1] اور دوسری سہیلیاں ان سے قطع نظر ہم سب ماشاء اللہ سے

اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچتا ہے) ہمارے چچامیاں کا مکان بیکٹ ہاؤس کہلاتا تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہ جہاں پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹری پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹری سے اترے گی۔

یہ سب بڑے ہوئے تو اے لیجیے۔ ایک سے ایک عالم، فاضل چلا آرہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹا کھٹ توڑ ڈالے۔ ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں۔ ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست داں بن گئے۔

ہمارا کنبہ اب بہت دور تک تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں۔ بچپن رنگا رنگ مناظر سے پُر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے بمبئی، کلکتہ، ایران کے ساحل، کربلائے معلّی۔

پہلی کہانی بہ عمر چھ سال لکھی۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ "کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا، رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹینیں لیے اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ اسی زمانے کا ایک منفرد منظر یاد ہے ضلع پرتاپ گڑھ کی ایک شکارگاہ (اس ضلع کے جنگلوں کے بارے میں بعد میں پڑھا کہ اس میں...... شیر کا بھیس بدل کر گھوما کرتے تھے) تو اس شکارگاہ میں رات کے وقت مچان پر ہم بچوں کو چند منٹ کے لیے بیٹھالا گیا۔ وہاں ہمارے ایک شکاری ماموں ممانی شیر کا شکار کھیلنے کی غرض سے آئے تھے۔ جب ہم مچان پر بیٹھے تو دور ایک ٹرین جاتی نظر آئی۔ میرے ایک کزن نے بعد میں ماموں سے کہا وہ ٹرین ایسی لگی جیسے جگنوؤں کی لکیریں اور میں نے کہا وہ ٹرین ایسا لگا جیسے جگنوؤں

کی قطار۔ ماسوں بولے ایک انگریزی داں اور ایک اُردو داں۔

گڑیوں کا باقاعدہ اسکول کھولا تھا۔ ایک نصف جرمن لڑکی نی نی چچا عبدالستار خیری کی لڑکی تھی۔ اُس کی والدہ جرمن تھی۔ اُس زمانے میں اکثر ہندستانی قوم پرست نوجوان انگلستان کے بجائے بغرضِ اعلیٰ تعلیم جرمن جاتے تھے اور وہاں سے جرمن بیبیاں لے آتے تھے جو بہت ہی وفادار اور پچی ورتا اور گھریلو ثابت ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر سلیم الزماں اور ظہیر حشمی کی بیویاں بھی جرمن تھیں اور نورالدین احمد بیرسٹر کی بیوی انگریز چونکہ تینوں گوری یورپین اقوام سے تعلق رکھتی تھیں جرمن اور انگلستان کی لڑائی کے دوران بھی اِن تینوں میں آپس میں بہت دوستی رہی۔ نی نی نے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی ہیلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ جچا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی اُس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہرحال میرا گڈا خالص جرمن ہے، سید حا برلن سے آرہا ہے۔ تمھاری "لیڈی ہیلنڈا" گو بلونڈ ہے مگر تمھاری گڑیا ہے لہٰذا ہے تو ہندستانی۔ اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی۔

ہمارا کتا نیکس بھی جرمن تھا وہ ایک طویل، پستہ قد اور چھوٹے پیروں والا بے حد پیارا کتا تھا۔ وہ بے چارا دن بھر اور رات بھر برساتی کے باہر رہتا اُسے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اماں ایک بے حد نمازی خاتون تھیں وہ بے چارا گھر میں کیسے آتا لیکن مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا اور میں نے ایک روز پوچھا کہ یہ کتا بھی تو اللہ میاں نے بنایا ہے اور اتنا سویٹ محبت کرنے والا جانور ہے اُسے نجس کیوں قرار دیا گیا ہے اور بلی ایسی مکار ذات اور بے وفا شئے ہے اور وہ ہر وقت آپ کے پلنگ پر بیٹھی رہتی ہے۔

جب پہلی کتاب ستاروں سے آگے چھپ کر آئی تو ایک خاتون نے کہا "آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!!" ـــــ اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کے لیے میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے بھی صنم خانے" میں سوائے "پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجیے۔ یہاں ہم نے تو اپنی

طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلم بند کی تھی، کرشن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس ''فوٹ نوٹ'' کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بر خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں، اُن کی وجہ سے لوگ یا تو احساسِ برتری کا شکار ہیں یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے۔ NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں اُن لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری ''شخصیت'' تو بھئی یہ تو ایک بڑا جید قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری ''شخصیت'' — یہ کیا مسخرہ پن ہے!

قرۃ العین حیدر

حواشی:

1. لکھنؤ کی مشہور، جسپال سسٹرز۔ شکنتلا قدوائی، کملا جسپال، و ملا سیال

اُڑن ہاتھی اور بڑھیا کا تنور

منجانب: یوحنا عارف

اس کی طرف سے جو ہے اور جو تھا اور جو ہوگا اور میں نے اپنے پیچھلے نرسنگے کی آواز سنی کہ جو کچھ نظر آتا ہے، اس کو کتاب میں لکھ۔"

یہ روداد جہد البقا میں ہارنے اور جیتنے والوں کی ہے۔ ظفریاب وہی ہوتے ہیں جنھوں نے خود کو فتح کا اہل بنایا۔ (خدا ان قوموں کی حالت نہیں بدلتا جنھوں نے خود اپنی حالت نہیں بدلی) بقائے اصلح کا فطری قانون یہ نہیں دیکھتا کہ کون مشرک ہے کون کلمہ گو کون بُت پرست اور کون کیمونسٹ۔

ورجن کوئن ایلزبتھ اوّل سے لے کر رینگ کوئن ایلزبتھ ثانی تک بنے ہوئے زمرّدیں شجر کے نیچے پھیلا چھوڑ کر امریکن اُڑن ہاتھی زن سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا۔ مشرکین ارض و سموات مسخر کر کے کرۂ قمر پر اپنی اناجیل چھوڑ آئے اور نصف کرۂ ارض پر حاوی ہیں اور ان کا تمدن اپنانے اور اُن کے طرز و معیارِ زندگی تک پہنچنے کے لیے "قدیم مشرقی روحانی تہذیبوں" کے نام لیوا بیتاب و مضطرب۔

سامنے فرسٹ کلاس میں نیویارک کے ایک سندھی تاجر کی عمر رسیدہ زوجہ ایک فربہ پنجابی لڑکی سے ایک مائیکرو ویو تنور کا تذکرہ کر رہی ہے جو اس نے حال میں خریدا ہے اور جس میں کھانا تین منٹ میں پک جاتا ہے۔

(یاد رکھو اور ایمان لے آؤ کہ دوسرا طوفانِ نوح بڑھیا کے اس مائیکرو ویو تنور سے نکلے گا)

فربہ پنجابی لڑکی نے گلے میں اپنے تازہ ترین فیشن ہیبل گرو کی مالا پہن رکھی ہے، جو فلاڈلفیا میں ٹھاٹھ کر رہا ہے۔

اِدھر ملحد دہریے روسی کرۂ قمر پر اپنے ہتھوڑے اور درانتی کا نشان چھوڑ آئے ہیں اور باقی دنیا پر وہ حاوی ہیں۔

''رَبُّ الْمشرِقینِ وَرَبُّ الْمَغْرِبینِ'' یعنی خداوند تعالیٰ نے جن اہل اسلام کو چھپّر پھاڑ کر بذریعہ تیل دولت عطا کی وہ دنیا پٹرو ڈالر پتی مسلمان فی الحال مونٹی کارلو اور لاس ویگاس جا رہا ہے اور جب تک اس دولت کو اُڑا نہ لے گا انشاء اللہ جاتا رہے گا۔

فرسٹ کلاس میں سندھی خاتون سے آگے چند عرب جلوہ گر ہیں۔ ہاتھ میں اُن کے تفریح گاہوں اور ان قمار خانوں کے متعلق مفصل اطلاعات کے چکیلے مسوّر رسالے ہیں۔ ''ملکۃ الملائکۃ'' جہاں پہنچ کر وہ لاکھوں پٹرو ڈالر جوئے میں ہاریں گے (کوئی مضائقہ نہیں اگر برصغیر پاکستان و ہند کے غریب مسلمان طلبا اسکول اور کالج کی فیس نہ ادا کر سکیں)۔ ان عربوں کی بیویاں ناک پر لکڑی کی چونچ لگائے نقاب اوڑھے بیٹھی ہیں۔ یہ لندن اور پیرس میں بے دریغ خریداری کر کے آ رہی ہیں اور اب امریکہ میں بے دریغ خریداری کریں گی۔ (کوئی مضائقہ نہیں اگر مصیبت زدہ فلسطین عورتیں اپنے شکستہ خیموں میں بمباری کا نشانہ بنتی رہیں)۔

اس خالی الذہن گروہ کی منزلِ مقصود امریکہ کی ''سلور اسٹیٹ'' نیوادا کا شہر لاس ویگاس ہے جو شہر ہسپانیوں نے بسایا تھا اور جو پچھلی صدی میں اس علاقے میں سونے چاندی کی کانیں تلاش کرنے والوں کا قمار خانہ تھا اور اب ساری دُنیا کا قمار خانہ ہے۔ صد حیف کہ جب جہانِ نو پیدا ہونے کی گھڑی آئی تو شیوخِ حرم اپنے کنبے لے کر فرنگی مقابروں کی سمت پرواز کر گئے۔

سنہری لڑکیاں انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں اور ریشمی آوازوں میں اعلانات کر رہی ہیں — لاس اینجلز کا ایک ہسپانوی نژاد امریکن ٹی وی اسٹار کھڑکی سے باہر شفق کو دیکھ رہا ہے۔ یہی سورج چھ سو برس قبل اسلامی اُندلس کے مدینۃ الزہرا پر ڈوب کر اس بانکے ایکٹر کے اجداد پر اس وقت طلوع ہوا تھا جب وہ نئی دُنیا کے مغربی ساحل پر الحمرا اور مدینۃ المریم ملکۃ الملائکہ — ایل پوسلبو دی، نیوترا اسینورا لا رینا دی لاس اینجلس آباد کر رہے تھے، تب سے یہ سورج یہیں چمک رہا ہے۔

مور کی آخری آہ

اسپین میں وہ مقام جہاں آخری شاہ غرناطہ ابوعبداللہ اپنی شکست کے بعد کھڑا ہو کر رویا تھا، "مور کی آخری آہ" کہلاتی ہے۔ "لوک ہارٹ" نے اپنے "اسپینش بیلیڈ" میں لکھا:

"بوعبدل نے غرناطہ کی کنجیاں فرڈی نینڈ کو تھمائیں اور اپنے شہر پر الوداعی نگاہ کی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر کوہستان کی سمت چلا گیا۔ اس پہاڑی پر پہنچ کر اس نے اپنی سلطنت پر نظر ڈالی جسے وہ کھو چکا تھا "اللہ اکبر"۔ اس نے آہ بھری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ماں عائشہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے کہا "تم عورتوں کی طرح رو سکتے ہو کیونکہ تم مردوں کی طرح لڑ نہ سکے۔"

جب سورج ڈوب رہا تھا، غرناطہ میں لوگ روئے۔ کچھ نے تثلیث کو پکارا۔ کچھ نے محمدؐ کو۔ قرآن یہاں سے چلا گیا۔ صلیب آ گئی۔ گرجاؤں میں گھنٹیاں بجیں۔ الحمرا کے میناروں سے بلال نوچ کر پھینک دیئے گئے۔ ایک بادشاہ ظفر مند آتا ہے۔ ایک سلطان روتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ گریہ کناں اپنی سفید داڑھی نوچتا نوحہ زن ہے۔ الوداع غرناطہ! الوداع بے مثال شہر! رخصت اے فخر جہاں۔ سات سو سال تو نے ایک مغرور توانا بلند مرتبت نسل کی پرورش کی۔ اعلیٰ نسب شاہی خاندان تیرے محلات میں بسے رہے اب جاتے ہیں۔ دلاور سُورما تیری گلیوں میں پھرے جو سیحیوں سے لڑتے تھے اور حسیناؤں کی خاطر اور اپنے رسول کی خاطر اور اپنی سلطنت کی حجازی اُمیدوں کے گھر جا کے دیکھو وغیرہ کی خاطر تیغ زنی کرتے تھے۔ صد حیف کہ تیرے باغات اور آبشاروں اور مرغزاروں کا حسن گہنا گیا۔

واحسرتا ــــ واحسرتا ــــ

بوعبدل افریقہ چلا گیا جہاں اُس کی اولاد نے بھیک مانگی جس طرح سات سو سال بعد

مغلوں کی اولاد دِلّی میں بھیک مانگنے والی تھی۔ بقائے اصلح کا قانون اٹل ہے۔

اس الحمرا کے ایوانِ سفرا میں جس کے زرّیں تخت پر چند روز قبل تک خلفائے اُندلس جلوہ گر ہوئے تھے، سن چودہ سو نوّے عیسوی میں ایک صبح ملکہ ازابیل متمکن تھی اور ڈون کرسٹفر اس کے سامنے دوزانو جھکا نئی دنیا ئیں تلاش کر کے "ملکہ کے تاج میں ایک ہیرا جڑنے" کی درخواست پیش کر رہا تھا۔ زردوزی کے کلمۂ طیبہ سے مزین خلفائے اُندلس کا سرخ بیضوی پرچم سرنگوں ہوا۔ ڈون کرسٹفر نیا بیضوی صلیبی پھریرا جہاز لے کر اس کے پورے دس سال بعد پرتگالی جھنڈا لہراتا بادبانی جہاز پر اطالوی مہم جو سینور امریگو—— برازیل کے ساحل پر——

اب ذرا قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھو۔

اگر ہسپانیہ کی مختلف مسلمان ریاستوں کے حکمراں بری طرح آپس میں لڑ کر کمزور نہ پڑتے اور آخر میں عیسائیوں سے مغلوب نہ ہوتے تو کیا خود نئی دنیاؤں کی تلاش میں نہ نکل سکتے تھے۔ مگر خداوند تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ مولانا حالیؔ مسدّس اور علامہ اقبال شکوہ لکھیں۔

ایک ہسپانوی فادر ٹہلتا ہوا واپس آ کر ٹی دی اسٹار کے نزدیک کرسی پر آ کر بیٹھا اور تسبیح پھیرنے میں مصروف ہوا۔

سنو! بے شمار شکست خوردہ اندلسیوں کو جبراً اصطباغ دیا گیا تھا۔ غرناطہ کیتھڈرل کے شاہی چیپل میں الطار کے پیچھے دیوار پر ایک بڑی چوبی اُبھری ہوئی رنگین تصویر میں (جو زوالِ غرناطہ کے چوبیس سال بعد تیار کی گئی تھی) گرجا میں حوض کے گرد جمع اندلسی مردوں اور عورتوں کو پادری بپتسمہ دے رہے ہیں۔ نئی عیسائی حکومت نے تمام مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ باقی یورپیوں کی طرح نہانا ترک کر دیں۔

1867 عیسوی میں فلپ دوئم نے الحمرا کے تمام حمام توڑ ڈالے کہ مفتوح مسلمان نہانے سے باز آئیں۔ زوالِ غرناطہ کے بعد وہ بے چارے ناکام گوریلا لڑائیاں لڑتے پھرے۔ مارے گئے۔ مراکش جلاوطن ہوئے۔ باقی ماندہ کو زبردستی بپتسمہ دیا گیا اور وہ مسیحی آبادی میں مدغم ہو گئے۔ مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک ہسپانیہ کو یورپ کا دانش کدہ اور زرخیز ترین ملک بنائے

رکھا۔ اُن کے خاتمے کے بعد اُندلس ایک بار پھر صحرا میں تبدیل ہوا۔ نہریں اور کھیت خشک۔ مدارس ویران۔ نئے مفلوک الحال عیسائی ہسپانوی قسمت آزمائی کے لیے سمندروں پر نکلے۔ بہت جلد بحیثیت ایک بددماغ بے رحم امپریل بحری طاقت اپنے عرب ورثے کا غرور اور بانکپن اور موسیقی اور موریش طرزِ تعمیر ساتھ لیے وہ دنیا پر چھا گئے۔ مشرق میں گوا اور فلپائن، شمالی امریکہ میں فلوریڈا مغربی صحرا، کیلی فورنیا، میکزیکو، جزائر غرب الہند، سال جنوبی امریکہ۔——

سیاہ چشم ٹی وی اسٹار اور میڈے والا ہسپانوی فادر دونوں اپنے اس عرب ورثے سے لاعلم اور بے نیاز ہیں۔ عرب امیج اس وقت یہ قمار باز پٹرو ڈالر چی اور چونچ نما نقاب پہنے اُن کے حرم کی عورتیں دُنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

گلِ آفتاب

اسپینش فادر کے عقب میں ایک فربہ اطالوی بیٹھا ہے (اس کی قوم نے مارٹن لوتھر پیدا کیا تھا) اس کے ہاتھ میں جرمن رسالہ ہے اور رسالے کے سرورق پر ایک دوسرے درجے کی طاقت برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ اپنی عمر سے سترہ سال چھوٹے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک کشتی کے ڈیک پر شمس خوری میں مصروف ہے۔

مارگریٹ کی طلاق پر تہلکہ نہیں مچتا۔ ہنری ہشتم نے بسلسلہ شادی و طلاق پاپائے روم سے "کٹی" کر کے اپنا ڈیڑھ انچ کا گرجا الگ بنالیا تھا تو سارے یورپ میں ذہنی زلزلہ آ گیا۔ کیتھولک چرچ کی زیادتیوں کے خلاف پروٹسٹنٹ یعنی پروٹسٹ کرنے والے انگریز کیتھولک ہسپانیہ کو بحری شکست دے کر دُنیا کو مسخر کرنے نکلے۔ المانوی شورشِ اصلاحِ دین کے مفید نتائج سے بہرہ ور ہو کر ولندیزیوں نے کشور کشائی شروع کی۔ پروٹسٹنٹ مذہب نے ورک اسحھک، سخت کوشی، محنت، ضمیر پرستی اور فرد کی آزادی پر زور دیا۔ نشاۃ ثانیہ کی ولولہ خیزی پروٹسٹنٹ ورک اسحھک، نیا ذوقِ تجسس، عقلیت پرستی۔ چنانچہ دورِ جدید ایلزبتھ اوّل کے وفادار امیر سر والٹر ریلے نے امریکہ میں برطانیہ کی پہلی نوآبادی 1607 عیسوی میں اپنی ورجن کوئن کے نام پر ورجینیا آباد کی تھی۔ عہدِ ایلزبتھ میں برطانوی پارلیمنٹ کی مذہبی اصلاحات کو ناکافی سمجھنے والے PURITAN لوگ مذہبی بدعتوں کے مکمل خاتمے کے خواہاں۔ گویا وہابی۔ لہٰذا کاؤنٹرز ریفارمیشن کے مظالم سے عاجز آ کر برائے حصولِ آزادیٔ افکار و ضمیر ایک سو دو پروٹسٹنٹ مہاجر 1620 عیسوی میں بروز 5 اگست سے فلاور نامی جہاز پر (مے فلاور انگریزی میں گلِ آفتاب کا نام ہے اور انگلش موسمِ بہار میں کھلتا ہے) پینسٹھ دن بعد بروز 21 ستمبر امریکہ کا سرسبز مشرقی ساحل۔ امریکن خزاں کے شاندار رنگوں سے معمور اور سُرخ فام اصلی امریکن اپنی جنت میں بیٹھے مزے سے تمباکو کا دھواں

اُڑا رہے تھے۔

سفید دیو جہاں پہنچا تیتو بر باد ہوئے۔ چین، سارا مشرق۔ سارا امریکہ اور وہ سترھویں صدی تھی اور سفید ساحر ساری دُنیا پر اپنا منتر پھونکنے نکلا تھا۔

گو اس کشتی پر سوار اُصول پرست انگریزوں نے آزادیٔ ضمیر کی خاطر وطنِ عزیز ترک کیا۔ سے فلاور کے یہ مسافر پلگرم فادر کہلائے۔ نیز "ریڈ انڈین" کے ہر اسکول کا بچہ جانتا ہے۔ ڈون کرسٹفر کولمبس انڈیا کی تلاش میں امریکہ جا پہنچا تھا اور وہاں کی آبادی کو "انڈین" سمجھا تھا۔

یہ وہابی پلگرم فادر اپنے ساتھ کنگ جیمز بائبل لائے تھے جو پروٹسٹنٹ انجیل نو سال قبل چھپی تھی۔ جرمنی کے مارٹن لوتھر نے مذہب کو کیتھولک پاپائے روم اور پادریوں کے شکنجے سے آزاد کرایا تھا۔ چرچ میں عبادت پُر اسرار مذہبی رسوم کی ادائیگی پر مبنی تھی۔ سادگی پسند پروٹسٹنٹ مذہب میں منبر پر کھڑا اخلاقیات کا درس دینے والا واعظ اہم قرار پایا۔ (بلی گراہم اسی پروٹسٹنٹ روایت کی دین ہے اور بلی گراہم صرف امریکہ میں پیدا ہو سکتا تھا)۔

کنگ جیمز بائبل بہت جلد انگریزی ادب کا سنگِ میل بنی۔ جب پلگرم فادر امریکہ پہنچے ولیم شیکسپیئر کی وفات کو صرف چار سال ہوئے تھے۔ "اسی دوسرے باغ عدن نصف فردوس" انگلستان میں آمریت پسند چارلس اوّل کے وفاداروں اور جمہوریت پسندوں کی خانہ جنگی کے دوران مزید جمہوریت پسندوں نے امریکہ پہنچ کر نیو انگلینڈ بسایا۔

سترھویں صدی کے نصف اوّل کی کیتھولک پروٹسٹنٹ جنگوں میں کام آنے سے بچنے کے لیے جوق در جوق اہلِ یورپ شمالی امریکہ پہنچا۔

سترھویں صدی میں یورپ اور انگلستان کے باشندے اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے تھے۔ لیس کے بے حد چوڑے کالروں اور کفوں والے جھال پال کوٹ۔ بے حد وسیع چھجوں کی ٹوپیاں۔ کمال یہ ہے کہ اس قدر مفصل کپڑے پہن کر یہ لوگ کسی ذوق و شوق سے بے تکان لڑتے تھے۔ جہانِ تازہ ڈسکور کرتے تھے اور سائنس کی ایجادات کرنے میں جٹے تھے۔ فرانس اور انگلستان والے امریکہ میں نو آبادیاں قائم کرنے والے ایک دوسرے سے بھڑ رہے تھے۔ غرض یہ

کہ بڑی رونق کا زمانہ تھا۔ اہلِ فرانس نے کینیڈا آباد کیا اور وہاں سے ذرا نیچے آ کر CREAF LAKES کا سارا علاقہ جہاں سے مسی سپی دریا شروع ہوتا ہے۔ اس دریا پر جہاز رانی کرتے وہ جنوب تک جا پہنچے۔ وہاں لوزیانا کی ریاست اور شہر نیو اولینز بسایا۔ شمال مغرب میں ولندیزیوں نے نیو ایمسٹرڈم آباد کیا جسے بعد میں انگریزوں نے چھین کر اس کا نام نیویارک کر دیا اور سب نے مل کر لال بھارتیوں کا بھرتہ بنایا جو ہسپانیوں کے ہاتھوں مارے جانے سے بچ رہے تھے۔ اہلِ ہسپانیہ نے میکزیکو کی قومی تہذیب بالکل نیست و نابود کر دی تھی۔ جس طرح وہ کچھ عرصہ قبل اُندلس کو نابود کر کے آئے تھے۔

انتہائی زرخیز زمین، گھنے جنگلات، معدنیات، ہزاروں میل لمبے دریا، شاداب مرغزار، متنوع قدرتی ذخائر، اور اُن کو کام میں لانے اور ترقی دینے والے جفاکش مہاجرین۔ شمالی امریکہ کی تیرہ برطانوی نوآبادیوں کی دولت تیزی سے بڑھی۔ یورپ کی لڑائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے انگلستان نے اپنی متمول امریکن نوآبادیوں پر مزید ٹیکس لگائے۔ چائے پر محصول عائد کیا، تو انگریز نژاد امریکنوں نے بھنا کر ساری چائے بوسٹن کی بندرگاہ میں پھینک دی تو دیکھو کہ چائے کی پیالی سے طوفان اُٹھا اور امریکن جنگ آزادی شروع ہوئی اور 19 اکتوبر 1781 عیسوی کے روز انگریز جنرل کارنوالس نے ہتھیار ڈالے —— مگر یہ بھی دیکھو اور عبرت پکڑو کہ عین اسی زمانے جب برطانیہ نے امریکہ کو کھویا، ایسٹ کمپنی کا رُخ صلیب اور سُرخ و سفید دھاریوں والا پرچم اہلِ ہند کی نااہلی اور نفاق کے سبب سرزمین ہند میں نصب کیا۔ ٹیپو، جنرل واشنگٹن وغیرہم سے زیادہ جری تھا مگر مرہٹے تو خیر مرہٹے تھے خود نظامِ دکن اس کے خلاف انگریزوں سے جا ملے۔

اور یہ بھی دیکھو کہ پروٹسٹنٹ مشنری اسپرٹ اور واعظ کے تبلیغی جوش سے سرشار بائبل سنبھالے امریکن مرد اور عورتیں چند سال کے اندر اندر اوائل اُنیسویں صدی میں اسکول اور میڈیکل کالج قائم کرنے برطانوی ہند پہنچنے لگے۔

امریکن انقلاب فرنچ انقلاب کا پیش رو تھا۔ ''آزادی-مساوات اور اخوت'' اور امریکن تمول کے چرچے یورپ میں شروع ہو چکے تھے۔ زارشاہی روس اور پولینڈ کے مظلوم

یہودی۔ مفلس سسلی اور آئرلینڈ اور یونان اور البانیہ کے کسان، سارے پریشان حال یورپ کے غربا اور مساکین، یا ایڈونچر کے خواہاں، یا جرائم پیشہ بدمعاش اور اُن کے علاوہ دانشور، اصول پسند، سیاسی آئیڈیلسٹ، ضمیر پرست، سبھی انیسویں صدی میں ''بہترین مواقع کی سرزمین'' کا رُخ کرتے ہیں۔ ایک انگریز آرٹسٹ فورڈ میڈوکس براؤن دل دوز تصویر بناتا ہے۔ ہَوا کے تھپیڑوں کے مقابل ایک اُداس انگریزی کنبہ کشتی میں بیٹھا دُور کی سفید چٹانوں کو آخری بار دیکھ رہا ہے اور بیسویں صدی میں آمریت اور فسطائیت اور نازیوں سے پناہ لینے کے لیے یورپ کے دانشور اور سائنس داں بالخصوص اُمتِ موسیٰ کے جرمن اہلِ علم و فضل کی ایک اور دل دوز تصویر ہے کہ البرٹ آئن سٹائن۔ سر پر جھوّا بال۔ معصوم سوئٹ چہرہ، دایاں ہاتھ اُٹھائے حلف وفاداری لے رہے ہیں۔

(مَیں نے اس آواز دینے والے کو دیکھنے کے لیے منہ پھیرا۔ اس کے سر کے بال سفید اون بلکہ برف کی مانند سفید تھے) یوحنا عارف نے کہا——

خداوند خدا نے انجیل مقدس میں فرمایا:

''میں اس زندگی کے درخت میں سے جو خدا کے فردوس میں ہے پھل کھانے کو دوں گا''—— گوڈز اون کنٹری۔

لیکن حبشیوں کے لیے نہیں۔

یوحنا نے اپنے مکاشفے میں دیکھا اور تخت کے سامنے آگ کے سات چراغ جل رہے ہیں اور اس کے سامنے گویا شیشے کا سمندر بلور کی مانند ہے اور تخت کے بیچ میں اور تخت کے گرداگرد چار جاندار ہیں اور چوتھا اُڑتے ہوئے عقاب کے مانند ہے اور ان چاروں کے چھ چھ پَر ہیں اور چاروں طرف اور اندر آنکھیں ہی آنکھیں اور جب مَیں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان پر ایک عقاب کو اُڑتے دیکھا اور بڑی آواز سے یہ کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آواز کے سبب سے جن کا بجنا ابھی باقی ہے۔ زمین پر رہنے والوں پر۔

مے فلاور بادبان پھیلائے ساحل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک پلگرم فادر نے اپنی نئی نویلی پروٹسٹنٹ انجیل میں یوحنا کے مکاشفے کی تلاوت کرتے کرتے آسمان پر نظر ڈالی۔ اس اُمید پر کہ

شاید ان رو پہلے بادلوں پر سوار مسیح ناصری ابھی واپس آتا ہو، وعدے کے مطابق —— لیکن آسمان پر ساحلی پرندے اُڑ رہے تھے اور اُڑن ہاتھی بھی ابھی غیب میں تھے۔

تب میں نے نیچے اُترتے ہوئے اُڑن ہاتھی پر سے سمندر کی طرف نگاہ کی جہاں فلک شگاف شہر نیو یارک دُور دُور تک پھیلا تھا اور اونچے پلوں کے نیچے سے جہاز گذر رہے تھے اور بندرگاہوں میں ہزار ہا بادبانی ڈونگیاں اور موٹر کشتیاں جگمگا رہی تھیں۔ دھند لکے میں مجسمہ آزادی کا ایک بار چمکا۔ مسافروں نے موسیقی کے سماعت کے آلے کانوں سے علاحدہ کیے۔ کانوں میں نرسنگے کا پھونکا جانا ابھی باقی ہے۔

ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آواز جن کا پھونکا جانا ابھی باقی ہے۔ اس زمین کے رہنے والوں پر افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔

پہلا افسوس: مسیح ناصری کی دوبارہ آمد کے منتظر اور ظہور امام مہدی آخر الزماں کے منتظر اس زمین کے باسیوں کے درمیان عنقریب صلیب و ہلال کی معرکہ آرائی شروع ہونے والی ہے۔

دوسرا افسوس: جنوبی اصطباغی دین دار خدا پرست عیسائی صدر جمہوریت اور مادّیت پرست روس کے مابین سرد جنگ کا آغاز۔

تیسرا افسوس: آلِ اسمٰعیل اور آلِ اسحٰق کے بیچ خونریزی بدستور جاری ہے۔ الاماں۔ الاماں۔ الاماں۔

تب کینیڈی ایئرپورٹ سے لاگارڈیا کے لیے ٹیکسی میں سوار کراتے ہوئے موٹے سادہ مزاج امریکی افسر نے گھڑی دیکھی اور بولا —— "پولیش رائٹرز کا پلین وارسا سے چند منٹ میں پہنچنے والا ہے اب مجھے اُن کا استقبال کرنا ہے —— "گویا آمد و رفت تک آرتھی کے دور میں ممکن نہ تھی لیکن ساری دُنیا ایک بار پھر تلوار کی دھار پر سے گذرنے والی ہے۔

"اب تو ہمارا پوپ بھی پول ہے۔" موٹے افسر نے لفظ پوپ ادا کرتے ہوئے تعظیماً ہاتھ جوڑے وہ غالباً نیویارک آئرِش تھا۔

مغرب کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ لڑائیاں خواب و خیال ہوئیں (آئرلینڈ کا قصہ دوسرا

ہے کہ وہاں نہ ریفارمیشن آیا نہ صنعتی انقلاب) چار سو سال قبل چیر وبیٹ فادر لالولا نے یورپ میں اینٹی ریفارمیشن تحریک چلائی تھی۔ سارے براعظم میں ہزار ہا پروٹسٹنٹوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ آج سارے مغرب میں (مع امریکہ) اس کیتھولک رہنما کے نام پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ پروٹسٹنٹ ان کے سامنے دھرنا نہیں دیتے کہ یونیورسٹی کا نام بدلو۔ لیکن ہمارے ہاں ہندو مسلم شیعہ سنی فسادات کیوں نہ جاری رہیں۔ ہم کوئی بے حیا۔ بے دین مغربی تھوڑا ہی ہیں۔

شکاگو کیتھولک آئرش پولستانیوں ہسپانیوں وغیرہ کا دوسرا بڑا شہر اور ہر دنیا کا مصروف ترین ایئرپورٹ جہاں ہر ایک منٹ پر ایک طیارہ اُترتا اور ایک پرواز کرتا ہے، وقفے وقفے سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جا رہا ہے ــــ ''ایک مذہبی ٹولی صدر دروازے کے باہر مسافروں سے چندہ وصول کرنے کے لیے مستعد ہے۔ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اس طیران گاہ کا ان چندہ بٹورنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

چندہ بٹورنے والے ''ہرے کرشنا ہرے راما'' کے امریکن لڑکے لڑکیاں گیروا دھوتیاں اور ساریاں پہنے باہر بے تکان کیرتن گا رہے ہیں جہاں کنکریٹ کے میلوں طویل پیچ دار پلوں والے مسقف کار پارک کے اندر کھڑی ہزار ہا کاروں سے اُتر کر بڑھیا کپڑے پہنے بڑھیا سوٹ کیس سنبھالے ہزاروں ہزار مسافر خاموشی سے اندر جا کر ایئرپورٹ کی قالینوں سے آراستہ فرلانگوں، طویل راہ داریوں سے گزرتا، جھلملاتی پُر تکلف لاؤنجوں اور ریستورانوں میں انتظار کرتا، کمپیوٹرز پر طیاروں کی آمد و رفت کے اوقات دیکھتا۔ سُرخ قالینوں سے آراستہ امیر جیٹی کی مسقف گیلریوں کے دروازوں سے جٹ طیاروں پر سوار ہو کر سارے ملک کی عین مین اسی قسم کی دوسری طیران گاہوں کی طرف جانے میں مصروف ہے۔ وہ دھوتی پوش نوجوان اس اشیا پرست ٹیکنولوجی کل معاشرے کو مسترد کر کے بندرابن فینسی سے مسحور ایسی طیران گاہوں سے اُڑ کر ہزاروں میل دور متھرا ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے، وہاں کے افلاس، بھکاریوں، غلاظتوں، گل غباڑے، گرمی، بندروں، ہانپتے ہوئے فاقہ کش قلیوں، پلاسٹک کے بھدے کھلونے، بیچتے غریب خوانچہ فروشوں، غربت زدہ نحیف لاغر، فرسٹریٹیڈ مسافروں سے کھچا کھچ بھری بدبودار

ٹرینوں کی ساری مادی حقیقت کو یکسر نظر انداز کر کے مہامنتر جپتے وہ نوجوان امریکن بندرابن جا رہے تھے۔

جبکہ کرشنا کے دُکھی فلاکت زدہ دیس کے باسی امریکہ کے سپنے دیکھ رہے ہیں۔

ٹرینیں امریکہ میں تقریباً عنقا ہو گئی ہیں۔ ساری آبادی بذریعہ ہوا اور کار رواں ہے۔

شکاگو سے تیسرا طیارہ برائے سیڈر ریپڈز امریکن مڈویسٹ۔ اُفق تا اُفق پھیلی جھیلیں مکئی کے زرد کھیت۔ سپاٹ میدان۔ دریا۔ جنگل۔

سیڈرریپڈز کی چھوٹی سی طیران گاہ کے گورے ہجوم میں صرف ایک سانولا آدمی نظر آیا۔ سر پر جھوابال۔ ستواں ناک۔ ذہین چہرہ۔ ساتھ جینز میں ملبوس ایک سانولی نوعمر لڑکی۔ وہ افریقی چھپائی کے کُرتے میں ملبوس تھا مگر اپنے جھوابالوں کے باوجود بلیک امریکن یا مخلوط النسل امریکن یا افریقی معلوم نہ ہوتا تھا۔

اس نے کہا —— ''میرا نام پیٹر ناضرۃ ہے۔ میری لڑکی کیتھرین۔ آیووا سٹی سے آپ کو لینے آیا ہوں۔ آئی ڈبلیو پی کے اسٹاف پر ہوں اور یونیورسٹی میں جدید افریقی ادب پڑھاتا ہوں۔ آپ کو انگریزی میں کافی پڑھا ہے اور آپ کے متعلق کلاس میں لکچر بھی دیے ہیں۔

''لیکن تم بلیک امریکن تو نہیں لگتے۔''

''یوگنڈا کا رہنے والا ہوں۔''

''تم افریقی بھی نہیں لگتے۔ شکلاً ہندستانی معلوم ہوتے ہو۔''

''میرے والد گوا سے یوگنڈا چلے گئے تھے۔ 61 عیسوی میں مَیں انگلینڈ گیا۔ میں اور میری بیوی برطانوی شہری ہیں۔ عیدی امین کی وجہ سے یوگنڈا واپس نہ جاسکے۔ یہاں آگئے۔ یوگنڈا کے متعلق میرے دو سیاسی ناول یہاں سے شائع ہو چکے ہیں۔''

گھُپ اندھیری رات میں پیٹر کار ایکسپریس وے پر لے آیا۔ بے حد طویل جہازی فولادی مال بردار ٹرک ان گنت سُرخ بتیوں سے معمور مبادا اندھیرے میں کاریں ان سے ٹکرا نہ جائیں، زائیں زائیں برابر سے گذر رہے تھے۔ تیس میل بعد آیووا سٹی کی...... ان گھپ اندھیری

راتوں میں تین چار سو سال پہلے فرانسیسی نوآبادکار اپنی ڈونگیوں پر تجارت کا مال لادے لشم پشتم چرخ چوں اپنی ایک ٹریڈنگ پوسٹ سے دوسری کی طرف جا رہے ہیں۔ سُرخ ہندستانیوں کے خیموں میں پہنچ کر ان سے لین دین میں مصروف ہیں اور اُن سے یہ زمینیں بھی چھین رہے ہیں۔ (آیوا بھی ریڈ انڈین نام ہے)۔ آیووا ندی کے نزدیک نارتھ ڈوبیوک اسٹریٹ اور آخر اٹھارویں صدی میں جولین ڈوبیوک فرانسیسی نے مزید علاقے سُرخ فام قبائل سے حاصل کرکے جستے کی کانیں دریافت کی تھیں — بل بل چھن چھن اہلِ مغرب ساری دُنیا پر چھائے جا رہے ہیں۔

شاہراہ نارتھ ڈوبیوک پر سے زناٹے سے کاریں گذرتی جاتی ہیں۔ اس کے کنارے پارک کے مقابل مے فلاور اپارٹمنٹس کی پلیٹ گلاس بیرونی صدر دروازے کے نزدیک گل آفتاب کی تصویر۔ عمارت کے کونے پر پیٹر کے گراؤنڈ فلور فلیٹ کے اندر خلیق میری خوش مزاج ناضرت کھانا پکانے میں مصروف۔ چہرے پر شرارت۔ اس کے والدین گوا سے تنزانیہ چلے گئے تھے۔

ٹیلی فون پر بات کرکے پیٹر نے میری سے کہا۔ "شاؤشن۔ پیکنگ سے کل صبح پہنچ رہے ہیں۔" میں نے میز پر رکھے اخباروں پر نظر ڈالی۔ 17 اگست کے ضخیم نیویارک ٹائمز کے ایک صفحہ پر پال اینگل کی تصویر کے نیچے لکھا تھا "مارک ٹوئن کے دریا پر مارکسسٹ اور غیر مارکسسٹ چینیوں کی دعوت۔ آیووا سٹی کے مشہور انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام میں چینیوں کے علاوہ اس سال اسرائیل، جورڈن، مصر، کولمبیا، ہندستان، آئرلینڈ، ہنگری، پولینڈ، اسپین اور ہسپانوی، پرتگالی زبانوں میں لکھنے والے جنوبی امریکن ادیب اُندلس کے ادیب اور شاعروں کی ٹریجڈی سے لاعلم اور بے پرواہ۔ بہت بڑا فاصلہ تھا۔ اور پیٹر اور میری ناضرت کی جن کی زبانیں انگریزی اور پرتگالی اور کونکنی وہ بھول چکے تھے۔

چند سال ہوئے کنڑ ادیب یو آر اننت مورتھی نے لکھا تھا: "حیرت ناک بات یہ ہے کہ جدید ہندستانی ذہن اوریجنل نہیں رہا۔ ہماری ہر چیز مغرب کی نقالی ہے۔ خود اپنی پرانی تہذیب کی جدید

کے رویے کا محرک بھی مغرب ہی تھا۔"

"اور تم لوگ ـــــ" میں نے کھانا کھاتے ہوئے پیٹر سے کہا۔"زوالِ غرناطہ کے بعد کی اس سپینی ہسپانوی توسیع کی یادگار ہو۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے سارا مشرق مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے اور اب اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا، وہ جو لطیفہ تھا کہ مہاتما گاندھی مائیکروفون پر قدیم ہندی رام راج اور گاؤں کی غیر مشینی تمدن کا راگ الاپتے تھے۔ ملّا شیخی ٹیلی ویژن پر ساتویں صدی کا پرچار کر رہے ہیں۔ جہد البقا میں یہ لوگ ہم سے سبقت لے گئے۔ ہم لوگ جذبۂ تجسس کھو چکے تھے۔ یہ لوگ نشاۃ ثانیہ سے لے کر آج تک متحیر ہیں۔ پیہم سوالات کر رہے ہیں۔ سوچ رہے ہیں، کرید میں لگے ہیں۔ اسی وجہ سے اوریجنل باتیں سوچتے ہیں۔ نت نئے سے فلاورز پر سوار نئی دُنیا کی طرف مسلسل سفر میں ہیں۔"

فون کی گھنٹی پھر بجی۔

مشرق میں ان مغربی ایجادات کا استعمال کرتے ہوئے جن کو یورپین سامراج نے وہاں متعارف کیا۔ ہم اپنے دل کو خوش کرنے کو قدیم ہندو اور میڈیول عرب سائنس دانوں کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن پچھلے سات سو سال میں ہم نے خود کیا ایجاد کیا؟

پیٹر میز پر واپس آیا۔"کل صبح ڈاکٹر نادیا بشائی اسکندریہ سے پہنچ رہی ہیں۔ عربی اُن کی مادری زبان ہے مگر انگریزی میں شاعری کرتی ہیں۔ وہی معاملہ کہ تیسری دنیا کا ادیب بیک وقت دو ذہنی کائناتوں میں زندہ ہے۔ مغربی زبانوں میں لکھتے ہوئے کیا اپنے اندرونی شخصی نسلی اور قومی لاشعوری رویے بدل جاتے ہیں؟"

"لیکن شاعری کی تو یونیورسل زبان ہے۔"

میری بولی۔

"نادیا بشائی قبطی نام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قبطی۔ عربی۔ انگریزی رویے۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔

صورِ اسرافیل

ڈاکٹر نادیا یازی بشائی کچن کی میز صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ''لندن یونیورسٹی سے میں نے انگریزی شاعری کی میوزیکل بنیادوں پر کام کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کیا۔ اب جامعہ اسکندریہ کے شعبۂ انگریزی کی صدر ہوں۔ انگریزی میں نظمیں لکھتی ہوں۔ فرنچ اور ہسپانوی جانتی ہوں۔ میرے علاوہ مصر میں اور کوئی انگریزی میں شاعری نہیں کرتا۔''

''واقعی؟—'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''میں کونسرٹ پیانوسٹ بھی ہوں۔ دراصل میں اپنی کوالی فیکیشنز کے لحاظ سے مصر میں منفرد ہوں۔''

''مصر تو بہت ترقی یافتہ ملک ہے۔ یقیناً تمھاری طرح کی بہت سی خواتین وہاں ہوں گی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر بشائی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ''میں منفرد ہوں''۔

انکسار عزیزہ نادیا کی کمزوری نہیں تھا۔

میں برتن سجانے میں منہمک رہی۔ میرا اور اس غیر معمولی قبطی خاتون کا مشترکہ باورچی خانہ ہمارے کمروں کے وسط میں واقع تھا۔ ے فلاور کی مختلف منزلوں پر بالکل اسی طرح کے دوہرے اپارٹمنٹس میں ساری دُنیا کے ادیب سیڈر ریپڈز سے آ آ کر سیٹل ہونے میں مصروف تھے۔

''مصر کے کتنے قبطی ہوں گے؟'''' میں نے دریافت کیا۔

''آبادی کا بہت بڑا تناسب ہے۔ لیکن مردم شماری میں اُن کی تعداد بہت قلیل بتائی جاتی ہے۔'' نادیا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ''بہت سے قبطی ان ہی وجوہات کی بنا پر مصر سے ہجرت کر رہے ہیں۔'' ایک مذہبی اقلیتی فرقے کی نفسیات اور مسائل ہر ایک ملک میں یکساں ہیں۔

نادیا نے سانج تلنے کے لیے کڑھائی چولہے پر رکھی اور اپنے کمرے میں گئی۔ میں اپنے بیڈروم میں آ کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی جہاں پارک لینڈ میں سے گذرتی دریائے مسی سپی کی شاخ آیوواندی کے پل پر یونیورسٹی کی فری بسیں آ آ کر رک رہی تھیں۔

اچانک میرے کمرے میں دیوار میں نصب ٹیلی فون کے اوپر لگے ایک لاؤڈ اسپیکر میں زوردار سائرن سا بجنے لگا۔ میں نے اس لاؤڈ اسپیکر کو اب تک نہ دیکھا تھا۔ سوچا شاید اندرونی ریڈیو سسٹم ہے۔ خراب ہو گیا ہے۔

صورِ اسرافیل چند منٹ تک بجا کیا پھر آپ سے آپ بند ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں اخبار لانے کے لیے (جو ساری عمارت کے کرائے داروں کے لیے مفت رکھے ملتے تھے) نیچے جا رہی تھی۔ لفٹ میں ایگنیس مل گئیں۔ ایگنیس ہنگری کی مشہور شاعرہ تھیں۔ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی۔ پلیٹینم بلونڈ بہت پریشان نظر آتی تھیں کہنے لگیں "کیا تمھارے بیڈروم میں بھی ایک دم زور کا بھونپو بجنے لگا ہے۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا سی آئی اے نے یہ فلیٹ BUG تو نہیں کر رکھے ہیں۔"

ایگنیس ہرگز نہ ہنسیں۔ سنجیدگی سے بولیں۔ "میں ابھی کھانا پکا رہی تھی۔ زور سے بھونپو بجا۔ میں نیچے عمارت کے دفتر میں پوچھنے گئی کہ یہ کاہے کا الارم سسٹم ہے۔ انھوں نے بتایا SMOKE DETECTOR چولہے پر کوئی چیز ذرا سی بھی جلنے لگے۔ فوراً بجتا ہے۔ تب چولہے پر لگا اُن دیکھا پنکھا چلا دینا چاہیے۔ اور کچن کی چلمچی میں سارا کچرا ڈال کر ایک بٹن دباؤ گھڑ گھڑ سارا کچرا غائب۔ کل صبح میری ناضرت مجھے یہ سب سمجھا گئی تھی۔ مگر یہ دھوئیں کا بھونپوا سے یاد نہ رہا۔ اس قدر ٹیکنولوجی حد ہے۔"

"صورِ اسرافیل۔" میں نے کہا۔ "کیا۔؟"

"قربِ قیامت کے آثار — لیکن سوشلسٹ ملکوں میں تو قیامت آنے کی ہی نہیں —" میں نے جواب دیا۔

"ہائی فوکس HI FOLKS" تیسری منزل پر لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے اینڈ و ایگر میریا کے ہنس مکھ ارشویند و نے میری بات کاٹی۔ تین دن میں وہ بے حد امریکن ہو چکا تھا۔

میپل کا درخت

''میں سیڈر ریپڈ کے ایک جرمن نژاد کسان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔'' پال اینگل نے کہا۔

''کالونسٹ کیا مطلب؟'' ارشوبندو نے دریافت کیا۔

''جان کالون سولھویں صدی فرانس کا ایک پروٹسٹنٹ ریفارمر تھا۔ اس نے محنت اور عمل پسندی پر زور دیا تھا۔ یہ ساری زراعتی بائبل بیلٹ ہم جیسے لوگوں سے آباد تھی۔ مذہب، قدامت پرست محنتی، بات کے کھرے اور اصول پسند اور جمہوری۔ میرے والد گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ گاڑی میں جتنے والے گھوڑے، بار برداری اور شہسواری کے گھوڑے، میرا چچا ریس کے گھوڑے بیچتا تھا۔ میں گھوڑوں کی اس دنیا میں پروان چڑھا۔ جب آٹوموبائل کی دنیا ابھی نوزائیدہ تھی۔

لڑکپن میں صبح صبح میں اپنے باپ کے دو ویگن تنہا ہانک کر ٹیلی فون کمپنی لے جاتا۔ راستے میں ریل کی پٹریاں پڑتیں۔ ایک گاڑی بائیں ہاتھ سے ہانکتا اور دوسری دائیں سے۔ جب سامنے سے ٹرینیں گذرتیں مجھے بہت ڈر لگتا۔ کیونکہ اگر اس وقت انجن سیٹی بجاتا تو دونوں گھوڑے بدک جاتے تھے۔ دوپہر کو میں اخبار بیچتا، کڑکڑاتے جاڑوں میں گھر گھر جاتا۔

سیڈر ریپڈز میں ایک پرانی وضع کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ سیڈر ریپڈ زگزٹ بیچنے میں وہاں بھی جاتا۔ اس ہوٹل میں چند لڑکیاں رہتی تھیں۔ اُن کا بظاہر کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا نہ کوئی مشغلہ یا ملازمت، کیونکہ جب میں اخبار لے کر وہاں جاتا تو صبح کے ساڑھے دس بجے وہ اپنے اپنے کمروں میں محوِ خواب ہوتیں۔ میں سمجھتا کہ وہ بہت ہی اہم ہستیاں ہوں گی جو بجائے کام دھام کرنے کے دن چڑھے پڑی سویا کرتی ہیں۔

جب میں کالج پہنچا اور رہوڈز وظیفے پر آکسفرڈ گیا وہاں کی زندگی ہمارے زراعتی جمہوری آیووا سے کس قدر مختلف تھی۔ پُرتکلف اور طبقاتی درجہ بندیوں کی پابند۔ انگلش طبقاتی نظام مجھے بہت عجیب معلوم ہوا۔ چند سال میں جرمنی میں رہا۔"

"کرسٹفر اشروڈ کی جرمنی۔۔" میں نے کہا۔

ہیمنگوے اگر ٹروڈ اسٹین، ایذرا پاؤنڈ کا یورپ، امریکن ادیبوں کا تیرتھ استھان پیرس تھا۔ جبکہ ایلیٹ اپنے آپ کو پکا انگریز بنا چکے تھے۔ اس زمانے کے متعلق کتنا لکھا گیا ہے۔ فلم بنے ہیں۔ ایک پوری دیو مالا تیار ہو چکی ہے۔

کھانے کے کمرے کی دیوار پر وہ چپوار آویزاں تھی جس کے ذریعے نوجوان پال اینگل آکسفرڈ کیمبرج بوٹ ریس میں اپنی ناؤ کھیلتے تھے۔

آج کی نسل کا مشہور شاعر مارون بل 79 عیسوی کی اس شام "اینگلز بالکنی" کے جنگلے سے لگا دوسرے مشہور شاعر اسنوڈ گراس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس لیے کہ گر ٹروڈ اسٹین اور ایلیٹ اور پاؤنڈ ایک موضوع بن چکے تھے۔ پال اینگل کی نوعمری کے دنوں میں وہ بھی مارون بل اور اسنوڈ گراس کی طرح اپنی دنیا میں مگن رہے ہوں گے۔ اب وہ جیتے جاگتے انسان نہیں تھے۔ نظریوں اور حوالوں اور مقالوں اور کتابوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

پُرسکون اور خاموش آیووا سٹی کی اس سنہری شام سے فلاور کے عقب میں ایک ہری بھری پہاڑی پر استادہ پروفیسر پال اینگل کے دو منزلہ مکان کی چوڑی بالکنی میں چھتنار میپل کے نیچے دنیا کے بائیس ملکوں سے آئے ہوئے ادیب و شاعر اپنے اپنے وقت میں زندہ اسی طرح غائب ہوتے جائیں گے۔ میپل کا درخت اپنی پتیاں گرا رہا ہے۔ وہ ساری بالکنی پر اُڑتی پھر رہی ہیں۔ لیکن کینڈا کا قوف گیت "میپل کا پتہ ہمیشہ ہمیشہ بھی صحیح ہے اور ایک ہزار سال قبل اندلس مسلمان شاعرہ ولادۃ بنت المستکفی کے سالوں میں اسی طرح ادیبوں کا جم گھٹ ہوتا ہوگا اور اس کی بالکنی کے نیچے کوچہ گرد گویے نغمہ سرا۔ سامنے آیوا ندی پر سورج ڈوب رہا ہے۔

ہسپانیہ بھلائے نہیں بھولتا۔ اسپین کا بانکا نوکیلی سوچھوں والا سانچیز البیسپر یسو سامنے

کی میز پر کولمبیا کی شاعرہ اولگا سے بزبان ہسپانوی مصروف گفتگو تھا۔ ڈرائنگ روم کے اندر اسٹیریو پر چینی موسیقی بج رہی تھی۔ نیچے باغ کی سڑک پر چینی سنگی لالٹین نصب تھیں۔ ڈرائنگ روم کی دیوار پر مختلف ملکوں کے ماسک مع کتھاکلی ماسک کے آتش دان کے اوپر مغل پچی کاری کی سرمریں تھالی۔

"یہ تھالی —" پال کی اپنی بیوی ہوالنگ نے مجھ سے کہا — "میں نے آگرے میں دس ہزار روپے میں خریدی تھی جب میں پال کے ساتھ ہندستان گئی تھی۔ وہاں کی غربت اور سماجی حالات دیکھ کر مجھے انقلاب سے پہلے کا چین یاد آیا۔ میں نے ماؤ کی نظموں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ مگر میں لکھتی چینی میں ہوں۔ میرے ناول WOMEN OF CHINA کا یہاں سے انگریزی میں ترجمہ شائع ہوگا۔"

"میرے والد —" ہوالنگ نے دفعتاً اُداس آواز میں کہا۔ "لونگ مارچ کے دوران مارے گئے تھے۔ 47 عیسوی میں میں تائیوان چلی آئی۔ 63 عیسوی میں پال تائیوان گئے تھے۔ وہاں مجھ سے ملاقات ہوئی۔ 71 عیسوی میں ہم نے شادی کی۔"

"ہوالنگ بے حد حسین لڑکی تھی۔" پال بولے۔ "اور جب میں اس سے ملا یہ بحیثیت ناولسٹ تائیوان میں مشہور ہو چکی تھی۔ پال ہوالنگ پر عاشق تھے۔ 37 عیسوی میں جرمنی سے واپس آکر پال اس یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے لگے۔ پھر اپنے (CREATIVE WRITING) کے کورس کو انھوں نے 41 عیسوی میں رائٹرز ورک شاپ میں تبدیل کیا جو ساری دُنیا میں مشہور رہوئی۔ شیورز، فیلسی ولیمز، فلپ روتھ سب اسی ورک شاپ سے پڑھ کر نکلے۔ 66 عیسوی میں پال ریٹائر ہوئے۔ وہ ورک شاپ اب بھی جاری ہے۔ جب میں امریکہ آئی پال ریٹائر ہونے والے تھے۔ میں نے اسی سال ان سے کہا کیوں نہ ہم لوگ ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال کیا کریں۔ جہاں سارے ملکوں کے ادیب یہاں چھ مہینے اکٹھے رہیں۔ اپنی کتابیں سکون سے لکھیں۔ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کریں تو کتنے تعصبات زائل ہوں گے۔ پال نے کہا "تم دیوانی ہو اتنے پروگرام کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ میں نے کہا کچھ لیں گے — تو ہم

نے یونیورسٹی سے کہا یونیورسٹی نے کہا اچھا ایک سال ایسا اجتماع کر کے دیکھو۔ تو ہم نے پہلے سال پندرہ رائٹرز بلائے۔ آٹھ ماہ کے لیے۔ اگلے دو سال تک آٹھ مہینے کا پروگرام رکھا۔ بہت زیادہ مہنگا پڑا۔ اسے چار ماہ کر دیا۔ تعداد بڑھتی رہی۔ اس سال 37 رائٹرز آئے ہیں۔"

"پیسہ کہاں سے آتا ہے؟" — میں نے دریافت کیا۔

"یونیورسٹی صرف اسٹاف کی تنخواہیں دیتی ہے۔ جنوری میں ہوالنگ اور میں کشکول گدائی لے کر نکلتے ہیں۔ ہر سال کے پروگرام میں ڈھائی لاکھ ڈالر خرچ ہوتا ہے۔ پرائیویٹ مخیروں، فاؤنڈیشنوں اور بڑے تجارتی اداروں سے اور انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن سے چندہ لیتے ہیں۔ صبح سویرے پتہ ہے میں کیا کرتا ہوں، میں امریکہ کی تمام فاؤنڈیشنوں کے ہینڈ بکس پڑھتا ہوں اور ان کو خط لکھتا ہوں۔ بعض دفعہ بہت مایوسی ہوتی ہے اور ذلت بھی محسوس ہوتی ہے۔ پچھلے سال میں نے اسّی کارپوریشنوں کو خط لکھے۔ پینسٹھ نے انکار کر دیا۔ پندرہ نے جواب ہی نہیں دیا۔ چند ایک نے چندہ دینے کا وعدہ کیا۔ مگر بارہ سال سے ہم لوگ اسی طرح بھاگ دوڑ کر کے گاڑی چلا رہے ہیں۔ بارہ سال میں دنیا کے چار سو ادیبوں اور شاعروں کو یہاں مدعو کر چکے ہیں۔"

ارجنٹینا کا روڈلفو بانال آ کر بیٹھ گیا۔

"روڈلفو تم بالکل ہالی ووڈ فلم کا ساؤتھ امریکن رومیو یا ویلن لگتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کسی طرح ادیب معلوم نہیں ہوتے۔ یا کسی جنوبی امریکن ملک کے انقلابی ہیرو جو کسی منٹ جیب سے پستول نکال کر چلانا شروع کر دے گا۔"

"یہ بالکنی تو اچھی خاصی پیرس کے بائیں ساحل کا کوئی کیفے معلوم ہو رہا ہے۔" نادیا نے اظہار خیال کیا۔

میں نے نظریں دوڑائیں۔ دریائے سین کا بایاں ساحل اور ادب کا بے حد بایاں بازو — رنگ رنگ کے رائٹر اور اُن کی بیویاں اس وقت وہاں بیٹھے مصروف اکل و شرب تھے۔ ہنگری کے نوعمر میکلوس ہرزاتی، ایگنیس ناگی اور اُن کے شوہر بالا ربنگل بلغاریہ کا نینو نکولوف، پولینڈ کے آرزینڈزرزکی — جولیا ہارٹ وگ، جرزی پرزیدو کی اور مائیکل رونی کو۔ یوگوسلاویہ کا

میتھ جوونسکی۔ مشرقی جرمنی کا وولف گانگ کوبل ہاس۔

''یہ کمیونسٹ ملکوں کے رائٹرز یہاں کیسے آجاتے ہیں۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

پال اینگل نے قہقہہ لگایا۔ موصوف انتہائی خوش مزاج اور زندہ دل بزرگ تھے۔

''میں عالمگیر ادبی منظر سے واقف رہتا ہوں اور وہاں کی ادبی تنظیموں سے رابطہ ہے۔''

باسکے رودلفو نے پھر پوچھا۔ ''مگر دوسری زبانوں کے رائٹرز کی اہمیت کے بارے میں کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔''

''پال چھٹی حس کے مالک ہیں۔'' میں نے کہا۔

پال نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ ایک انوکھا نٹ ورک سا بن گیا ہے۔ بہت سے نام تجویز کیے جاتے ہیں۔ بہت سوں کی چیزیں انگریزی میں بھی چھپ چکی ہیں۔ مثلاً السٹریٹیڈ ویکلی میں تمھاری کہانیاں اور مضامین بھی پڑھے تھے لیکن مجھے کوئی جل نہیں دے سکتا۔''

مجھے یاد ہے 70 عیسوی میں اس پروگرام کے متعلق آپ نے مجھے خط لکھا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''بہت سے ادیب یہاں کافی شک وشبہ کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے ملکوں کا پریس سیاسی وجوہ کی بنا پر کافی اینٹی امریکن ہے۔ چار ماہ اس پروگرام کے لیے یہاں رہ کر اصلیت ان پر خودبخود آشکار ہو جاتی ہے۔ اب یہ ایک ایسا کلب بن گیا ہے جہاں باقی دنیا کے رائٹر جنوبی افریقہ کے کالے ادیبوں سے مل پاتے ہیں۔ اسرائیلی اور عرب، کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ اکٹھے رہتے ہیں۔ جب آپ چار ماہ تک ایک عمارت میں رہیے گا، روز ملیں گے لامحالہ بہت سے تعصبات اور غلط فہمیاں دُور ہوں گی۔ اسی سال پہلی مرتبہ چینی ادیب پیکنگ سے آئے ہیں۔'' پال نے کہا۔

پروفیسر پال اینگل کو 1976 عیسوی کے نوبل پیس پرائز کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔

بہت سے لوگ اندر بار پر جمع تھے۔ ایک حسین مغربی خاتون سُرخ بال، سبز آنکھیں، کھچی رنگ کا فراک، ہاتھ میں جام شراب لیے سگریٹ کے کش لگاتی پال کی میز پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''ہائی لیلی۔'' پال نے خوش دلی سے نعرہ لگایا اور مجھے مخاطب کیا۔ تم ترک ناولسٹ لیلی

اربل سے ملیں؟ یہ آج صبح استنبول سے پہنچی ہیں۔ یہ ترکی کی چھ بہترین ناول نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں اور لیلیٰ تم بھی تو موزلم ہونا؟"

"محض نام کی مسلمان ہوں۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ لیلیٰ نے ذرا رکھائی سے جواب دیا۔ کمال اتاترک کی تخلیق شدہ ترکی کی خاتون۔ اس کے بعد لیلیٰ خاموش رہیں۔ اُن کے چہرے پر ایک خفیف سی اُداسی کی کیفیت طاری تھی۔ ہنگری کی ایگنیس کی موجتی ہوئی اور اسی کی طرح۔ ڈنر کے دوران یونان کے ارگریس ہیولس عرف آری۔ بلغاریہ کے نیتوا اور یوگوسلاویہ کے میتو نے (جو تینوں بے حد ظریف الطبع تھے) لیلیٰ کے سکوت کو توڑنا چاہا۔ طرح طرح سے اُن کو ہنسانے کی کوشش کرتے رہے۔ یونان کے آری نے کہا۔ "لیلیٰ۔ لیلیٰ تم ہماری سابق آقا ہو لیکن ہم تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں ہم تمھارے سابق غلام ہیں۔" کچھ دیر بعد وہ چاروں اکٹھے نظر آئے تو پولینڈ کے مائیکل رودنی کیڑ نے آواز دی۔ "لو صاحب بلقان کانفرنس شروع ہوچکی ہے۔" مائیکل پولینڈ میں فلموں کے لیے بھی لکھتا اور واژدا کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ بے حد طویل القامت تھا۔ اس وجہ سے اسے اب محض پول کہا جا رہا تھا۔

اسرائیل کا جل کٹا سا ادیب اسحٰق اور پاژ جو خود کو لفٹ ونگ کہتا۔ آتش دان کے قریب آکر بیٹھا۔ نادیا قریب سے گذری۔ مائیکل نے اسے پکارا۔ وہ آکر اس گروہ میں شامل ہوئی۔ مائیکل نے اس کا تعارف کرایا۔

"اسحٰق اور پاژ۔"

"نادیا بشائی۔"

دونوں سرد مہری سے مسکرائے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں جاری تھیں۔ کچھ دیر بعد اسحٰق نے نادیا کو مخاطب کیا۔ "حال ہی میں مَیں نے اسکندریہ کے متعلق ایک عرب افسانے کا ترجمہ پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کی زندگی بھی اتنی شائستہ ہے؟"

"آپ کا خیال کیا تھا ہم لوگ وحشی ہیں؟" نادیا نے تلخی سے پوچھا۔ "آپ میری دوست ڈاکٹر حسایا کاف مین سے واقف تھے؟ چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہوگیا۔ شاید وہ بردشلم

میں رہتی تھیں۔" میں نے اخلاقیات کی۔ "جانتا تھا۔ جو مر گیا سو مر گیا۔ اب اس کا ذکر بے کار ہے۔" اسحٰق نے جواب دیا۔ سُنا تھا کہ اسرائیلی بہت کٹر ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو کمال تھا محی الدین ابن عربی۔

کچھ دیر بعد اچانک اسحٰق نے یہودی فلسفی ربی موسیٰ ابن میمون کے متعلق مجھ سے نہایت عالمانہ گفتگو شروع کر دی۔ خود ہی بتایا کہ وہ یوکرین سے بارہ سال کی عمر میں فلسطین آ گیا تھا— عبرانی افسانہ نگار اور تل ابیب کے ایک اخبار کا نیوز ایڈیٹر تھا۔

کھانا شروع ہوا۔ ڈرنیل کے سرے پر برازیل کا نوجوان شاعر جولیس سیزر مارٹن دہاڑ رہا تھا۔ "ہم بھی امریکن ہیں مگر امریکن محض یو ایس اے کے باشندوں کو کہا جاتا ہے۔ ہم ساؤتھ امریکن "تیسری دنیا" والے ہیں۔ غریب، جذباتی، پس ماندہ۔"

"اصل، خالص نمائندہ امریکن تو یہاں بھی WASPS ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ وائٹ اینگلو سیکسن پروٹسنٹ۔" میں نے کہا— "یہ میرا ہاتھ دیکھو"۔ جولیس سیزر نے مُکا ہوا میں لہرایا۔ اس کے نام کا پرتگالی تلفظ "ہولیو" تھا۔ تو ہولیو نے گرج کر جواب دیا۔ "میں جیلوں میں رہا ہوں اور مجھے تھرڈ ڈگری کیا گیا ہے۔ اس وقت میں اس شاندار مکان کی اس پُر تکلف دعوت میں شامل ہوں عیش کر رہا ہوں۔ مگر میں اپنی قید خانے کی کوٹھری نہیں بھولا۔ وطن واپس جا کر شاید پھر جیل کی ہوا کھاؤں۔" ہولیو کے بازوؤں پر زخموں کے گہرے نشان نمایاں تھے۔

"اس پروگرام میں" بار کے پاس کھڑے پال اینگل شکاگو کے ایک مشہور رسالے PEAPLE کے نمائندے سے کہہ رہے تھے۔ "بہت سے ادیب ایسے آتے ہیں جنھوں نے اپنے ملکوں میں بہت مصائب جھیلے ہیں۔ سنسر شپ، جیل، مسلسل جدوجہد اور احتجاج— رائٹر خدا کا مخصوص بندہ ہوتا ہے اس لیے تکالیف اُٹھاتا ہے۔

پال اینگل کی دعوت پر پچھلے سال 78ء کے پروگرام میں ایک ہفتے کے لیے فیض احمد فیض نے بھی شرکت کی تھی جو اس زمانے میں کینیڈا آئے تھے۔ میرے دل میرے مسافر۔ ہوا پھر سے حکم صادر۔

کھانے کے بعد ڈسکو رقص شروع ہوا۔ نادیا آتش دان کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے ذرا بے زاری سے کہا" سب لوگ لامحالہ سیاسی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ مجھے سیاست سے نفرت ہے۔"

"ہر شخص کے اپنے اپنے تجربات اور رویے ہوتے ہیں۔ تم کو دلچسپی نہیں نہ سہی۔ تم اپنی خالص شاعری کرتی رہو۔ حالانکہ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تم مصر اور اسرائیل کی جنگوں کے زمانے میں بے ساختہ نظمیں لکھ چکی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

نادیا نے آتش دان پر رکھے آگرے کے مرمریں فن پارے پر نظر ڈالی۔ "یہ بھی سیاست کی دین تھا؟ —" اس نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

"ایک حد تک یقیناً" میں نے جواب دیا۔ "اگر مغل ہندستان نہ آئے ہوتے تو یہ فن پارہ آج یہاں موجود نہ ہوتا۔"

فلسطین کا سنہرے گھنگھریالے بالوں والا نوعمر شاعر جمیل حسین نزدیک کھڑا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ اس کے پاس جورڈن کا پاسپورٹ تھا اور اس کے ملک کا نام دُنیا کے نقشے سے غائب ہو چکا تھا۔ اور وہ عصری تاریخ کی تلخ ترین حقیقت تھا۔ اس سے کون کہہ سکتا ہے کہ میاں خالص شاعری کرو۔ یا آئرش کیون اور ایوان بولینڈ سے جن کے ورثے میں "ایسٹر 1916ء" شامل ہے یا امریکہ اور افریقہ کے کالے ادیبوں سے۔

آنسہ نادیا بشائی کہ ایک خوش مزاج اور دلچسپ خاتون تھی۔ سیاسی رویے بھی رکھتی تھی — بوجہ قبطی قوم پرستی مصر کی ہر اچھی چیز کا سلسلہ نسب فراعنہ سے جوڑتی تھی۔ (جس طرح ہمارے یہاں عہد مہابھارت یا اسلامی دور سے جوڑا جاتا ہے۔ یہ بھی تیسری دُنیا کی مخصوص نفسیات ہے۔)

ایک روز میں نے سموسے تلے۔ نادیا کہنے لگی — "مصر میں بھی انہیں سموسہ ہی کہا جاتا ہے۔"

"عرب اسے ہندستان لائے ہوں گے۔ ہمارے بیشتر مسلم کھانے سنٹرل ایشیا مڈل ایسٹ ہی سے آ کر رائج ہوئے۔" میں نے جواب دیا۔

نادیا سموسہ نوش جاں کرتے ہوئے چند منٹ تک میری بات پر غور کرتی رہیں۔ پھر بولیں۔ ”نہیں۔ یہ عرب پکوان نہیں ہے۔ میرا آبائی گاؤں شمال مصر میں ہے۔ وہاں سموسہ اسی صورت میں بنایا جاتا ہے۔ میرا گاؤں ایک قدیم قبطی بستی ہے۔ سموسہ یقیناً دور فراعنہ کی یادگار ہے۔ عرب پکوان نہیں ہے۔“

”ہوسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون پہلے سے سموسہ کھاتے چلے آئے تھے یا اسے عربوں نے ایجاد کیا۔ پھر میں نے تصور کیا فرعون مصر آمون رع سونے کے تخت پر بیٹھا ایک عدد سموسہ کھا رہا ہے۔ یا ملکہ نفرتی تی بیٹھی کڑاہی میں چھن چھن سموسے تل رہی ہے۔

”ہم قبطی فراعنہ کی اولاد ہیں۔“ نادیا بولی۔ ”آج بھی نفرتی تی ایک عام قبطی نام ہے۔“

لیکن عرب لیگ کے سفیر نے چند سال قبل فخریہ مجھ سے کہا تھا کہ تمام اہل مصر آل فراعنہ ہیں۔“

نادیا روز شام کو پیانو کی مشق کے لیے یونیورسٹی کے میوزک اسکول جانے لگی۔ ایک شام اس نے واپس آکر کہا مدرسہ موسیقی میں محض طلبا کے لیے درجنوں اعلیٰ ترین پیانو رکھے ہیں۔ دسمبر میں قرون وسطیٰ کی کلیسائی موسیقی کا ایک کونسرٹ ہونے والا ہے۔ مجھے اس میں گانے کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔ صبح سویرے للّٰی اور نادیا سامنے پارک میں چہل قدمی کرتیں جہاں JUGGING کرنے والے گزرتے رہتے۔ سارا امریکہ JUGGING میں بے طرح مصروف تھا۔ نادیا نظمیں لکھ رہی تھیں للّٰی نے نیا ناول شروع کردیا تھا۔ لوگ باگ جب ایک دوسرے سے ملتے تو پوچھتے تم نے کام شروع کردیا ہے؟ ارجن ٹینا کارروڈلفو مجھ سے پوچھتا ARE YOU WORKING مغربی ادیبوں کے لیے لکھنا ایک سنجیدہ پروفیشنل کام ہے۔

ہفتے میں ہر دوسرے تیسرے دن ایک ادیب یا شاعر کا سیمینار یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی وفلسفہ کی آراستہ وپیراستہ فیکلٹی لاؤنج میں منعقد ہوتا۔ قہوہ کوک یا بیئر پیتے ہوئے سیمینار کے بعد سوالات اور بحث ومباحثے ہوتے۔ چوتھی منزل پر اس پروگرام کے دفاتر تھے جن میں اسٹاف کے

لڑکے لڑکیاں اپنے کام میں معروف رہتے۔ پروگرام کے دبیز زرد قالین اور چمڑے کے صوفوں والے لاؤنج کی دیواروں پر ان اداکاروں، ڈراموں، موسیقی کے پروگراموں، فلموں کے پوسٹر لگے ہوتے جو کیمپس پر روزانہ پیش کیے جاتے تھے۔ ایک دیوار پر پچھلے سال کے پروگرام کے شرکا کی تصاویر لگی تھیں۔ ایک تصویر میں فیض صاحب ایک بلغاری ادیبہ کے ساتھ بیٹھے مشغلِ مے میں معروف تھے۔ میزوں پر اور الماریوں میں ادبی رسالوں اور کتابوں کے انبار۔

''ہمارے ادیبوں کو سوچنا چاہیے کہ جو کچھ وہ بے حد جدید تصور کر کے لکھ رہے ہیں، وہ یہاں کس قدر فرسودہ ہو چکا ہے۔'' ایک روز انڈونیزیا کے فرانتز نے برقی ساوار سے قہوہ نکالتے ہوئے مجھ سے کہا۔ امریکہ میں ذہنی فیشن تیزی سے بدلتے ہیں اور یہ سب پیٹ بھرنے کی باتیں ہیں۔''

دس پندرہ سال قبل ہندستان کا زبردست FAD چلا تھا۔ روی شنکر۔ ستار۔ اگر بتیاں کنڈالنی۔ شکتی، ہندو فلسفے، رقص یونیورسٹیوں میں اور انٹلکچوئل حلقوں میں بے حد ستار بجا۔ یہ اشتیاق بیٹلز نے مہارشی مہیش یوگی کے چیلے بن کر مغرب میں عام کیا تھا اور کیلی فورنیا کے فلاور چلڈرن نے اسے مزید تقویت پہنچائی تھی۔ اس وقت تک سوامی اور گرو اور مہیش یوگی کا ٹی ایم اور ہرے کرشنا ''امریکن نظارے کا ایک حصہ بن چکے ہیں اور اس میں کوئی نوولٹی نہیں رہی۔

آج کل سُرخ چین کا زور ہے۔ اس نئی دلچسپی میں عالمی سیاست کا بہت بڑا دخل ہے۔ ''چینی ہفتہ'' بڑے زور و شور سے منایا گیا۔ کچھ عرصہ قبل پال اینگل مع ہوالنگ سُرخ چین گئے تھے اور اُن کے اس سفر کے متعلق نیوز ویک نے ایک پورے صفحے کا مضمون شایع کیا تھا۔ اس پروگرام میں دو بہت اہم چینی پیکنگ سے آئے تھے۔ ایک بہت بڑی چینی ادبی کانفرنس یونیورسٹی میوزیم کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی جس میں سارے امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے چینی پروفیسر بھی شامل تھے۔

چینی ادیب تائیوان، سنگاپور وغیرہ سے آئے تھے۔ الغرض چینی ہی چینی۔ پال اینگل نے جن بتیس چینیوں کے لیے کہا ''دنیا میں چینی آبادی کے تناسب سے یہ بتیس نمائندے تو گویا

فقط ایک عدد نمائندہ ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ بے حد چینی اوپیرا، چینی بازی گری وغیرہ اسٹیج
پر دکھائی گئی۔

ایک روز ہم لوگ دریائے مسی سپی کے کنارے آباد کواڈ سیٹیز گئے تھے۔ یعنی ایک بہت
بڑی بستی جو چار شہروں کا مجموعہ ہے۔ دریا پر پچھلی صدی کے نمونے کی پہیے سے چلنے والی دخانی کشتی
جس طرح کی کشتیوں میں مارک ٹوین مسی سپی دریا پر سفر کیا کرتے تھے۔ غسل خانوں کے پردوں
پر پچھلی صدی کے اخبارات چھپے ہوئے تھے۔ اسی قسم کے جہازوں پر سفر کرنے والے امریکن
مشنری انجیلیں سنبھال کر جاپان اور چین جایا کرتے تھے۔

گراں خواب چینی نے سنبھل کر لیا یک ایک جھانپڑ۔
ہمالہ کے چشمے اُبلنے تو لگے مگر آج تک کچھ بات نہ بنی۔

جہاز کے بالائی عرشے پر ٹہلتے ہوئے میں نے پیکنگ کے چیلڑ پبلشنگ ہاؤس کے
ڈائرکٹر سے پوچھا "آپ نے ہمالیہ پر حملہ کیوں کیا تھا؟"

اس نے مسکرا کر آنکھیں چندھیائیں اور جواب دیا "لندن میں سجاد ظہیر اور ملک راج
آنند میرے دوست تھے اور احمد علی۔"

"اسے کنفوشس کا فلسفہ کہتے ہیں یا تاؤ۔" میں نے پوچھا "آپ لوگ تو ہمارے بڑے
قدیم پکے دوست تھے۔ پھر؟"

سب سوویٹ یونین کی ریشہ دوانیاں ہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لیکن آپ دونوں ملک تو کیمونسٹ ہیں۔" اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔ میں
نے فلسطین کے جمیل حسین کو دیکھ کر دل میں اضافہ کیا۔ جمیل حسین ہنگری میں چھ سال پڑھ کر آیا تھا
اور ہنگرین شاعرہ ایگنیس سے بزبان ہنگرین گفتگو کرتا ہوا بو نے اُڑانے میں مصروف تھا۔ چینی
ادیب نے جواب دیا "تم کو مغربی کلاسیکل موسیقی سے دلچسپی ہے؟—"

"آپ کو پال روبسن کا اول مین رور پسند ہے؟" میں نے جواب دیا۔

دریائے مسی سپی کے دونوں کناروں پر کواڈ سٹی کی سر بفلک عمارتیں ساتھ ساتھ چل

رہی تھیں۔

روسی ''والگا بوٹ مین کا گیت اور امریکن ''اوّل مین روز''۔ عظیم دریاؤں کی اپنی خفیہ زبان ہے۔ چینی ادیب مغربی کلاسیکل موسیقی کا رسیا تھا۔ موسیقی کی بھی سرحدیں نہیں ہیں۔

لیکن سرحدیں ہیں۔ زیوبن مہتہ عربوں کے لیے اپنا آرکسٹرا شاید کنڈکٹ نہیں کرے گا۔

خوش مزاج یونانی شاعر آری بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور چپکے سے بولا ''تم کو ایک مزے دار بات بتاؤں۔ کسی سے نہ کہنا۔ اونگا مائیکل سے شکایت کر رہی تھی کہ کل الفریڈو اسے گھر پہ چھوڑ کر صبح سے شہر چلا گیا اور شام پڑے واپس آیا۔ مائیکل نے جواب دیا ''مادام اگر میں الفریڈو کی جگہ ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا''۔ یہ خبر دے کر آری عطارد کی سی برق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ متبسم میری پاس سے گذری اور کہا ''آری نے تم کو وہ لطیفہ سنایا؟ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی سے نہ کہنا۔ اب تک تین چار لوگ آ آ کر مجھے یہ لطیفہ سنا چکے ہیں۔'' الزبتھ ٹیلر کی ہمشکل کولمبیا کی شاعرہ اونگا اپنے نیاز مند شوہر الفریڈو کے ساتھ عرشے کی ریلنگ کے سہارے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ فوٹوگرافر اس کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اونگا اور الفریڈو نئے دولہا دلہن تھے دونوں کی دوسری شادی تھی۔ اونگا کی پہلے شوہر سے لڑکی بائیس سال کی تھی۔ اونگا ایکٹر نیارہ چکی تھی۔ ہر وقت لائم لائٹ میں رہنا چاہتی تھی۔ سب لوگ اس کی ان بے ضرر حماقتوں کے عادی ہو چکے تھے۔ نیک دل تھی اور اس کی وجہ سے بہت رونق رہتی تھی۔ روز اس کا کوئی نہ کوئی لطیفہ سب تک پہنچ جاتا۔

نیچے بال روم میں رقص شروع ہونے والا تھا۔ پال اینگل حسب معمول ایم سی بنے اودھم مچا رہے تھے۔

''اس بزرگ شاعر میں کس قدر زندہ دلی اور انرجی ہے۔ اس عمر میں سینکڑوں میل کار چلاتا ہے۔ سوئمنگ کرتا ہے۔ دوڑتا ہے۔ ہمارے ہاں اس عمر کے لوگ بوڑھے پھونس ناتواں نڈھال تلخ مزاج کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگتے ہیں۔ انڈونیزین ارشوبندو نے کہا۔ میں

نے اس عمر کے خستہ حال اُردو شاعروں کا تصور کیا۔ جن کے مرنے کے بعد اُن کے بیوی بچوں کے لیے چندہ کی اپیل کی جاتی ہے۔ تفو برتو اے چرخ گرداں تفو۔

اونگا بال روم میں پہنچ چکی تھی۔ اور ارجن ٹائین کے روڈلفو کے ساتھ ایک ہسپانوی گیت سنانے میں مصروف تھی۔

ارشویندو اور اس کا ہمزاد فرانز ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ارشویندو نے اپنی سیاہ قراقلی پر ہاتھ پھیرا۔ اس وقت وہ دُنیا سے بے حد مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ "میں یہ ٹوپی اس لیے پہنتا ہوں کہ فرانز سے مختلف نظر آؤں۔ یہاں سب مجھ میں اور فرانز میں گڑبڑا جاتے ہیں۔"

اس نے مجھے سمجھایا۔ بالی کا فرانز ملیر فن آرٹسٹ بھی تھا۔ میز پر رکھے کاغذی نیپکن پر اس نے اونگا کا اسکیچ بنا کر عربی رسم الخط میں اپنا نام لکھا۔ میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ وہ حسب عادت باچھیں کھلائے بولا "میں اکثر فلپائن جاتا رہتا ہوں۔ وہاں مسلمانوں کے خلاف کافی تعصب ہے۔ ان کے مورسکو پرابلم کی وجہ سے۔ اس لیے میں نے اپنا نام فرانز FRANZ رکھ لیا۔"

غور کیجیے۔ ہسپانوی نوآبادکاروں نے جزائر شرق الہند پہنچ کر وہاں کے مفتوح مسلمانوں کو بھی مُور کہا۔ ہسپانیہ کے مسلمان مُور کہلاتے تھے کیونکہ زیادہ تر مراقش سے وہاں پہنچے تھے۔

فلور پر ایک خوش شکل لوچ دار چینی نے تنہا ڈسکو رقص شروع کیا اور بھرت ناٹیم کے چند چینجز دکھائے۔ وہ ماہر ڈسکو رقاص تھا۔

رات گئے جہاز ڈیوین پورٹ کی دریائی بندرگاہ پر واپس پہنچا۔ ہم لوگ اس وقت ریاست الی نوائے میں تھے۔ کوچیں آیوواسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔ ایک کوچ میں اگلی سیٹ پر شرق اوسط کی لیلیٰ ارمل اور ناد یا بنتائی نے انگریزی گیت شروع کر دیے۔ نزدیک بیٹھے پولینڈ کا مائیکل فوراً ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر بے ساختگی کے ساتھ گویا ان دونوں کو کنڈکٹ کرنے لگا۔ یورپ اور بحیرۂ روم کی کلچر! کوچ کا موٹا سفید فام امریکن ڈرائیور توصیفاً سر ہلایا کیا۔ وہ آٹھ ڈالر فی گھنٹہ کماتا ہے۔ ڈپو واپس جا کر اپنی کار میں بیٹھے گا اور اسٹیریو پر اپنی پسندیدہ موسیقی سنے گا۔ مائیکل بھی پولینڈ

اپنے ایک معقول منصفانہ اشتراکی ماحول میں واپس لوٹے گا۔ جہاں کوئی بھوکا نہیں مرتا۔ لیکن لیلیٰ اور نادیا اپنے کس قسم کے معاشروں میں واپس جائیں گے؟ غربت، تشدد، سیاسی بدامنی، بے اطمینانی۔ ترکی میں بڑھتے ہوئے سیاسی قتل وغارت کے متعلق لیلیٰ اکثر اداس ہوتی ہے۔

لیلیٰ اور نادیا جو اس وقت انگریزی اور امریکن اور فرنچ گیت گا رہی ہیں۔ ان کی مغرب سے یہ تہذیبی یگانگت سطحی اور مصنوعی ہے۔ کیونکہ معاشی برابری کے بجائے شدید معاشی تضاد پر مبنی ہے۔

کہرے میں چھپے جزیرے

یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف آرٹ کے ریٹائرڈ صدر اور آرٹ کے مورخ پروفیسری برلنگ شہر سے دور ایک جنگل میں ندی کنارے اپنے دومنزلہ پلیٹ گلاس مکان میں رہتے تھے۔ فرنچ کٹ داڑھی، پستہ قد، منکسرالمزاج، ندی کے رُخ ان کا وسیع میوزک روم، مجسموں اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی اور بجنل تصاویر سے آراستہ تھا۔ اوپر سامعین کے لیے چوطرفہ گیلری۔ پیانو کے نزدیک مختصر اندرونی باغیچہ۔

اس شام چینیوں نے اُن کے مکان کے مزے پر اپنے اپنے کمالات دکھائے۔ ایک چینی نے بانسری بجائی۔ ہوانگ اینگل کی رقاصہ لڑکی نے (جو ان کے سابق چینی شوہر کی اولاد اور ایک انگریز کی بیوی تھی) "تتلی کا رقص" پیش کیا۔ ایک چینی لڑکی نے چینی گانا سنایا۔ امریکن اسی اخلاق اور صبر سے سنا کیے۔ جس طرح وہ غیر مغربی موسیقی سنتے ہیں جو اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ چینی جاپانی موسیقی مجھے بھی بے سُری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ گو سنگیت یونیورسل ہے مگر ہر قوم کی لے اور چند اندرونی سُر جداگانہ بھی ہو سکتے ہیں۔

رات کو یونیورسٹی کوارٹریٹ نے پروفیسری برلنگ کے میوزک روم میں اپنا اپنا پروگرام پیش کیا۔ امریکن سامعین دفعتاً اپنی مانوس دُنیا میں لوٹ آئے۔ چینی بانسری کے سُر دقل اور معقولات تھے۔

عصرانے کے دوران مشہور اخبار ڈی موائین رجسٹر کے ایک سینئر صحافی سے بہ سلسلۂ ہندستانی سیاسیات میری جھڑپ ہو چکی تھی۔ اب مع تمام سامعین بڑے انہماک سے چیمبر میوزک میں محو تھا۔ اس وقت اچانک میری نظر اس مجسمے پر پڑی۔

کوارٹریٹ کے نزدیک گملے کے پیچھے رکھا وہ چھوٹا سا مجسمہ ایک فاقہ زدہ ایشیائی لڑکے کا

تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی بے چارگی اور احساس محرومی کا حقیقت آمیز تاثر حیرت انگیز تھا۔ وہ ننھا لڑکا احساسِ فراغت اور عشرت اور تہذیبی اور روحانی طمانیت کے اس ماحول میں ایک کونے میں چھپا یہ سب دیکھ دیکھ کر گویا پتھرا چکا تھا۔ کسی نے بھی اس مورتی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ چلتے وقت مَیں نے پروفیسر برلنگ سے پوچھا۔

"یہ مجسمہ میرے ایک شاگرد نے جنوبی ایشیا میں بنایا تھا۔ یاد نہیں آرہا کون سے ملک میں۔" انھوں نے جواب دیا۔

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہ لحاظ فقر و فاقہ جنوبی ایشیا کے سارے ملک یکساں ہیں۔ پروگرام کی کاریں اور منی بسیں اسٹاف کے لڑکے ایڈون اور بوب اور لڑکیاں چلاتی تھیں۔ یہ گاڑیاں پروفیسر کے مکان سے کچھ دور جنگل کے راستے پر کھڑی تھیں۔ لوگ باگ حسب معمول ٹکڑیوں میں بٹ کر اطمینان سے ٹہلتے ہوئے آرہے تھے۔ مَیں بوب کی اسٹیشن ویگن ڈھونڈتی اکیلی ذرا آگے نکل گئی۔ رات کا اندھیرا چھا چکا تھا اور اونچی اونچی گھاس میں جھینگر بول رہے تھے۔ ایک جگہ بوب کی چھوٹی کوچ نظر آئی۔ اس کا انجن حسب معمول چل رہا تھا۔ دروازے پر ایک اجنبی متبسم چہرہ۔

"ہیلو"۔۔ مَیں نے کہا۔۔ "یہ انجن کیوں چل رہا ہے؟ متواتر نہ جانے کب سے۔ حد ہے۔۔ امریکن انرجی بچار ہے ہیں۔"

اجنبی نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہو۔۔ "مَیں فلپائن سے آرہا ہوں ابھی ابھی۔ ایڈون مجھے سیڈر ریپڈز ایئرپورٹ سے سیدھا یہاں لے آیا۔ صرف چند منٹ پہلے۔ اس وجہ سے مَیں پارٹی میں شامل نہ ہو سکا۔ میرا نام ہوزے لکایا ہے۔"

"ہلو۔۔ ہوزے۔۔ "مَیں نے کہا۔ "تم اتنی دیر میں یہاں کیوں پہنچے۔ پروگرام شروع ہوئے تو تین ہفتے ہو گئے۔"

"مَیں جیل میں تھا۔ جب دعوت نامہ پہنچا۔ پیرول پر چھٹا تو فوراً یہاں کا ٹکٹ کٹایا۔" اس ضمانت پر کہ یہاں سے سیدھا وطن واپس جاؤں گا۔"

"جیل میں کیوں تھے؟"

"عموماً ادیبوں کو جیل کیوں بھیجا جاتا ہے؟ سیاسی احتجاج۔"

"فلپائن کی سیاست کا اب بھی وہی حال ہے جو میں نے وہاں دیکھا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

پروفیسر جارج سی برلنگ کا پلیٹ گلاس دو منزلہ۔ یونیورسٹی کا اسٹرنگ کواٹریٹ بڑھیا ڈنر اس میں مصیبت زدہ تیسری دُنیا کے سفیران حرم آتے ہیں۔

"دیکھو سب کاروں کے انجن چل رہے ہیں۔" ہوزے نے اظہار خیال کیا۔

"یہ تھرو اوے سوسائٹی ہے۔ بے تحاشہ کھانا جو بچ رہتا ہے، کوڑے میں پھینک دیتے ہیں۔ سال کے سال فرنیچر بدلتے ہیں۔ ذرا جی بھرا تو کاریں جا کر" کاروں کے قبرستان میں ڈال آتے ہیں۔ ایسی فضول خرچیوں کی عادت کے بعد اب کارٹر ان سے کہیں کہ پٹرول بچاؤ تو اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ للّے تلّے کی عادت مشکل سے چھٹتی ہے۔ ان کے مکانوں میں ہر کمرہ روشن رہتا ہے۔ کمرے کی بتی بجھانا جانتے ہی نہیں۔ تم نِک ہوکِن کو جانتے ہو میں ان سے ٹوکیو اور اس کے بعد منیلا میں ملی تھی۔"

"نِک ہوکِن؟ — وہ اب ہمارے ملک کا نیشنل آرٹسٹ ہے۔ اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو چکا ہے —"

وہی پرانی کہانی

جب میں نِک ہوکِن سے ملی تھی۔ وہ اسی ہوزے کا ہم عمر رہا ہوگا۔ ہوزے آج کے اسٹیبلشمنٹ کا باغی تھا اور قید خانے سے پیرول پر امریکہ آیا تھا۔

ریاست کے صدر مقام ڈی موائن (یہ بھی ایک فرنچ نام ہے اور اس ریاست پر سابقہ فرنچ تسلط کی یادگار) میں امریکن انشورنس کمپنی کی موڈرن آرٹ کے بیش بہا نمونوں سے آراستہ فیوچرسٹک عمارت کی ایک منزل کے پلیٹ گلاس برآمدے میں سے ایک نظارہ۔

نیچے چوک میں مشنریوں کے گروہ جمع تھے۔ کچھ لوگ چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔

سامنے دو بہت اونچی عمارتوں کے درمیان استادہ ایک نسبتاً پرانی اتنی ہی اونچی عمارت کو بارود سے منہدم کیا جانے والا تھا۔

خالی سڑک پر چند آدمی ایک مشین لے کر آئے۔ ایک بٹن دبایا۔ دھماکہ۔ ٹھیک آٹھ سکنڈ کے اندر وہ پوری عمارت منہدم ہو گئی۔ اور اس طرح کہ اس سے بالکل سٹی ہوئی عمارتوں کے کھڑکیوں اور شیشوں پر بال بھی نہ پڑا۔ دھوئیں کے سیاہ بادل چاروں طرف پھیل گئے۔ چند منٹ میں دھواں تحلیل ہوا۔ روشن دھوپ میں اس عمارت کی جگہ ملبے کا ڈھیر پڑا تھا۔ محض آٹھ سکنڈ۔

اس ساؤنڈ پروف بلوری برآمدے میں سے وہ بے آواز منظر سائنس فکشن کا ایک حصہ معلوم ہوا۔ ایک پوری عمارت پلک جھپکتے میں غائب۔

''پش بٹن تہذیب۔ برائے تعمیر و تخریب۔''

نزدیک کھڑے یونان کے آری نے حسب عادت چٹکلے سے اظہار خیال کیا۔

شام کے وقت ڈی موائن کے ایک ہرے بھرے پُر فضا محلے میں رسالہ ''ہوم اینڈ گارڈنز'' کے ناشر کی بیوہ کا مکان۔ اونچی چھت والا، ایوان نشست پکاسو اور پال کلی اور دوسرے جدید اُستادوں کی اوریجنل تصاویر اور برنجی مجسموں اور آڑے ترچھے اُلجھے ہوئے تار کے گچھوں وغیرہ سے (جو موڈرن اسکلپچر کہلاتے ہیں اور بے وقوف لوگ اُن پر کتابیں لکھتے ہیں اور اُن کو لاکھوں روپے میں خریدتے ہیں) سجا ہوا تھا۔ پچھلے چبوترے پر موڈرن اسکلپچر کا ایک برنجی قد آور مجسمہ استادہ تھا۔ میں نے اس بُت کو بہت غور سے دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ چبوترے کے سامنے خاتون خانہ کا جنگل مع سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔ خزاں کے سُرخ پتے گھاس پر اُڑتے پھر رہے تھے۔ پیٹر ناضرۃ چبوترے پر بیٹھا چپ چاپ منظر ملاحظہ کر رہا تھا۔ برنجی مجسمے کے سر کے پیچھے اچانک مجھے ایک گول پلیٹ نظر آئی۔ یہ ہالہ ہے۔ میں نے سوچا اور پیٹر سے کہا ''پیٹر یہ جیزس کرائسٹ ہے۔''

''نہیں میرے خیال میں یہ کاؤبوائے ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ قطعی جیزس کرائسٹ ہے۔ سر کے گرد ہالہ ہے۔ وہ پلیٹ ملاحظہ کرو۔ علاوہ

ازیں کا ڈیواسے ایسا چوغہ کہاں پہنتے ہیں۔"

عین ممکن ہے کہ رات کے وقت وہ بطور لباس شب خوابی ایسا چوغہ پہنتے ہوں۔ پچھلی صدی میں۔" پیٹر نے جواب دیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا۔

"لیکن تم نے یہ غور کیا کہ اس خاتون نے یہ کا ڈیواسے یا جیزس کرائسٹ کتنا مہنگا خریدا ہوگا۔" ہنگری سے آئے نوجوان یہودی ادیب نیکلوس ہزاردی نے قریب آ کر زمین پر اُکڑوں بیٹھتے ہوئے شگفتگی سے مجھے مخاطب کیا۔ چبوترے پر صرف پیٹر، نیکلوس اور میں اس مجسمے کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے۔ باقی سب لوگ اندر تھے۔

"یہ سب اس خاتون کے ایجنٹ کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ آرٹ کے ذخیرے ہیروں کا اسٹیٹس سمبل ہیں۔ اس سے انھیں غرض نہیں کہ وہ کیسے ہیں۔" نیکلوس نے اضافہ کیا۔

ہم لوگ دیوان خانے میں واپس آئے۔ اب ہنگرین شاعرہ ایگنس چپکے سے بولیں: تم نے میزبان خاتون کا بیڈروم دیکھا؟ اس قدر غیر شخصی۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔"

میں فوراً گئی۔ سفید قالین۔ سفید منک کے پلنگ پوش۔ غسل خانے میں سفید منک کا غالیچہ۔ پورا سویٹ برف کا خواب معلوم ہوتا تھا۔ اس کے برابر ایک سورنگ روم میں مزید ماڈرن ماسٹرز دیواروں پر آویزاں تھے۔ میں نے واپس آ کر ایگنس کے نرم مزاج شوہر بالا زیگل سے کہا چلیے وہ کمرہ بھی دیکھ آیئے۔ وہ میرے ساتھ سورنگ روم میں گئے۔ تصاویر دیکھیں، اور واپس آئے۔ ان کے چہرے پر شدت کی ملامت اور نرمی تھی۔ بیوی کے چہرے پر اُداسی۔ بڑا پرسکون اور باوقار جوڑا تھا۔ ان دونوں کے پاس ان کا نوعمر ہم وطن یہودی نیکلوس فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔۔۔ "ہم لوگوں نے بچپن سے اس طرح کے مکان ہالی وڈ فلموں میں دیکھے تھے اور یہ ضعیفہ یہاں پر تجارتی ہیں۔ اولا اداسی شہر میں موجود ہے۔"

"نیکلوس۔۔۔" میں نے کہا۔ "اس وقت سے ڈرو جب منک کا پلنگ پوش ساری جذباتی رشتوں کا نعم البدل رہ جائے۔"

ٹینس امریکن امرا کا محبوب کھیل ہے۔ دیوان خانے کے ایک گوشے میں ایک آرٹ کا

مورخ جمیل حسین فلسطینی کی ایک گرل فرینڈ سے گفتگو کر رہے تھے۔ جمیل حسین جتنا خوبصورت نوجوان تھا۔ اس نے چھانٹ کر اپنے لیے اتنی ہی بدشکل لڑکی چن لی تھی جواب اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ لڑکی پروفیشنل کوچ تھی۔ لکڑی کاٹنے کے لیے آرٹ کے مورخ میز پر بلائے گئے۔ چینی آرٹ پر موصوف کی ایک بے حد ضخیم مصور کتاب حال ہی میں شائع ہوئی تھی۔ پیٹر چبوترے سے واپس آ کر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

''چین۔'' میں نے پال اینگل سے کہا۔ ''امریکہ کا نیا FAD ہے۔ نہیں۔''

''چین اور جاپان دونوں نے امریکنوں کو ہمیشہ سے مسحور کیا ہے۔ جب سے ہمارے پرکھے وہاں بطور مشنری اور تاجر جاتے تھے__ لیلیٰ گانا سناؤ۔'' اچانک پال نے نعرہ لگایا__ ''انگریزی نہیں ترکی۔''

''یہ گیت انقلاب کے متعلق ہے۔'' لیلیٰ نے ذرا توقف کے بعد شرماتے ہوئے کہا۔ اور گیت بزبان ترکی سنایا۔ جسے سب نے اسی اخلاق سے سنا جس طرح انھوں نے چینی گیت سنے تھے۔ کم کو لیلیٰ نے کبھی تذکرہ نہیں کیا لیکن شاید وہ ہلکی سے لفٹ ونگ تھیں۔ ان کی کہانیوں کا سوویت یونین میں ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔

انقلاب کے لفظ سے اب وحشت ہوتی ہے۔ دیکھو ایران میں کیا ہو رہا ہے۔'' ایک ایشیائی نے چپکے سے مجھے مخاطب کیا۔''

''میرا نصب العین ہے لنک کے پلنگ پوش۔''

اگر آپ کتابیں لکھتے یا چھاپتے ہوں تب بھی بیش کیجیے بھٹے اگاتے ہوں اور سور پالتے ہوں تو ہمارے ہاں فاقہ زدہ چمار پالتے ہیں۔ سوروں کے اس فارم یعنی دارالخنازیر کے مالک ایک ضعیفہ اور اس کے دو بے حد ہینڈسم بیٹے تھے۔ وہ گھوڑے پر اپنے خنازیر پال پوس کر بڑی بڑی کمپنیوں کو فروخت کرتے تھے۔ جہاں ان کو نہایت نفیس پورک اور بیکن میں تبدیل کیا جاتا تھا اور... وہ ایرکنڈیشنڈ سوپر مارکیٹوں کے گلاس کیسوں میں پڑے جھل جھلاتے تھے۔ یعنی ایک سور کا ارتقاء... فارم میں مارے تعفن کے کفرانہ ہوا جاتا تھا اور سور تھے کہ مع اہل وعیال غلاظت میں لوٹ

لگا رہے تھے۔

:

دیکھو خانم لیلیٰ۔۔۔ "اسی لیے اسلام میں سور حرام ہے۔" میں نے بحیثیت خاتون مولوی اس لادین ترک خانم کو سمجھایا۔ "یہ جو تم صبح شام بیکن اور ہیم پورک اڑاتی ہو غور سے دیکھ لو۔" لگے ہاتھوں میں نے نادیہ قطبیہ سے بھی تبلیغ کر ڈالی۔ "دیکھو، سیو یہ ہے ہم اہل اسلام سور نہیں کھاتے۔"

ناک پر رومال رکھ کر نادیا اور لیلیٰ وقتی طور پر متاثر نظر آئیں۔

مالکان دارالخنازیر کے مکان کے سامنے ان کے دفاتر کی بیرونی دیوار پر لکھا تھا۔

HOGS ARE BEAUTIFUL

جان ڈیر پچھلی صدی میں ایک دیہاتی لوہار تھا جو اپنے گاؤں میں ہل پھاوڑے (کدال) کھرپیاں وغیرہ اپنی چھوٹی سی بھٹی میں ڈھالا کرتا تھا۔ پھر وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ جان ڈیر کمپنی آج ایک ایمپائر ہے۔ جس کے ٹریکٹر ساری دُنیا میں چل رہے ہیں۔ "امریکن کامیابی" کی نمائندہ کہانی شہر مولین میں اس کارخانے کے صدر دفاتر کی فولاد کنکریٹ اور شیشے کی عمارت کے سامنے اینڈ اسکیپ باغ میں بید مجنون سے گھرے ہوئے ایک جزیرے پر ہنری مُور کا ایک مجسمہ رکھا ہے جسے بذریعہ ہیلی کاپٹر وہاں اُتارا گیا تھا۔ عمارات کی فرلانگوں لمبی راہداریاں اور ایوان دنیا کے موڈرن آرٹ کی بیش قیمت ترین تصاویر سے آراستہ۔ یونان کے شاعر آری کے ردعمل بے حد مشرقی تھے۔ ایک طویل گیلری میں سے گذرتے ہوئے وہ چپکے سے بولا۔ "ساری دنیا کا بہترین آرٹ دولت کے بل پر یہاں سمیٹ لائے ہیں۔"

مشرقی یورپ کے ادیب اس عمارت کے ٹیکنولوجیکل عجائبات کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں انسانوں کے بجائے روبوٹ کام کرتے ہوں گے۔" پولینڈ کے مائیکل نے آہستہ سے کہا۔

نیچے ایک مسقف گلشن تھا۔ آری حیرت زدہ رہ گیا۔ "تم نے غور کیا۔" وہ مجھ سے بولا "کہ یہ سارے پھول پتے اور گھاس مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ایک پتہ غیر حقیقی انداز سے

چمک رہا ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے مَیں سائنس فکشن کے ماحول میں آ گیا ہوں۔"

"اکیسویں صدی کی ایک جھلک۔" مَیں نے جواب دیا۔

"مگر اب یہ اس سے اور آگے کہاں جائیں گے؟" آری نے دریافت کیا۔

"بائیس ویں صدی میں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم چھٹی صدی قبل مسیح کے آدمی ہو۔ لیکن مغربی تمدن کے بادا آدم بھی ہو۔ یہ سب کیا دھرا تمھارا ہے۔ نہ تم لوگوں نے گریک اسپرٹ اہلِ مغرب کو عطا کی ہوتی نہ یہ سب ہوتا۔ لیکن آج خود تم لوگ پھسڈی اور غریب رہ گئے اور یہاں آ کر محض ریستوران چلاتے ہو۔"

ڈی موائن کے باہر جنگل کے ایک لکڑی اسٹور میں ایک نوجوان پچھلی صدی کا لباس پہنے، پچھلی صدی کی مصنوعات فروخت کر رہا تھا۔ ایک چوبی کیبن میں سایہ پہنے ایک عورت دودھ بلو رہی تھی۔ دوسری عورت کنوئیں میں سے پانی لا رہی تھی۔ ایک لڑکی مکان کے باہر چرخہ کاتنے میں مصروف تھی۔ اکیسویں صدی سے واپس پچھلے زمانوں میں پہنچ کر امریکنوں نے اپنی مختصری تاریخ کو جگہ جگہ بڑے پیار سے سجائے رکھا ہے۔ اس لونگ ہسٹری میں فارم میں پائنیرز کے کیبنوں کے علاوہ ایک بڑے گاؤں میں لوہار کی دُکانیں، ڈاکٹر، پنساری، زمین دار کا بڑا مکان۔ ہر چیز بجنسہٖ دوبارہ تعمیر کی گئی تھی اور اس میں اسکول کے بچوں اور سیاحوں کے لیے اسی زمانے کے پوشاکوں میں ملبوس لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اسکول ہاؤس میں یہ سایہ پہنے ٹیچر بچوں کو پڑھاتی بالکل انیسویں صدی کی امریکن ناول کا ایک کردار معلوم ہوتی تھی۔ حبشی غلاموں کے جھونپڑے مفقود تھے۔ کیونکہ شمال کی ریاستیں غلامی کے خلاف تھیں۔ جنوب کے مظلوم غلام پناہ لینے کے لیے شمال بھاگ آتے تھے۔ فرار کا راستہ "انڈرگراؤنڈ ریلوے" کہلاتا تھا۔ جس کے متعدد اسٹیشن اس جمہوریت پسند ریاست میں موجود تھے۔ لیکن آج یہ ریاست سیاسی اور سماجی لحاظ سے قدامت پسند ہے۔

ریاست آئیووا ملک کے متمول ترین کسانوں کا دیس ہے جو بھٹے اگاتے ہیں اور ذاتی طیارے رکھتے ہیں۔

1959 عیسوی میں خروشیف امریکن زراعت کے مطالعے کے لیے اسی ریاست میں مدعو کیے گئے تھے۔ اس بھٹوں کے کھیت کے درمیان واقع امریکن وڈیرے، مسٹر ولسن بھٹو کے دومنزلہ مکان کا طرزِ آرائش "پیریڈ امریکن" تھا۔ باہر جان ڈیر کمپنی کے جفادری ایرکنڈیشنڈ ٹریکٹر کھڑے تھے۔ جنھیں میاں بیوی ولسن اور اُن کے لڑکے چلاتے تھے۔ اس قسم کا مثالی امریکن سادہ لوح دیہاتی خاندان جس کی تصویریں ایک زمانے میں نارمن روک ویل لائف کے سرورق پر بنایا کرتا تھا۔

باہر سیب کے درختوں کے نیچے مسٹر پال اینگل بنچ پر بیٹھے دورۂ چین کا ذکر کر رہے تھے۔ جب میں نے اُس سے پوچھا "یہاں آس پاس کوئی کویکر گاؤں نہیں ہوں گے۔"

"اتفاق سے ایک کویکر کسان یہاں لنچ کے لیے مدعو ہے۔ اس سے پوچھتا ہوں۔" فوراً زقند بھر کر مکان کے اندر گئے۔ چند منٹ بعد آ کر کہا "ایک کویکر بستی یہاں سے پندرہ میل دور ہے۔ چلو ابھی تم کو دکھلا لائیں۔"

وہ کویکر قریہ میپل کے درختوں اور سبزہ زاروں سے پُر۔ ایک تصویر کی طرح نظر فریب اور پُرسکون اس کے جماعت خانے میں جا کر ہم لوگ بنچوں پر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ کویکر کسان نے (جو مسٹر ولسن کے فارم سے ہمارے ساتھ آیا تھا) کہا "یہ جماعت خانہ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ ہم سب امن پرست اور جنگ کے مخالف ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو فرینڈز کہتے ہیں۔"

(سوسائٹی آف فرینڈز 1650 عیسوی میں انگلستان میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی جارج فوکس نے انگریزی خانہ جنگی کے دوران اولیور کرومویل سے کہا تھا کہ میں خدا کو گواہ کر کے تجھ سے کہتا ہوں کہ میں کسی کے خلاف تلوار نہیں اُٹھاؤں گا۔ کسی سے جنگ نہیں کروں گا کہ خوں ریزی عیسیٰؑ کی روشنی کی مخالف ہے۔ امریکہ میں کویکرز نے سُرخ ہندوستانیوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے اور امریکن انقلاب سے قبل اپنے کالے غلام آزاد کر دیے۔)

"ہمارے عبادت خانے میں پادری نہیں ہوتا۔ خدا سے بندے کا ڈائریکٹ رشتہ اصل چیز ہے۔" کسان نے کہا۔

نادیا میرے برابر بیٹھی تھی۔ بور ہو رہی تھی:

''یہ کس قسم کا چرچ ہے۔ اس میں صلیب تک نہیں۔ بغیر پادری اور صلیب کے بھی بھلا کوئی چرچ ہو سکتا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''نادیاز کی بٹائی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کوئیکر ہی سچے عیسائی ہیں۔ یہ میرے پسندیدہ لوگ ہیں۔ سارے مغرب میں سب سے زیادہ متوازن صلح پرست اور امن پسند لوگ جو تم کو ملیں گے۔ تم کو پتہ چلے گا کہ وہ یا خود کوئیکر ہیں یا کوئیکر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

''بغیر پادری کا چرچ۔ یہ کس قسم کی عیسائیت ہے۔'' نادیا نے بے زاری سے دہرایا۔

''یہی سچے عیسائی ہیں۔'' میں نے بھی دہرایا۔ ''میں ایک ایسے امریکن خاندان کو جانتی ہوں جو اب تک ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے انجیل مقدس کی زبان اور THOU اور THEE استعمال کرتے ہیں۔ کیا پیارے لوگ ہیں اور ذرا سترھویں صدی انگلستان اور امریکہ کے اصول پرستوں کا خیال کرو۔ وہ بھی کیا ولولہ خیز زمانہ ہوگا۔

باہر ایک چھتنار میپل کے نیچے کوچ کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میرے علاوہ کسی کو اس کوئیکر گاؤں سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن کوچ میں سوار ہوتے ہوئے بیکنگ کے شاؤشن نے پال اینگل سے کہا۔

''یہ کوئیکر فلسفہ ہندستانی فلسفہ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کی روشنی تمھارے اندر موجود ہے۔ وغیرہ۔ یہی اسلامی تصوف بھی ہے۔ آپ تو مسلمان ہیں نا؟'' شاؤسن نے لیلیٰ اربل سے پوچھا۔

''نہیں محض نام کی۔'' اس نے دہرایا اور سگریٹ سلگا لیا۔ بیشتر ترک خواتین کی طرح وہ لگاتار سگریٹ نوشی کرتی تھی۔

میپل کے درخت چنار سے مشابہ ہیں۔ کوئیکر فلسفہ ویدانت اور تصوف سے مشابہ ہے۔ استنبول کی لیلیٰ اربل اپنی جڑوں سے کٹ چکی ہے۔ وہ کس سے مشابہہ ہے؟ سے فلاور کے سامنے پارک میں ٹہلتے ہوئے اس نے ایک دفعہ خود مجھ سے کہا تھا کہ ہم کو اب یہ احساس بے حد شدید

ہو چکا ہے کہ لاطینی رسم الخط اختیار کر کے اور یورپ سے رشتہ جوڑ کر ہم اپنے تہذیبی ورثے سے بالکل کٹ گئے۔

"بڑی عجیب کشمکش کا دور ہے۔" میں نے کہا تھا "یا تاترک کی لادینی یا آج کل کی انتہا پسند اسلام پرستی تجدیدیت میں انتہا پسندی کا خطرہ بھی مضمر ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر میں کلام مجید کی تفاسیر مختلف فرقوں کے علما نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے لکھی ہیں۔

سامنے ندی کے کنارے اس شام نادیا فکر شعر میں محو ٹہل رہی تھی۔ اس روز اس نے لکھا تھا

"اس کہرے میں ننھے جزیرے پیدا ہوتے ہیں اور تتلیاں مرجان میں چھپتاتی رہتی ہیں۔"

خیاباں خیاباں ارم

الارم صبح چار بجے کا لگایا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے ایر پورٹ لموزین کے ڈرائیور نے مجھے فون کیا تب آنکھ کھلی ٹھیک سات بجے سیڈر ریپڈز سے شکاگو جانے والا طیارہ چھٹتا تھا۔ ہڑبڑا کر نیچے گئی۔ لموزین کا ڈرائیور جو خالص ورکنگ کلاس امریکن تھا۔ خنک اندھیرے جنگلوں کی طرف چلا جہاں روشن راستوں کے کنارے خوب صورت دو منزلہ مکان خوابیدہ تھے۔ چند ایک میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ڈرائیور ایک مسافر کا پتہ بھول گیا تھا۔ اور بار بار چند سڑکوں کا چکر لگا کر وائرلیس پر اپنے دفتر سے کہتا جارہا تھا I AM HAVING PRODIEMS جو امریکنوں کا سب سے بڑا شکایتی جملہ ہے۔ لموزین کے دفتر نے کمپیوٹر کے ذریعہ معلوم کرکے ڈرائیور کو چند سکینڈ میں گم شدہ پتے سے مطلع کیا۔ اس نے کار ایک مکان کے سامنے جا کر روکی۔

ایک خاتون بریف کیس سنبھالے برآمد ہوئیں۔ دوسرے مکان سے ایک اور خاتون مع بریف کیس۔ دونوں از حد انٹیلیجنٹ۔ اور بریسک۔ ہر امریکن عورت از حد انٹیلیجنٹ اور بریسک ہوتی ہے۔ اس کی وہ لکڑ سکڑ دادیاں پائنیر عورتیں جنھوں نے سخت کوشی کی زندگی گزار کر نئے ملک کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ پائنیر اسپرٹ ان کو ورثے میں ملی ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ کی انتہائی مقابلہ پرست زندگی نے اُن کے اندر جارحانہ خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔

آئیووا سٹی سے اور سیڈر ریپڈز سے کافی لوگ ہفتے میں پانچ دن کام کرنے بذریعہ ہوا شکاگو جاتے آتے ہیں۔ ویک اینڈ میں اپنی بوٹ کار کی چھت پر رکھ کر اسی انٹیلیجنسی سے برائے تفریح کسی جھیل کی طرف نکل گئے۔ دو موٹریں اور ایک کشتی مڈل کلاس کنبے کی نشانی ہے۔ غریب غربا محض ایک کار سے گذارا کر لیتے ہیں۔

شکاگو سے دوسرا طیارہ بوسٹن کے لیے پکڑا۔ بوسٹن میں پوپ کی آمد کی تیاریاں کی جارہی

تھیں اور بارش ہو رہی تھی۔ بوسٹن کی کھاڑی پر بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ یہاں دو سو سال قبل انھوں نے چائے سمندر میں پھینکی تھی اور انگلستان سے سیاسی حکومت کے انقطاع کا اعلان کیا تھا۔ لیکن نیو انگلینڈ آج تک اپنی برطانوی روایات اور باقی امریکہ کے مقابلے میں اپنی برتر تہذیب پر نازاں ہے۔ لطیفہ مشہور ہے کہ بوسٹن کے پرانے خاندان اپنا شجرہ نسب پلگرم فادرز سے ملاتے ہیں۔ یہاں کی مشہور عالم یونیورسٹیاں سترھویں صدی میں قائم ہوئی تھیں اور اس خطے کی ارسٹوکریسی کو امریکن پریس "بوسٹن برہمن" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

بوسٹن سے تیسرا دمان برائے برلنگٹن جو کینیڈا کی سرحد کے قریب ریاست ورمونٹ کا شہر ہے۔ وہ دور دراز سٹیل سے آ رہی تھی۔

"محض حسنِ اتفاق ہے یہ فال کا موسم ہے جب اپنے رشتہ داروں سے ملنے جا رہی ہوں۔ وہ لوگ وہاں پاکستان سے آئے ہیں۔"

"اوہ، پے کیسٹین۔" ضعیفہ ذرا مبہم نظر آئی۔

ابھی ایران کے یرغمالیوں کا قصہ نہیں ہوا تھا جس کے بعد سے "اسلام" اور اسلامی ممالک کا چرچا امریکن ٹیلی ویژن پر شروع ہوا۔ چند سیکنڈ غور و خوض کے بعد ضعیفہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تم عرب ہو؟"

"انڈین۔"

"وہ پھر بڑی مشکل میں گرفتار نظر آئی۔ ریڈ انڈین کو امریکہ میں محض انڈین کہا جاتا ہے۔

"انڈیا"۔ میں نے اُکتا کر کہا۔

"اوہ"۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہندو۔ ہیری کرشنا HARRY KRISHNA میری ایک پڑوسن کا لڑکا ہیری کرشنا ہو گیا ہے۔ مگر تم کاسٹ مارک نہیں لگاتیں ماتھے پر؟"

"نہیں۔"

اب کون اس بے چاری سے مغز کھپائے۔ میں نے اس کو مناظرِ قدرت کی طرف متوجہ کیا۔

آہاہا۔وہ دیکھیے کس قدر خوب صورت ہیں؟"

"واقعی—" بڑھیا نے کھڑکی سے جھانکا۔لیکن سوالات سے باز نہ آئی۔

طیارہ نیچے اُترے گا۔ باہر آ کر ضعیفہ میرے ساتھ ساتھ رہی۔

"ارے وہ دیکھو۔ ایک سفید بالوں والی ہنڈ ولیڈی بیوٹی فل اور نخیل لباس پہنے۔ یہی تمھاری کزن ہیں؟ اتنی خوب صورت، جوان چہرہ اور سفید بال۔ اور اُن کے ساتھ ایک بے حد ہینڈسم نوجوان کھڑا ہے۔ فرنچ کٹ داڑھی۔ بالکل اطالوی معلوم ہوتا ہے۔ یہی اُن کا انجینئر لڑکا ہے۔ جو برنگٹن میں رہتا ہے۔ جس سے ملنے وہ پے کیمشین سے آئی ہیں؟ وہ دیکھو وہ دونوں تمھیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے ہیں۔"

جتنی دیر میں قطار میں منتظر رہی ضعیفہ نے جو مجھ سے آگے کھڑی تھی اپنی رننگ کمنٹری جاری رکھی۔

چچازاد بہن آپا حسن (بیگم حمیرا اجری احمد سید ملاحظہ ہو" کارِ جہاں دراز ہے" جلد دوم) کے فرزندِ اکبر عمر عزیز سید عرف مٹن (ملاحظہ ہو کتاب ہذا) آج سے تیس سال قبل بہ عمر سترہ سال لاہور سے بہ غرضِ تعلیم لندن بھیجے گئے تھے جب سے مغرب میں قیام پذیر ہیں اور اب برنگٹن کی آئی بی ایم فیکٹری میں CHIPS (ڈاک کے ٹکٹ کے برابر کمپیوٹر) کی مشینری ڈیزائن کرنے والے انجینئروں کی ٹیم میں شامل برنگٹن سے چند میل دور ایسیکس جنکشن نامی قصبے میں مقیم۔

امریکہ کی ہر ریاست ایک تخلص بھی رکھتی ہے۔ مثلاً اری زونا "گرینڈ کینین اسٹیٹ"۔ ارکنسو "بہترین مواقع کی سرزمین"۔ کیلی فورنیا "گولڈن اسٹیٹ"۔ ڈیلاویر "ڈائمنڈ اسٹیٹ"۔ فلوریڈا "سن شائن اسٹیٹ"۔ جارجیا "ایمپائر اسٹیٹ آف دی ساؤتھ"۔ کیلنسس "گلِ آفتاب"۔ کینٹکی "نیلی گھاس"۔ مین "صنوبر"۔ منی سوٹا "شمالی ستارہ"۔ مسسی پی "منگولیا"۔ نیوادا۔ "سلور اسٹیٹ" بنور جرزی۔ "گارڈن اسٹیٹ"۔ نیویارک "ایمپائر اسٹیٹ"۔ (ایمپائر۔

یعنی اوّل ہلکس۔ ''تنہا ستارہ''۔ واشنگٹن ''سدابہار'' وغیرہ وغیرہ۔

مٹن کی کاروں کی تختیوں پر ''گرین اور تنین اسٹیٹ'' لکھا تھا جو ریاست ورمونٹ کا تخلص ہے۔ جنت نظیر ورمونٹ اپنے سرسبز پہاڑوں جھیلوں اور بالخصوص موسم خزاں کے رنگ برنگے پتوں والے درختوں کے لیے ساری دُنیا میں مشہور ہے۔

''اللہ میاں نے مغربیوں کو جی بھر کر ہر طرح سے مالا مال کیا۔ ایک سے ایک خوب صورت ملک۔ اور ہمیں اُٹھا کے دے دیے ریگستان۔'' آپا حسن نے دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

مٹن کی امریکن بیوی نینسی مہمان نوازی میں مصروف کمرے میں آئی۔ جب مجھے عمر نے بتایا کہ اس کی والدہ چند ماہ کے لیے پاکستان سے آرہی ہیں۔ میں سہم گئی کہ ایک تو ساس پھر پاکستانی۔ مشرقی مسلمان ساس جانے کیسی ہوں گی۔ دیکھا تو ایک نہایت اسمارٹ موڈرن بہترین انگریزی بولنے والی خاتون مسکراتی ہوئی ہوائی جہاز سے اُتریں۔ عمر نے مجھے بتایا کہ لقاں اور اُن کی بہنوں نے 1920 عیسوی میں ایک کانونٹ اسکول میں پڑھا تھا اور 1939 عیسوی میں بی اے پاس کیا تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ہندستان میں مسلمان عورتیں اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ ہو چکی تھیں۔''

اس لکڑی کی چونچ والے نقاب اوڑھے عرب عورتوں نے یہاں آ آ کر مسلمان عورتوں کے متعلق مغرب کے اسٹریوٹائپ تصورات کو مزید تقویت بخشی ہے اور خصوصاً اب وہ ٹیلی ویژن فلم ''ایک شہزادی کی موت'' گویا اس تابوت کی آخری کیل ہے۔

آپا حسن کے سگے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید صلاح الدین حیدر پارے میاں (ملاحظہ ہو ''کارِ جہاں دراز ہے'' جلد اوّل دوم) صدر شعبہ کمپیوٹر ٹیکنولوجی مک گل یونیورسٹی مونٹریال موجد اُردو فارسی عربی اسکرپٹ جنریٹنگ مشین جو ''حیدر سسٹم'' کہلا رہی تھی۔ مونٹریال سے وارد ہوئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک اور بڑا پیچیدہ ہے۔ اسلامی تجدیدیت اور اس کے ساتھ مغرب کی ایجادات کا پورا پورا استعمال۔ اسی سال سے سعودی حکومت نے پارے کا حیدر سسٹم خرید کرائے

جدہ میں حاجیوں کے انتظام کے لیے استعمال کیا۔

یہودی مسیحی مغربی تہذیب کے سائنسی اور ٹیکنولوجیکل کارناموں سے بہرہ اندوز ہونے کے ساتھ ان میڈیول معاشروں میں جو ہل چل مچی اس کا نتیجہ ایران میں سامنے آ چکا تھا۔ اور عرب ممالک ایک بحران سے کسی لمحے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔ شہزادی اور اس کے عاشق کا قتل اسی بحران کا ایک پہلو تھے۔ ہم لوگ جو ڈیڑھ سو سال سے برطانیہ کی نوآبادی رہے اس اچانک بحران کا سامنا کرنے کے بجائے ان تبدیلیوں کے اثرات کو بتدریج جھیل گئے۔ نظریاتی اور تہذیبی تصادم کا سامنا ہوش مندی سے سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے سو سال قبل کیا تھا۔ خلیجی اور سعودی عرب اس ٹکراؤ سے آج دوچار تھے اور خلائی عہد کا قرونِ وسطیٰ کی دنیا سے یہ ٹکراؤ خوفناک اور لرزہ خیز تھا۔

مغربی ٹیکنولوجی ہماری زندگیوں کا ایسا لازمی حصہ بن گئی ہے کہ ہم اس کے متعلق سوچتے بھی نہیں۔ مرزا غالب کلکتہ میں صاحبانِ فرنگ کے کمالات دیکھ کر ہی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ آج مرزا غالب کے ٹیپ ساری دُنیا میں جہاں جہاں ہندستانی پاکستانی موجود تھا گھر گھر بج رہے ہیں۔

رات کو آپا حسن نے اپنی بڑی لڑکی نازلی کے گیت بجائے۔ مرزا غالب کی غزلیں نازلی اور اس کے شوہر کے گھر پر دعوتوں میں یہ گانے ٹیپ کیے گئے تھے۔ ایک فوجی افسر نے سہگل الاپا۔ دیا جلاؤ— سخت سہاگن بن رہی تیرے مندر میں دیکھا اندھیرا۔"

"خانم خاناں۔ اب آپ۔" ایک اور افسر کی آواز آئی۔ نازلی کا شوہر آپا ضغیہ کا لڑکا بریگیڈیئر مجاہد حسین اس چھاؤنی کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ سازوں کے ساتھ نازلی کی سریلی آواز بلند ہوئی۔

"سارنگا تیری یاد میں مین ہوئے بے چین۔ وہ مہوا کا جھولنا وہ میٹل کی چھاؤں۔"

درمونٹ کے رنگ برنگے خزاں زدہ درختوں میں گھرے مغن کے دومنزلہ مکان کے خالص امریکن ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پارے کو امبو اور پیپل کا خیال آیا ہوگا تو انھوں نے ظاہر نہیں کیا۔ اپنی نوعمری میں پارے ہماری فیملی میوزک پارٹیوں کے روحِ رواں رہ چکے تھے۔

"پارے انداز کا وہ گانا سناؤ جو تم گاتے تھے۔ میری لاڈلی بنی ہے تاروں کی تورانی—

یادہ — اٹھائے جان کے ستم اور جیئے جا۔" میں نے فرمائش کی۔ "تم اور ری یہ گانے ہمیشہ گاتے تھے۔"

"بی بی" - پارے نے سادگی سے جواب دیا۔ "عرصے سے ہم گنگنائے تک نہیں۔ اگر گاتے بجاتے رہتے تو پیابجا دنہ کرپاتے۔ کسی اہم کام کی تکمیل کے لیے یکسوئی چاہیے۔"

پارے میاں نارتھ امریکن ورک اِتھک کی درخشندہ مثال بن چکے تھے۔ لاس اینجلز سے میرے بھتیجوں جلال عدنان اور منصور نے فون کیا۔ "ورمونٹ میں فیملی ری یونین بڑے زوروں میں جارہا ہے۔"

سان فرانسسکو سے بھانجی زیبا کی آواز آئی۔ امریکہ میں "نیوکلیر فیملی" محض شوہر بیوی اور بچوں پر مشتمل ہے۔ "یہاں سب کچھ ہے بس ہومین ریلیشن شپ ختم ہوگئے۔" میں نے کہا "سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ ہم لوگ نے مشرق میں اب تک کیا تیر مار لیے۔ بڑے کھاٹ پر پان چبارہے ہیں اور سمدھی کے سالے یا پھوپھی کی نند کی جٹھانی سے گپ ہورہی ہے۔ ان لوگوں نے انفرادی آزادی کی وجہ سے ہی CHIP بنالیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ چپ اگر نہ بنتا تو کیا حرج تھا۔" میں نے میز پر پڑے ڈاک کے ٹکٹ کے سائز کے کمپیوٹر کو دھیان سے دیکھ کر سوال کیا۔

شدید انفرادیت پرستی اور دوسرے شخص کی — PRIVACY کا احترام اور اپنے کام سے کام رکھنا مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ اور شدید خود اعتمادی۔ بقول شخصے ہر امریکن مجسم منشورِ آزادی بنا پھرتا ہے۔ اسی انفرادیت پرستی کی وجہ سے اس قوم نے اشتراکیت اور اشتمالیت کو ہوّا بنا رکھا ہے۔ "خوشحالی، تحفظ اور آزادی امریکن "خواب" کے اجزا ہیں۔ اور بوڑھوں کی خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ نینسی کی والدہ پچھتر سالہ بزرگ خاتون ماشاء اللہ واشنگٹن ڈی سی سے کار خود ڈرائیو کرتی اتنا لمبا فاصلہ تنہا طے کرکے بیٹی اور داماد سے ملنے آتیں۔ اور تیسرے دن واپس۔

پارے کے خسر دوسری جنگِ عظیم سے قبل برطانیہ میں لیتھویا کے سفیر تھے۔ جنگ کے بعد لیتھویا سوویت یونین میں شامل ہوگیا۔ وہ وطن واپس جانے کے بجائے کینیڈا آگئے۔ وہ میاں بیوی مونٹریال میں رہتے ہیں۔ جب کبھی بیٹی اور داماد سے ملنے آتے ہیں پارے کی بیوی ڈائنا باضابطہ

شام کا لباس پہن کر کوک ٹیلو سرو کرتی ہیں۔ ڈنر کے بعد کچھ دیر بے تکلف گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے بعد ماں باپ واپس۔ ایک ہمارے ہاں کا نقشہ ہے۔ کہ ہفتوں مہینوں عزیز و اقارب اور دوست ایک دوسرے کے ہاں پلنگوں پر نیم دراز گھنٹوں مسلسل گپ ٹھونک رہے ہیں۔ بلا اطلاع بن بلائے ایک دوسرے کے ہاں پہنچ گئے اور مسلسل گپیں اس قسم کی قبائلی اجتماعی بے تکلف طرزِ زندگی کا مغرب میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ اسی وجہ سے انھوں نے CHIP ایجاد کر لیا اور ہائی ٹیکنولوجی کے دوسرے معجز نما کل پُرزے اور اسی وجہ سے فرد کی تنہائی کا احساس بڑھ گیا۔ پہلے وہ ماہرینِ نفسیات کے پاس جاتے تھے۔ اب مہیش یوگی کے چکر میں مبتلا ہوئے۔

چنانچہ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ہمیں کھاٹ پر نیم دراز ہو کر چچی کی نواسی کی نند کے ساتھ ضرور گپیں ہانکنی چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"ہم لوگوں کے مشترکہ خاندان کی روایت کو یہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے۔" آپا حسن بولیں "نہٹور میں یا جس جگہ بھی پورا خاندان جمع ہوتا کس قدر تفریح رہتی تھی۔ 1928 عیسوی کی بات ہے۔ میں آٹھ نو سال کی تھی مگر اچھی طرح یاد ہے گویا کل کا واقعہ ہو۔ سب سے پہلا فیملی فینسی ڈریس ہوا مجھے یاد ہے سب میرٹھ میں جمع تھے۔ امی جان کمہارن بنیں۔ ابا جان کمہار۔ چھوٹی چچی جان بہشتی۔ بڑے ابا بڑی اماں جوگی جوگن۔ جوگن کے لیے ستار کسی ہندو دوست کے ہاں سے منگوایا گیا تھا وہ وقت پر پہنچا نہیں۔ چچا نثار حیدر مرحوم نے فی البدیہہ یہ نظم کہی۔ اب بھلا دیکھو۔ درمونٹ میں بیٹھ کر مجھے وہ بھولی بسری نظم یاد آئی جو بالکل ایک دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔

بیچ نکلی کمہارن جب کھلونے رات کو
دل دھڑکتا تھا موڑ پر کمہار آنے کو ہے
اک طرف جوگی ہے حیراں اک طرف جوگن ملول
سارے ساماں ہوگئے لیکن ستار آنے کو ہے
بھابی صاحب کو پریشانی میں ہوتے یاد ہیں

ڈاکٹر کا روز وعدہ ہے چمار آنے کو ہے
جانِ من بستر پر جاؤ اب بخار آنے کو ہے
ڈاکٹر یعنی "ڈاکٹر چچا وحید"۔

"شدید انفرادیت کا ایک ردعمل ہی ہوا کہ کچھ لوگ کیمون بنا کر دیہات میں رہنے لگے ہیں۔" منّن نے کہا۔

یہاں شخصی آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کسی ذیلی کلچر یا کسی متبادل طرزِ حیات کو بلا روک ٹوک اختیار کر سکتے ہیں۔ آپ کوئی سا مذہب اختیار کر لیجیے۔ کسی طرح کے کپڑے پہنئے۔ جو چاہے کیجیے۔ اگر آپ پبلک نیوسنس نہ بنیں کوئی آپ کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔

ایک رات منّن کی چالیسویں سال گرہ کا ڈنر تھا۔ امریکن دستور کے مطابق ڈنر روزانہ شمعوں کی روشنی میں کھایا جاتا تھا۔ اس رات نینسی نے سال گرہ کی شمعیں روشن کیں اور تحفوں کے پیکٹ کھولے۔ ایک تحفہ منّن کے سیاہ بلّے کی طرف سے برآمد ہوا۔

"ٹونک میں اکتوبر 1939 عیسوی کی اس رات جب منّن پیدا ہوئے کیا معلوم تھا کہ اس بچے کی چالیسویں سال گرہ ہم امریکہ کے ایک قصبے میں منائیں گے۔" آپا حسن بولیں۔

"ہر چیز پہلے سے لکھی جا چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "روشن کتاب میں۔"

"کمپیوٹر کیا کیا حل کر سکتا ہے؟" آپا حسن نے پوچھا۔

"کیا پتہ زندگی کا معمہ بھی حل کر لے۔ اگلے دس سال میں۔ آج سے تیس سال پہلے ایک کمپیوٹر کا سائز اس کمرے کے برابر ہوتا تھا۔ اس وقت یہ ڈاک کے ٹکٹ کے برابر ہو گیا ہے۔ محض دس سال میں اتنی زبردست ترقی تو آگے نہ جانے کیا کیا ہو سکتا ہے؟" منّن نے جواب دیا۔

"سن کر تو سوچ کر ڈر لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"پارے ماموں نے جو مشین ایجاد کی ہے اسے وہ دیا سلائی کی ڈبیا کے سائز کی بنانے والے ہیں۔" منّن نے مزید اطلاع دی۔

منّن کا امریکن دوست جیری پرشین آرٹ کی کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔

"یہ عمارتیں جوان حیرت انگیز لوگوں نے بنائیں آٹھ سو سال پہلے۔ یہ لوگ جدید ٹیکنولوجی اور جدید انجینئرنگ سے واقف نہ تھے۔"

متحیر و مبہوت وہ اوراق پلٹا کیا۔

"اسلامک آرٹ پر کتابیں یہاں کوئی خریدتا نہیں۔ ہم خرید لاتے ہیں۔ یہاں اسلامی تہذیب سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ ہندو فلسفے یوگا پر کتابیں البتہ دھڑا دھڑ بک رہی ہیں۔" مفّن نے کہا۔

"اسلامی تہذیب سے دلچسپی کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ اسلام آج کل محض اس سلسلے میں مشہور ہو رہا ہے کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ اس کا سر قلم کر دیا۔ اسے گولی سے اُڑا دیا۔ اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔" میں نے جل کر کہا۔

سارا نیو انگلینڈ دنیا کے حسین ترین خطوں میں سے ہے اور اس کے موسم خزاں کے ہزار رنگ دیکھنے کے لیے ساری دُنیا کے سیاح آتے ہیں۔ درختوں کے کاسنی، اودے، نارنجی، عنابی، سُرخ سنہرے پتے ایک عجیب و غریب نظارہ ہے۔ خوب صورت گاؤں پینٹنگز معلوم ہوتے ہیں۔ اور رَنگ برنگے پتوں والے شاندار بلند و بالا سایہ دار درخت آبی رنگوں کی سبک تصویریں۔

ایک پہاڑی کے اوپر پڑوسی کینیڈا کے سیاحوں کی کاریں جمع تھیں۔ نشیب میں حسین دیہاتی مکانات، گرجا گھر، کنٹری اسٹور، سلسلہ کوہ پر اور وادیوں میں نارنجی عنابی اودے کاسنی قرمزی اور عنابی پتوں والے شاندار درختوں کے جنگل، اتنا قدرتی حسن یکجا ہونا ممکن ہے۔ وادیٔ کشمیر کی طرح۔ وہاں غربت ہے یہاں بے اندازہ دولت، کوئی اللہ کا بندہ پیدل چلتا نظر نہ آیا۔ بہار ہو کہ خزاں حسن سریع الزوال ہے۔ دس دن کے اندر اندر پت جھڑ کے رنگ کہیں کہیں مرجھا چلے۔

آپا حسن پاکستان لوٹ رہی تھیں۔ میں واپس آیو واسٹی، صبح سویرے ہم لوگ نیو یارک

روانہ ہونے والے تھے۔ رات کو چاندنی چھٹکی۔ درختوں کے رنگ چاند کے رنگ میں نہائے۔ محبت شعار نینسی اداسی کے ساتھ راستے کے لیے ناشتے کے باسکٹ تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ آپا حسن نے نازلی کا ٹیپ لگایا۔ اس کی آواز جو بہت دور ملتان چھاؤنی میں ایسی ہی کسی اُداس چاندنی رات میں ریکارڈ ہوئی ہوگی بلند ہوئی۔

نظر سے چھپ رہا ہے ماہتاب آہستہ آہستہ
بکھر جائے نہ سارا شہر خواب آہستہ آہستہ

صبح منہ اندھیرے متن نے اسٹیشن ویگن اسٹارٹ کی۔ نینسی نے خدا حافظ کہا۔ آپا حسن نے آنسو خشک کیے۔ کار پُر فضا ایسکس جنکشن سے نکل کر پُر فضا شاہ راہ پر آ گئی۔

برس جائے گا نظروں کا سحاب آہستہ آہستہ
کھلے گی پھر سے یادوں کی کتاب آہستہ آہستہ

جیری اور متن باری باری ڈرائیور کر رہے تھے۔ چھ سو میل کا حسین راستہ، عظیم الشان ——— شاہ راہوں پر کاروں کی قطاریں۔ دونوں طرف سرسبز پہاڑ۔ رنگ برنگے جنگل، خوب صورت شہر اور گاؤں ——— ایک جگہ وسیع سبزہ زار کے اوپر ایک غبارہ بہت نیچے نیچے جا رہا تھا۔

"دل جلے لوگ" متن نے کہا۔ "آج کل غباروں میں سفر کر رہے ہیں۔ ایک غبارہ پچاس ہزار ڈالر کا مل جاتا ہے۔ خریدنے والے خرید لیتے ہیں۔"

نیویارک شروع ہونے سے قبل کروڑ پتیوں کے مکانات گھنے باغوں میں پوشیدہ۔ اس کے بعد اچانک سلمز۔ جلی ہوئی دھواں دھار عمارتیں اب تک امریکہ میں ہر شہر اور قصبہ اس قدر صاف ستھرا دیکھا تھا۔ ایک سڑک پر پڑا ذرا سا کاغذ کا ٹکڑا دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ اب راستوں کے کنارے کوڑے کے ڈھیر بھی نظر آئے۔ دفعتہً یہ محسوس ہوا کہ نیویارک میں انسان بستے ہیں۔

"آپا حسن — وہ دیکھیے کوڑے کا ڈھیر ———" میں اکسائٹمنٹ سے کہتی۔

"ہاں، ہاں اور وہ دیکھو۔ اتنا کوڑا ادھر پڑا ہے۔" وہ جواباً کہتیں۔

"یہ عمارتیں کیسے جل گئیں؟" ایک پُل پر سے گزرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

یہودی مسلم لینڈ لارڈ اپنے بلیک کرایہ داروں کو نکالنے کے لیے آگ لگا دیتے ہیں۔" جیری نے بتایا۔

اقوام متحدہ کی عمارت دُور سے ماچس کی ڈبیا معلوم ہوئی۔ بارش شروع ہوگئی۔ ہڈسن دریا دُھند میں چھپ گیا۔ "ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ" بادلوں میں پوشیدہ تھی۔

شام کو شہر کے ورکنگ کلاس علاقے میں ہم لوگ ایک ہندوستانی دوکان کا پتہ ڈھونڈتے پھرے جو آپا حسن کو کسی نے واشنگ مشین خریدنے کے لیے بتایا تھا۔ ایک جگہ ایک بورڈ پر دیپ یا جگدیپ اسی نام کا کوئی بورڈ لکھا تھا۔ ایک صاحب دروازے میں کھڑے تھے۔ میں ان کو بمبئی کا گجو بھائی سمجھی۔ وہ کٹر پاکستانی مسلمان نکلے۔ خاصے بدمزاج بھی تھے۔ میں نے پوچھا۔

"آپ نے دوکان کا یہ نام کیوں رکھا ہے؟"

"بولے" یہ بزنس ہے۔"

یہ منطق میری سمجھ میں نہ آئی۔ باہر سائیڈ واک پر چند غریب یہودی پھل ترکاری کے ٹھیلوں کا باقی ماندہ سامان سمیٹ رہے تھے۔ وہ مثالی غریب نیویارک یہودی تھے۔ گل موچھے۔ سر پر ٹوپیاں۔ آپس میں جھگڑ بھی رہے تھے۔ بڑا اُداس منظر تھا۔

کزن حسین کی سسرال نیویارک کے مثالی امیر یہودی ہیں۔ سنٹرل پارک ویسٹ میں رہتے ہیں۔ جو نیویارک کا بے حد مہنگا محلّہ ہے۔ شہر سے باہر اُن کی کنٹری اسٹیٹ اور ذاتی جھیل ہے۔ ان دنوں حسین اپنی سسرال میں مقیم تھے۔

جس وقت ہم لوگ سنٹرل پارک ویسٹ پہنچے، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ حسین کی عمارت کے پورچ میں وردی پوش دربان استادہ تھا۔ داخلے کا عالی شان مرمریں ہال عظیم الجثہ تازہ پھولوں سے بھرے مرمریں گل دانوں اور سنہرے صوفوں سے آراستہ۔ طویل گیلری، منقش

سنہرے بھاری لفٹ دوسرے وردی پوش چوب دار نے اوپر حسین کو فون کیا۔

اوپر شاندار فلیٹ۔ ڈرائنگ روم میں گرینڈ پیانو۔ گیلری میں حسین نے اپنے ماموں کی تصویر لگا رکھی تھی کہ محلّہ سادات نہٹور میں نیم تلے کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ گڈ اولڈ حسین۔

حسین اور اُن کی بیوی لینڈا نے چند سال قبل خاندان نہٹور کی اپنی شاخ کے پاکستان انخلا کے بارے میں ایک ناول بہ عنوان 'ریلیو جی' لکھا تھا جو نیو یارک سے چھپا۔ برصغیر کے مسلم معاشرے کے متعلق پہلا ناول تھا۔ نہایت عمدہ ریویو ہوئے۔ لینڈا کے والد مسٹر فیلڈ مین نیو یارک کے ایک معروف وکیل تھے۔ چند روز قبل انتقال ہوا تھا۔ مسز فیلڈ مین کمرے میں آئیں۔ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی (امریکن یہودی عموماً خوش شکل ہوتے ہیں) ہم لوگوں نے تعزیت کی۔ اچانک لینڈا نے مجھ سے کہا "میرے والد نہٹور میں دفن ہیں۔"

"نہٹور میں؟" میں نے تعجب سے دہرایا۔

"وہ ڈپریشن میں مبتلا تھے۔ چپ سی لگ گئی تھی۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیے حسین ان کو دتی لے گئے۔ شمر کا میں ٹھہرے۔ وہاں پہلی مرتبہ والد نے خوش ہو کر چاروں طرف دیکھا اور مہینوں بعد پہلی مرتبہ بات کی۔ کہنے لگے۔

"یہ ہوٹل مجھے بہت پسند آیا۔ کیا میں اسے سلویا کے لیے خرید لوں؟" — سلویا میری اماں کا نام ہے۔ پھر چپ سادھ لی۔ چند روز بعد حسین ان کو نہٹور لے گئے چچا شمیم حسین زیدی کے ہاں ٹھہرے۔ سارا محلّہ جمع ہو گیا۔ سارے رشتہ داران کی تیمارداری میں لگ گئے۔"

اب حسین بولا۔ "مسٹر فیلڈ مین کے لیے اس نوعیت کا اجتماعی خلوص اور مہمان نوازی انوکھی چیز تھی رات کو ان کا پلنگ صحن میں بچھایا گیا۔ تاروں بھرا آسمان بھی اس قسم کا پہلے نہ دیکھا تھا۔ چپ رہے اتنا بولے کہ ان ستاروں سے فرشتے اُتر رہے ہیں۔ تیسرے دن انتقال کیا۔"

"کفن دفن کے لیے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

لنڈا نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک مولوی صاحب نے قرآن شریف کی حضرت موسیٰؑ کے متعلق چند آیات پڑھ دی تھیں۔ لیکن حسینی اسی وقت آیا تھا۔ سے کہہ رہا تھا "رہائی وہاں کہاں سے

ملتا۔ میں نے ایک کیتھولک پادری دارجلنگ سے ہوائی جہاز پر منگوایا۔"

حسین کی عادت ہمیشہ سے گپ ٹھونکنے کی ہے۔ میں نے اس سے یہ نہ کہا کہ نزدیک کے قصبے تاج پور یا سو میل دور دلّی سے کوئی پادری آ سکتا تھا جو عہد نامہ قدیم پڑھ دیتا۔ دارجلنگ سے کیوں بلوایا گیا۔ مگر کوئی ایسی گپ چھوڑتے وقت حسین کو ٹوکنے سے اس کے اسٹائل میں فرق آ جاتا ہے۔

"مسٹر فیلڈ مین کی موت کی خبر سن کر امریکن سفیر دلّی سے تعزیت کے لیے تھور آنا چاہتے تھے۔ مگر میں اسی روز دلّی واپس آ گیا۔ مسٹر فیلڈ مین کو اپنے دادا جان کے مزار کے پہلو میں سپرد خاک کیا ہے۔" حسین نے بات ختم کی۔

ہم سب چپ ہو گئے۔ موت زندگی کی طرح ناقابلِ یقین ہے۔

ہم لوگ نیویارک سے باہر وائٹ پلینز میں ہولی ڈے اِن میں ٹھہرے تھے۔ ایک رات بارہ بجے کے قریب سنسان ہارلم سے گذر رہے تھے۔ "یہ تو بہت خطرناک جگہ ہے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"وہ دیکھیے وہ سامنے جو پُر اسرار آدمی جا رہا ہے وہ ضرور مافیا کا ہے۔" متّن نے ڈرانا شروع کیا۔

"اور وہ لڑکی دراصل خفیہ ایجنٹ۔" جیری بولے۔ "وہ ریستوران کے دروازے میں جو لوگ کھڑے ہیں، وہ لگتا ہے ابھی گولیاں چلا دیں گے۔"

نیویارک خطرناک ہے۔ اقتصادی سماجیاتی وجوہ کی بنا پر۔ زیادہ تر جرائم پیشہ یا کالے ہیں یا ہسپانک۔ ہارلم کے کالے سلمز میں رہنے والے کالے، ادیب، موسیقار، مقبول ٹی وی فن کار، نیوز کاسٹرز، افریقہ میں اپنی جڑیں تلاش کرنے والے مغرور کالے دانشور۔ (امریکن حبشی اب اپنے آپ کو بلیک کہلواتے ہیں کہ لفظ نیگرو میں تحقیر کا رویہ مضمر ہے) اس گوری دُنیا کے پہلو بہ پہلو مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دُنیا موجود ہے جس کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔

نادیا، لیلیٰ، فاطمہ

جب آپا حسن۔ مثن اور جیری لاگاردیا پراپکسرے والے دروازے کے اِدھر کھڑے رہ گئے اور میں بہ راوشکا گو اور سیڈ رہپڑز آیواسٹی سے فلاورا پارٹمنٹس چوتھی منزل پر اپنے گھر واپس پہنچی۔ باورچی خانے سے ایک سقف شگاف قہقہے کی آواز آئی۔ میں دروازہ کھول کر اندر گئی۔ ایک اجنبی کالی لڑکی دیوانی کی دیوانی میز پر بیٹھی بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ نادیا کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔

''ہلو۔ میں فاطمہ ڈیکے ہوں۔ جنوبی افریقہ سے آئی ہوئی ہوں۔ اتنے دنوں بعد پہنچی کیونکہ پاسپورٹ مشکل سے بنا (قہقہہ) راستے میں نیویارک بھٹک گئی تھی۔''

''فاطمہ کا پلے وہاں — DEF BROADWAY پروڈیوس ہونے والا ہے۔'' نادیا نے کہا۔

''اور یہ اپنے ملک سے پہلی بار باہر آئی ہے۔'' فاطمہ نے ایک زبردست قہقہہ لگایا — ''اگر تم نے نیویارک کے ٹائمنراسکوائر میں رات کے دو بجے ایک کالی لڑکی کو نشے میں آؤٹ تنہا چوراہے پر گھومتے ہوئے دیکھا ہوگا تو وہ میں ہی تھی۔'' فاطمہ نے کہا۔

''ٹائمنر اسکوائر میں آدھی رات کو تنہا —'' میں نے حیرت سے دہرایا۔ ''تم کو ڈر نہیں لگا؟ —''

''ڈر؟ — میں جنوبی افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ مجھے کاہے کا ڈر۔ ہم سخت جان لوگ ہیں۔ میرا ایک بھائی جیل میں ہے۔ ایک مارا جاچکا ہے۔ چھری پیٹی میں رکھ کر نکلتی رہی ہوں۔ میں سارے نشے کر چکی ہوں۔ ابھی رائل کورٹ لندن میں میرا ایک ڈرامہ پروڈیوس ہونے والا ہے تم دو متمدن خواتین زندگی کے حقائق کے متعلق کیا جانو۔ اور یورپ کی نستعلیق لیلیٰ اربل میری

پڑوسی ہے وہ مجھے سمجھ ہی نہیں پاتی۔ شاید تم بھی مجھے وحشی تصور کرو۔" ایک اور قہقہہ — اچانک کھڑے ہو کر ایک مکالمہ شروع کر دیا۔ پھر قہقہہ لگایا۔ "یہ میرے ایک ڈرامے کا حصہ ہے۔ میں اپنے ڈراموں میں خود ایکٹنگ کرتی ہوں۔" ایک اور قہقہہ۔ جیسے وہ ساری دُنیا کو چیلنج اور ڈیفائی کر رہی ہو۔ صبح کو لیلیٰ ارئیل بولی۔ "میں بہت ہراساں نظر آئی۔

"فاطمہ عجیب بے تکی لڑکی ہے۔ کچن میں طوفان بدتمیزی پھیلا رکھا ہے۔ رات کے دو دو بجے شہر سے لوٹ کر آتی ہے۔ پھر زور زور سے فون پر باتیں کرتی ہے۔ اونچے قہقہے لگاتی ہے۔ میرے اعصاب پر اثر ہو رہا ہے۔"

میرے اور نادیا کے باورچی خانے کی طرح لیلیٰ اور فاطمہ کا باورچی خانہ مشترک تھا۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی بے حد غلط پڑوسنیں تھیں۔ نیم یورپین لیلیٰ پُرسکون خاموش تھی۔ فاطمہ جنوبی افریقہ کی طوفانی مسلم چائیلڈ۔ لیلیٰ جتنی حسین تھیں، فاطمہ پیٹ بھر کر اتنی ہی بدصورت، قد آور، فربہ، تقریباً گُھٹا ہوا سر (امریکن کالی لڑکیاں بھی آج کل اپنا سر منڈوا رہی ہیں) موٹے شیشوں کی عینک، تنگ جینز میں ملبوس پہاڑ کی پہاڑ — اور بے حد پُرخلوص اور فطری۔ چند روز میں لیلیٰ فاطمہ کی ہنگامہ خیز موجودگی کی عادی ہو گئیں۔ مذہباً فاطمہ عیسائی تھی۔

"میری ماں نے اپنی ایک مسلمان درزن دوست کے نام پر میرا نام رکھا تھا۔ میں کبھی کبھی گرجا ہو آتی ہوں۔" اس شام اس نے ہمارے کچن میں آ کر دہاڑنا شروع کیا۔ "تم اور نادیا میرے لیے مصری اور ہندستانی کھانے تیار کرو۔ ورنہ میں تم دونوں کو مکھیاں بنا دوں گی۔" میں افریقہ کی جادوگرنی ہوں۔ میرا پردادا عیسائی ہونے سے پہلے اپنے قبیلے کا خوفناک ساحر تھا۔ پلاؤ تیار کرو ورنہ میں ابھی اپنا دوڈو چلاتی ہوں۔"

"میں فراعنہ کی اولاد ہوں۔ سحر تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں پہلے تم کو مچھر نہیں بنادوں گی۔" نادیا نے جواب دیا۔

"اور تم بھولتی ہو کہ میں اس سے قبل تم دونوں کو کوّے بنا کر خود بذریعہ انڈین یورپ ٹرک غائب۔" میں نے کہا — اسی وقت چودھری محمد نعیم کا شکاگو سے فون آیا — "کل صبح —" انھوں

نے کہا۔ ''ایر پورٹ پر جان ہاسن صاحب آپ کو موجود ملیں گے۔''

اندر کچن میں فاطمہ نے میز پر مکہ مارا۔ اور چلائی ''انڈین روپ ٹرک غائب۔''

''معاف کیجیے گا۔'' میں نے چودھری صاحب سے کہا۔ ''وہ دراصل مصر اور جنوبی افریقہ کی ادیب خواتین ذرا اس وقت چند اہم ادبی مسائل پر مصروف گفتگو ہیں۔''

ہاہاہا۔ ہوہوہو۔ فاطمہ دہاڑا کی۔

ہواؤں کا شہر

چودھری محمد نعیم صدر شعبہ اُردو نے شعبہ جنوبی ایشیائی علوم یونیورسٹی آف شکاگو کی طرف سے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر نادیا بنتائی برائے سیر و تفریح ہم راہ چلیں۔ شکاگو او ہیئر کے صدر دروازے سے نکل کر نوئمر جان ہیلسن صاحب (موصوف بھی آگ کا دریا پر مضمون لکھ چکے تھے) نہایت فصیح و بلیغ شستہ بامحاورہ اُردو صحیح لہجے میں بولتے جھیل مشی گن کے کنارے کنارے ہوٹل ونڈ میر کی طرف چلے۔

شکاگو کہ مستقل تیز ہواؤں کی زد میں رہتا ہے۔ پچھلی صدی میں اسکائی اسکریپر سب سے پہلے یہیں تعمیر ہوئے۔

''محض شکاگو میں چھ یونیورسٹیاں ہیں۔ اس ملک ہی میں ہر چیز بے تحاشا ہے۔'' نادیا نے اظہار خیال کیا۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے کیمپس کے نزدیک پرانی وضع کے ونڈ میر ہوٹل میں میرے دریچے کے سامنے جنگل تھا جس میں صبح سویرے ایک خاتون ایک مختصر سے سفید کتے کی زنجیر سنبھالے ہوا خوری کرتی گذرتی تھی۔ صبح صبح ہوٹل کے اندر چھ سات بوڑھی عورتیں ہیروں سے لدی، میک اَپ کیے دستانے پہنے برق رفتار لفٹ سے اُتر کر نیچے لوبی میں صوفوں پر بیٹھ جاتیں اور سامنے سے گذرنے والوں کو گڈ مارننگ کہتیں۔ اس اُمید پر کہ کوئی دومنٹ رُک کر ان سے بات کرے گا۔ وہ سب دولت مند بیوائیں تھیں جن کی اولاد حسب قاعدہ ان کو اپنے ساتھ نہیں رکھتی یا لاوارث تھیں۔ ان میں سے ایک ضعیفہ جس کی وہیل چیئر اس کی طویل القامت لیڈی کمپنین دھکیلتی تھی۔ یہ لڑکی شکلاً یہودی معلوم ہوتی تھی اور وہ ضعیفہ لاوارث تھی تو یقیناً اس لڑکی کے نام اپنی دولت چھوڑ جائے گی۔

یہ تنہا اُداس بڑھیاں آج سے نصف صدی قبل جوان لڑکیاں رہی ہوں گی۔ اپنے شوہروں یا دوستوں کے ساتھ لگژری لائنرز پر یورپ کی سیاحت کے لیے جاتی ہوں گی۔ آج کوئی بات کرنے کا روادار نہیں۔ تفریح گاہوں میں اُن کی جگہ اَوروں نے لے لی۔

شکاگو میں اَن گنت تھیٹرز ہیں۔ اوپیرا، بیلے، میوزیم۔ امریکہ کا اہم ادبی اور تہذیبی مرکز ہے۔ مشہور زمانہ میوزیم کے سامنے طویل قطاریں اندر جانے کی منتظر تھیں۔ پیرس سے تولوس لاترک کی نمائش آئی ہوئی تھی۔ یہی فن پرست شہر ڈاکوؤں کا اڈہ بھی ہے۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے مشہور عالم انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل آرٹ کے اندر اشوریہ اور مصر قدیم کے ایوانوں میں اُستانیاں طلبا کی ٹولیوں کو لیکچر دیتی پھر رہی تھیں۔ مصر کی ہر اچھی چیز کا رشتہ نادیا عہد فراعنہ سے جوڑتی ہے۔ ہمارے ہاں بات بے بات اشوک یا شاہجہاں یا اورنگ زیب یا شواجی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں کافی نعم البدل ہے۔ کوئی انگریز یا جرمن یا اطالوی اُچھل اُچھل کر شیکسپیئر اور گوئٹے اور مائیکل انجلو کے گُن نہیں گاتا۔ ہم کالی داس، ٹیگور، غالب کا وظیفہ کرتے کرتے بے حال ہوئے جاتے ہیں۔ بھوکوں مر رہے ہیں، حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں مگر اپنی کلچر کا راگ الاپنے سے باز نہیں آتے۔ ایک امریکن نے حال میں ایک خاصا جلا کٹا مضمون لکھا۔ اس نے تیسری دُنیا کو ZOO NATION کہا تھا جن کی خصوصیات "تاریخ، تہذیب اور گھریلو صنعتیں ہیں۔ اور جو اقتصادی طور پر اتنی پس ماندہ ہیں کہ مغرب کی سطح تک پہنچنے میں ان کو سو سال لگیں گے اور اس وقت تک مغرب مزید ایک سو سال آگے نکل چکا ہوگا۔

اور دُنیا کی بلند ترین عمارت ایک سو چھ منزلہ سیئرز ٹاورز میں جٹ لفٹ نے ایک منٹ کے اندر آخری منزل تک پہنچایا جہاں سے جگمگاتا شکاگو ایک فنٹاسٹک اور منفرد نظارہ تھا۔ اور پلے بوائے کی بلند عمارت کے اوپر سرچ لائٹ گھوم رہی تھی۔ مبادا کوئی طیارہ عمارت سے ٹکرا نہ جائے۔ یوحنان نے اپنے مکاشفے شہر بابل کو بھی دیکھا تھا۔

چودھری محمد نعیم کہ پارے اور مٹن کی طرح عرصہ دراز تک امریکہ میں مقیم رہنے کی وجہ سے صالح مغربی رویے اختیار کر چکے تھے۔ اور فضولیات، خرافات، تضیع اوقات اور بے وقوفوں کو

برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک شام جب تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوٹل ونڈمیر کے نزدیک ساؤتھ ہائیڈ پارک میں واقع اپنے وسیع اپارٹمنٹ کے کھانے کے کمرے کی میز پر رکابیاں سجاتے ہوئے اُنہوں نے مطلع کیا کہ "کار جہاں دراز ہے" کی قسم کا موضوع یہاں یونیورسٹی آف نیویارک کے ایک امریکن ماہر عمرانیات نے منتخب کیا ہے۔ وہ شمالی ہند کے مسلمان گھرانوں کے شجروں اور شادیوں کے نٹ ورک پر کام کر رہے ہیں۔

دلّی کے کائستھوں کے نٹ ورک کی ایک رُکن یعنی میری دوستوں شانت اور اوم بہادر کی کزن کرونا بہادر عرصہ دس سال سے شکاگو میں بطور ماہر نفسیات ملازمت کر رہی تھی۔ میز پر اپنے مقابل میں بیٹھی نادیا بشائی سے کہہ رہی تھی۔

"یہاں چرچ اور فیملی لائف کا بریک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ ماں باپ اور پادری کی جگہ اب ہندستانی سوالی لے رہے ہیں۔ یہاں بھی اور سارے مغربی یورپ میں۔ اس کے برعکس یہاں بس جانے والے ہندستانیوں پاکستانیوں کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ اُن کی لڑکیاں جو یہیں پیدا ہوئیں یا پروان چڑھیں ان کو ہندستانی یا پاکستانی اخلاقیات پر قائم رہنے کے لیے کس طرح مجبور کریں۔"

"یہ مسئلہ انگلستان کے براؤن مہاجرین کے سامنے بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"PILL کی ایجاد کے ساتھ یہاں ایسی جنسی آزادی آئی ہے جو دس پندرہ سال قبل یہاں بھی موجود نہیں تھی۔ میرے امریکن دوست متعجب رہتے ہیں کہ میں — DATING کیوں نہیں کرتی اور جب میں ان سے کہتی ہوں کہ یہ ہماری تہذیب اور طرزِ زندگی کے منافی ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ تمہارے پرانے کائستھ تہذیبی NET WORK کا اثر ہے۔ ورنہ DATING تو اب ہندستان میں بھی رائج ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں مگر میں پچھلی نسل سے تعلق رکھتی ہوں۔" کماری کرونا نے جواب دیا۔

آنسہ نادیا نے سر ہلایا "میں تمہاری صورتِ حال سمجھتی ہوں کیونکہ میں بھی مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک مصری قدامت پرست روایات و تمدن کی پروردہ ہوں۔"

باہر بارش کے ساتھ تیز ہوا چل رہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کرونا بہادر اُٹھ کر گیلری میں گئی دروازہ کھولا۔ چند گورے امریکن بچے نقلی چہرے لگائے کھڑے تھے۔ چودھری نعیم نے ٹافیوں کے ڈھیر دروازے کے قریب پہلے سے رکھ دیے تھے۔ کرونا نے بچوں کو ٹافیاں دیں اور وہ واپس آ گئے۔ وہ ہیلوا ین تھی۔ ALL SOULS DAY کی مقدس شام۔ ایک قسم کی مسیحی شب برات۔ جب تمام عیسائی مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ آدھے کدو پر بھتنوں کی شکلیں بنا کر کدو کی شکلیں بنائی جاتی ہیں اور ان شکلوں کے اندر شمع جلائی جاتی ہے اور وہ کدو دریچوں میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ بچے بھتنوں کے مصنوعی چہرے لگا کر گھر گھر جاتے ہیں اور مٹھائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

"شکر ہے کہ کچھ پرانی روایات تو ابھی یہاں بھی باقی ہیں۔" نادیا نے کہا۔

دروازے کی گھنٹی پھر بجی کرونا نے جا کر ٹافی دی اور واپس آئی۔

"چاند اور زہرہ کی طرف جانے والے راکٹوں میں شمعیں جلا کر یہ آدھے کدو رکھ دیے جائیں تو کیسا رہے"۔ میں نے کہا۔

صبح سویرے نادیا قطبیہ آیواشی واپس گئی اور چودھری نعیم اپنی اودھی مسلمان روح کے ساتھ اور راماجن اپنی تامل روح کے ساتھ شکاگو میں رہتے ہیں۔ دونوں بہ زبان انگریزی اچھی نثر و نظم لکھتے ہیں اور چودھری نعیم سے ایک آسٹریلین اُردو پڑھ رہا ہے۔

ایک شام ہم لوگ مع آسٹریلین میڈلن روانہ ہوئے۔ چودھری صاحب شکاگو پیچھے چھوڑ کر فری وے پر آئے۔ شہر کی عمارتیں جورات کو منور سنگلاخ پہاڑ معلوم ہوتی تھیں پیچھے رہ گئیں۔

راستے میں ایک ریستوران میں مَیں نے اس بندہ خدا سے جو اُردو پڑھنے آسٹریلیا سے شکاگو آیا تھا، دریافت کیا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے؟"

"میرانیس"۔ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "سوال یہ ہے کہ اگر ہم لوگ شیکسپیئر سمجھ سکتے ہیں تو وہ آسٹریلین میرانیس کیوں نہیں سمجھ سکتا۔

گو شب برات اور ہیلوا ین میں بڑا فرق ہے۔

دُور کی بانسری کے سُر

اور شکاگو سے دو سو میل دُور شمالی ریاست وِس کون سن کے شہر میڈیسن میں ڈاکٹر محمد عمر میمن کے گھر پر رات کے وقت جب ہم لوگ پہنچے تو وہاں ڈیوک یونیورسٹی کے پروفیسر بروس لارنس کو برطانیہ کے مستشرق سائمن ڈگبی کے ساتھ کشف المحجوب پر تبادلۂ خیالات کرتے پایا۔ معقول۔ پروفیسر لارنس نے خواجگان چشت پر کتاب بعنوان NOTES FROM A DISTANT MUTE لکھی تھی جسے ''زیر سرپرستی ایمپرس فرح پہلوی ایمپیریل ایرانین اکیڈمی آف فلاسفی۔'' (جس کے ڈائرکٹر سید حسین نظر تھے نے 1978 عیسوی میں طہران سے شائع کیا تھا۔ ایک سال بعد 2 نومبر 1979 عیسوی کی اس رات وہ ایمپریس بحیثیت ایک جلاوطن بیوی اپنے بے تخت وتاج شوہر کے علاج کے لیے نیویارک کے ایک ہسپتال میں مقیم تھیں اور صرف دو دن بعد طہران میں امریکن یرغمالیوں کا دھماکہ ہونے والا تھا۔

تو کیا خواجگان چشت بے ثباتی ثروت وجاہ کے ان معاملات کو بہت پہلے پہچان چکے تھے۔

دوسری کتاب پروفیسر لارنس کی صوفیائے بیجاپور تھی۔ اور اُن کے بے حد ذہین اور شگفتہ فراخ میزبان محمد عمر میمن کی ضخیم کتاب ابن تیمیہ پر ہالینڈ سے چھپ کر آگئی تھی اور ابن تیمیہ صوفیا کے شدید مخالف تھے۔

بانسری کے مختلف سُر

یونیورسٹی آف وِس کون سن میں ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کی آٹھویں سالانہ کانفرنس منعقد ہورہی تھی جس کے لیے کئی سو مستشرق انڈولوجسٹ ماہر اسلامیات و عمرانیات و لسانیات وغیرہ وغیرہ سارے شمالی امریکہ اور برطانیہ سے آیا تھا اور آئی تھی۔ بوڑھے پھونس پروفیسر پرسیول اسپیرز اور مس میری تھیچر انگلستان سے تشریف لائی تھیں۔ مس تھیچر نے راج کے زمانے میں انگریز سویلین اور فوجی افسروں وغیرہ کی کھینچی ہوئی بہت پرانی ہوم مُووِیز کو جوڑ کر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی تھی۔ راج کی برٹش کولونیل معاشرتی زندگی کی جھلکیاں جو خالص راقم الحروف کا موضوع تھا۔ "برٹش فکشن میں انڈین اسٹریوٹائپ۔" اور انڈین فکشن میں برٹش اسٹریوٹائپ اور "انڈین فکشن میں برٹش اسٹریوٹائپ" کے سیمینار میں یونیورسٹی آف مسوری کی میری لاگو نے ای ایم فورسٹر، کولمبیا کے ڈاکٹر رو بن لوئیس نے

LEARNING HOW TO RULE AN EMPIRE.

STEROTYPES IN VICTORIAN BOYS.

LITERATURE——

یہ مقالے پیش کیے اور ناچیز نے "آخرِ شب کے ہمسفر" میں سے "چارلس ہارلو بنگال سویلین" والا باب تلخیص و ترجمہ کرکے پڑھا۔

اسلامی سوانح عمریوں اور ملفوظات کے سیمینار میں وِس لارنس نے فوائد الفواد و سیر الاولیا وغیرہ یونیورسٹی آف ورجینیا کے پروفیسر رچرڈ بارنٹ نے نواب شجاع الدولہ کی اٹھارھویں صدی کی سوانح عمریوں اور ڈیوک یونیورسٹی کے ڈاکٹر منظم صدیقی نے چہار عنصر اور دوسری کتابوں میں مرزا بیدل کی سوانح حیات پر مقالے پڑھے۔ سامعین وشر کالاؤنج میں صبح کو جمع ہوکر اُن گنت

سیمیناروں میں سے اپنی پسند کا موضوع چن لیتے۔

تاریخ دہلی کے سیمینار میں نئی دہلی کی تعمیر پر جو صاحب بولے وہ ڈاکٹر سجاس چکرورتی نکلے۔ جن کی کتاب FROM OX US TO KHYBER پر میں نے دو سال قبل ٹائمز آف انڈیا میں ریویو آرٹیکل لکھا تھا۔ آکسفرڈ کے پروفیسر یمن ڈگبی (لمبی داڑھی۔ خود بھی صوفی منش) خواجگان چشت کے شجرات خلفا پر اپنا مقالہ لے کر ایک شام محمد عمر یمن کے گھر آئے۔ کارِ جہاں دراز جلد اوّل پیانو پر رکھی تھی۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک فٹ نوٹ پر ٹھٹھک کر نوعمر ڈاکٹر رچرڈ بارنٹ نے مجھ سے کہا ''کمال الدین حیدر رامپور کے نقطۂ نظر سے لکھتا تھا''۔ اور پھر صفحات پلٹنے لگا۔

ڈنر کے دوران میری تھیچر کی ڈوکومنٹری فلم کا ذکر نکلا۔ وہ فلم خود میرے لیے بہت نوسٹلجک تھی۔ کیمپ لائف سول لائنز کلب۔ سرکٹ ہاؤس، پہاڑ پر جانا، ہاتھیوں پر سواری وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب میرے اپنے بچپن کے مناظر تھے۔ اور کیا پتہ یہ ڈھندلی ہوم مووِیز جو اُن ''بڑے صاحب لوگوں'' نے کھینچیں ان میں سے چند بچپن کی وہی مانوس ہستیاں رہی ہوں۔ میجر گیریڈ، مسٹر پیندرسول۔ مسز ڈی پی ہارڈی، میری تھیچر، بتا رہی تھیں کہ اس فلم کی تیاری کے لیے انھوں نے بہت پاپڑ بیلے۔ انڈین سول سروس والے بڈھے مرکھپ گئے۔ ان کے ورثا کو ڈھونڈا۔ ان لوگوں نے اپنے مکانوں کی پرچھتیوں میں جمع کاٹھ کباڑ میں سے یہ ڈھندلی ہوم مووِیز نکال کر دیں۔''

''میں نے کہا'' شاید اسی وجہ سے آپ کا چارلس بارلو بنگال سولیین اس فلم کا ایک حصہ معلوم ہوا'' کسی نے اظہار خیال کیا۔ آج کل انگلستان میں راج کا نوسٹلجیا زوروں میں جا رہا ہے اور غدر کے متعلق اس زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں کی بڑی مانگ ہے۔''

پروفیسر سائمن ڈگبی ڈلفیں جھٹکار کر بولے ''موصوف یقیناً کہیں سجادہ نشینی کر سکتے ہیں—''

''ہمارے ہاں ایک اَدھ جلی کتاب تھی۔ مریم دی اسٹوری آف دی میوٹنی۔ جو شاید غدر کے دو تین سال بعد چھپی تھی۔ یہ کتاب میرے پردادا امیر احمد علی کے بچے کھچے ذخیرۂ کتب میں

بڑی ملی تھی۔ ناول تھا۔ مریم۔ انگریز یا ہندستانی ہیروئن کا نام رکھا ہوگا۔ نیلے رنگ کی جلد تھی۔ ناول کے آخر میں شاہ نعمت اللہ ولی کی طویل نظم کا انگریزی ترجمہ شامل تھا۔ اس میں لکھا تھا یوں مغل سلطنت قائم ہوگی وغیرہ اور یہ کہ فلاں زمانے میں پنجاب میں خون کا چھنا دریا بہے گا۔ 47 عیسوی کے ہنگامے میں وہ اُدھ جلی کتاب شاید پوری جل گئی۔ میں نے اس کا نام کسی کیٹلاگ میں بھی نہیں دیکھا۔"

فویلز کے ہاں تلاش کیجیے گا۔" میں نے مولانا سائمن ڈگبی سے کہا۔

"اس قسم کی نظمیں الحاق ہوتی ہیں۔" محمد عمر یمن نے کہا۔ سکھوں کی جنم ساکھیوں کی طرح جس میں زار روس وغیرہ کے متعلق پیش گوئی موجود ہے۔"

"درست" — میں نے جواب دیا۔

"71 عیسوی میں بنارس سرکٹ ہاؤس کے مسلمان خانساماں نے مجھ سے کہا تھا بیٹا آج کل یہاں مسلمان محلّوں میں شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشن گوئی کا بڑا چرچا ہے۔ وہ بتا گئے تھے کہ مشرقی پاکستان میں یہ سب ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کسی بھی کرائسس کے موقع پر عوام کے ہاں شاہ نعمت اللہ ولی اچانک کیوں نمودار ہو جاتے ہیں۔ بڑی ڈراؤنی بات ہے۔"

ٹیلی ویژن پر خبریں شروع ہوئیں۔ طہران کے امریکن سفارت خانے میں ترپن امریکنوں کو بہ طور یرغمال محبوس کر دیا گیا۔

ہر چینل پر تہلکہ مچا ہوا تھا۔ وہ 4 نومبر کی رات تھی۔ "بڑی ڈراؤنی بات ہے۔"

میں نے دہرایا۔

"کاش وہ اُدھ جلی نیلی کتاب پوری نہ جلتی۔

محمد عمر یمن کی خاموش طبع پرسکون جاپانی بیوی نے اپنے بچوں کو کھانے کے لیے بلایا—

"کیا آپ واقعی ان سب ناقابلِ اعتبار ہوائی باتوں میں یقین رکھتی ہیں؟—" ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"ایک طرف محمد عمر یمن کے عقلیت پرست ابن تیمیہ ہیں اور دوسری طرف افسانوی شاہ

نعمت اللہ ولی اور اُن کا سارا قبیلہ۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ شاہ نعمت اللہ ہی کو ترجیح دوں گی۔" میں نے جواب دیا۔

موسم سرما شروع ہو رہا تھا۔ آیوواسٹی میں بھی درخت اپنے سُرخ اور زرد اور عنابی پتے تیزی سے گرا رہے تھے۔ انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام کے لیے مشہور امریکن ادیبوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جوزف ہلر ااسنوڈ گراس، لوئیس سمپسن، ہورٹینس کیلی شر، کرٹس ہارنیک، کالا ناولسٹ، اسامیل ریڈ، امریکن یہودی اور کالے ادیب بہت زیادہ قابلِ ذکر چیزیں لکھ رہے تھے۔ کیلی شر اور جوزف ہلر دونوں یہودی تھے۔ ایک روسی ناولسٹ سوویت یونین سے آئے تھے۔ جن دنوں میں ورمونٹ گئی ہوئی تھی وہ ے فلاور میں مع ترجمان ہفتہ بھر ٹھہرے۔ یونیورسٹی میں ان لوگوں کے لیے لیکچر ہوئے اور پروفیسر کے ہاں دعوتیں اور ادبی محفلیں۔

آیواسٹی "ادیبوں کا چورا ہا" کہلاتی ہے۔ مقامی ادبی محفلیں کیمپس پر عموماً جز بک اسٹور اور ویٹ ہار میں منعقد ہوتی تھی جہاں لوگ باگ اپنے افسانے پڑھتے یا کلام سناتے اور اس پر بحث بحثی ہوتی لیکن نہایت تہذیب کے ساتھ گھٹیا ریمارک ذاتی حملے فقرے چھینٹے جلی کٹی گفتگو ان لوگوں کا شیوہ نہیں۔ کیونکہ ان کو وہ ذاتی فرسٹریشن نہیں جو تیسری دُنیا کے محروم و مفلس ادیبوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ مغربی ادیب ایک SUPER AEELUENT ٹیکنولوجیکل معاشرے کے پیدا کردہ مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ تیسری دنیا کا ایک لیکھک جب اس معاشرے میں شامل ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

یاسمین مغل کے مڈل کلاس کوئی مسلمان والدین رتنا گیری کے باشندے ہیں۔ وہ خود آج سے گیارہ بارہ سال قبل ایک اسکالرشپ حاصل کر کے بمبئی سے امریکہ گئی۔ وہاں ایک کالے سے شادی کر لی۔ شادی ناکام رہی۔ دوسری شادی ایک انڈین مسلم انجینئر سے کی۔ کیلی فورنیا میں رہتا ہے۔ سال بھر سے وہ رائٹرز ورک شاپ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کرنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کی دعوتوں میں یاسمین ایک بونے انگریز شاعر کرس کے ساتھ اکثر آتی رہتی تھی۔ ایک

شام پیٹر اور میری ناضرۃ کے گھر پر اس نے مجھ سے کہا "میں تم کو اپنا ناول دکھانا چاہتی ہوں جو میں لکھ رہی ہوں، اور تمھاری رائے چاہتی ہوں۔"

"رائٹرز ورک شاپ میں تم لوگ کیا کرتے ہو؟"۔ میں نے پوچھا "لکھنا سکھایا نہیں جاسکتا یہ خداداد صلاحیت ہے۔ امریکن یونیورسٹیوں کے یہ رائٹنگ اور شاعری سکھانے کے ورک شاپ میری سمجھ میں آج تک نہ آئے۔"

"اس خداداد صلاحیت کو سنوارا بھی جاسکتا ہے۔ سُریلی آواز والے لوگ استادوں سے کیوں گانا سیکھتے ہیں؟"۔ یاسمین نے پوچھا۔

"پرفورمنگ آرٹس اور تخلیقی لکھائی میں بہت فرق ہے۔" میں نے جواب دیا۔ ہم لوگ اپنے افسانے ناولوں کے باب اور نظمیں لکھ کر ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں اور ہمارے پروفیسر لکھنا سکھاتے ہیں— ٹینسی ولیمز شیورز اور فلپ روتھ سب اسی آیووا رائٹرز ورک شاپ کے تربیت یافتہ ہیں اور ٹینسی ولیمز کا ڈرامہ— THE GLASS MENAGERIE یہاں کی کلاس میں مسترد کردیا گیا تھا۔

میں ایک ناول لکھ رہی ہوں۔ ایک مڈل کلاس ہندستانی مسلمان لڑکی کا مغرب سے ٹکراؤ۔ اس کے جذباتی اور روحانی کرائسس، آٹو بایو گرافیکل ناول ہے۔ تم کم از کم اس کے چند حصے پڑھ کر مجھے مشورے دو۔ اگلے ہفتے میں وینٹ بار میں اس کے چند باب پڑھوں گی۔ کرس اپنی نظمیں سنائے گا۔ میں نے انٹرنیشنل رائٹرز پروگرام کے سارے ادیبوں کو مدعو کیا ہے۔

یاسمین کی نصب جبشی چار سالہ بچی نفیسہ آیووا ریویو کے کالے اڈیٹر کی گود میں بیٹھی چہک رہی تھی۔ اس محفل میں زیادہ تر لوگ گورے تھے۔ نادیا مصری، میں، پیٹر اور میری ایشیائی لیکن نفیسہ بالکل جبلی طور پر اس کالے اڈیٹر کی گود میں جا بیٹھی۔

ڈسکو رقص شروع ہوا۔ وہ بے تکان ناچی۔ یہ بھی اس کے افریقی خون کا اثر تھا۔ پارٹی کے اختتام پر کرس نے اپنی وہیل چیئر کا رُخ دروازے کی طرف کیا۔ کرسٹفر ایک بونا انگریز شاعر رائٹرز ورک شاپ میں یاسمین کا ہم جماعت تھا۔ برکلے میں پڑھ چکا تھا۔ بلحاظ قد و قامت چار سال کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ پیٹھ پر بڑا سا کوبڑ۔ چلنے پھرنے سے قطعی معذور ننھے ننھے ہاتھ اور بے حد

مختصر ٹانگیں لیکن حسین چہرہ، سنہری داڑھی اچھا خاصا جیزس کرائسٹ معلوم ہوتا تھا۔ قطعی سیلف کونشس نہیں تھا۔ معذور اپاہج لوگوں کے لیے جو خاص بسیں چلتی تھیں اپنی وہیل چیئر سمیت کسی ایسی بس پر سوار ہو کر خود ہر پارٹی میں پہنچ جاتا تھا۔ قہقہے لگاتا تھا۔ بحثیں کرتا تھا۔ سارے یورپ اور امریکہ کی تنہا سیر کر چکا تھا۔

آیوواسٹی کے اَن گنت ریستوراں طرح طرح سے سجے ہوئے تھے۔ ایک طعام خانہ بادبانی بحری جہاز کے نمونے کا تھا۔ ہم جنس لوگ اور شاعر اویب ویٹ بار کی سرپرستی کرتے تھے (بے حد آواں گارڈ قسم کے لوگ اکثر ہم جنس تھے) ایک کہر آلود شام ویٹ بار کا ایک ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب کرسلفر نے اپنی نظمیں سنائیں۔ پھر بولا ”میں نے فارسی غزل کے فارم میں چند غزلیں لکھیں ہیں وہ بھی سنو۔“ اور غزل کی تشریح کی۔

یاسمین مغل نے اپنے ناول کے چند ابواب جستہ جستہ پڑھے۔ وہ ایک باصلاحیت اور حساس رائٹر تھی جیسا کہ وہ مجھے بتا چکی تھی۔ وہ ناول شفاف بے حد تھی خود نوشت سوانح تھا۔ امریکہ آنے سے قبل ایک متوسط الحال مسلمان لڑکی کا طرزِ حیات باپ بائیکلہ پولیس اسٹیشن کا انچارج۔ وہ خود برقعہ پوش ماں کے ساتھ حاجی علی کی درگاہ پر جایا کرتی ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس ماحول کا تصور کیا (جس سے وہ مغربی سامعین بالکل ناواقف تھے اور اُن کے لیے وہ ایک EXOTIC ایکزوٹک ماحول) اور پھر اس اواگارڈ طعام خانے کے ایک نیم تاریک کمرے کے اسٹیج پر بیٹھی ہوئی بے حد خود اعتمادی اور بے باکی کے ساتھ اپنا ناول سناتی اس نیم امریکن لڑکی پر نظر ڈالی جس نے امریکہ میں جنسی تجربات کا تذکرہ بے حد صفائی سے قلم بند کیا تھا۔ اگر وہ ناول امریکہ میں چھپا ہندستانی پس منظر کی وجہ سے بالخصوص پسند کیا جائے گا (جنسی بے باکی اب کوئی قابلِ ذکر بات نہیں رہی۔ پچھلے چند سال میں ہر ان کہا رویہ مقفل الماریوں سے نکال کر جھاڑا پونچھا جا چکا ہے۔ وہ لوگ اب اپنی مکمل جنسی آزادی سے بھی اُکتا چکے ہیں۔ مرد اور عورت کا بغیر شادی کے اکٹھے رہنا قبول کیا جا چکا ہے۔ کیمپس پر ہم لوگ دو تین ایسے جوڑوں کے گھروں پر ڈنر کے لیے جا چکے تھے۔ اس نئے طرزِ زندگی کا اب ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہندستان میں یاسمین کا

ناول بہت مقبول ہوگا) چند روز بعد یاسمین نے رائٹرز ورکشاپ کے ڈائرکٹر کے ہاں اپنی سالگرہ کی دعوت کی۔ موصوف کو ان کے شاگرد بھی محض جیک کہہ کر پکار رہے تھے۔ مرغن ہندستانی کھانا پکایا۔ ڈنر کے بعد رائٹرز ورکشاپ کے لبنانی نژاد پروفیسر وانس بورژیلی (جو ایک معروف مصنف تھے) وائلین بجایا کیے۔ دو پروفیشنل موسیقار رات کے گیارہ بجے اپنے گٹار سنبھالے آن پہنچے۔ ان میں سے بے حد موٹا لڑکا بالکل گلیکسو بے بی معلوم ہوتا تھا۔ جیک کے میوزک روم میں ڈسکو شروع ہوا۔ کرس اپنی وہیل چیئر فلور پر لے آیا۔ جوش و خروش سے گاتا رہا۔ اتنے ننھے سے پھیپھڑوں سے اسکائی لاک کی طرح اس کی اتنی طاقتور آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ ناچتا تو کیا کھڑے ہونے سے بھی معذور تھا۔ مگر نہایت جوش اور ولولے سے اپنی وہیل چیئر فلور پر گھما گھما کر گویا رقص میں شامل رہا۔ ''مغربی انسان کی ہمت اور جواں مردی کی روشن مثال۔'' نادیا نے آہستہ سے اظہار خیال کیا۔ یاسمین اس کی وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ ناچتی رہی۔ وہ گلا پھاڑ کر گاتا گیا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے ایک امریکن لڑکی نے پیانو کے پاس جا کر ایک دل دوز گیت اُداسی کے ساتھ گانا شروع کیا۔ کرس اچانک خاموش ہو گیا اور اداسی سے اس کا گیت سننے لگا۔ گلیکسو بے بی گٹار بجاتا رہا۔ باہر باغ اور خیابان خزاں کے زرد اور عنابی پتوں سے پٹ چکے تھے۔ دو رویہ خوب صورت دو منزلہ مکانوں میں روشنیاں بجھتی جا رہی تھیں۔ یاسمین کی بچی نفیسہ بجلی کی طرح ناچنے کے بعد تھک کر سو چکی تھی۔ دیوار کے سہارے بیٹھے پیٹر ناصرۃ نے ماؤتھ آرگن جیب میں ڈالا۔ وہ ماؤتھ آرگن کا ماہر تھا۔ پروفیسر وانس نے اپنا مینڈلین کیس میں بند کیا۔ لڑکی نے گیت ختم کیا۔ ایک لمحے محض ایک لمحے کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ کرس نے اپنی متحرک کرسی دروازے کی جانب موڑی۔ باہر خیاباں کے زرد برقی چراغوں کی روشنی میں پت جھڑ کے کھڑکھڑاتے سرسراتے فرش رات کی بھٹکتی روحوں کے منتظر تھے۔ دوستوں کے جشن کرتے ہوئے پتے ہیں۔

اسرائیلی رائٹر زاسحق اوپاز اور ہالینڈ کی تھیا نے ایک روز انکشاف کیا کہ وہ دونوں ایک دن

ایک مہینے اور ایک سن کی پیدائش ہیں۔ 1983 عیسوی میں اتحق نے یوکرین---(سوویت روس) اور تھیا نے ہالینڈ میں ایک ہی روز جنم لیا تھا۔ ہم تو امن جُبن بھائی اپنی سال گرہ اکٹھی منائیں گے۔ تھیا نے اعلان کیا۔ تھیا اور برٹ نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی۔ برٹ ہالینڈ کا نامور مصنف بھی تھا۔ دونوں میاں بیوی بہت بھلے اور خوش طبع لوگ تھے۔ دعوت کی شام ان کے اپارٹمنٹ میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تھی۔ دونوں کمروں اور باورچی خانے میں بھانت بھانت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ ہولیو سیزر۔ بولو" میں لیبیوٹری کا رائٹر نہیں۔"

اتحق اوپاز نے گرج کر جواب دیا" کہرے کے دریا اور آگ کے دریا۔ بیچ میں جو درمیانی راستہ ہے اس پر سے گذرو۔"

جوزف ہلر اچانک دروازے میں نمودار ہوئے CATCH 22 لکھ کر راتوں رات وہ مائرن کی طرح عالم گیر شہرت کے مالک ہو گئے تھے۔ قدآور سر پر سلور گرے جھوا بال۔ موٹے سیاہ فریم کی عینک، انٹلکچوئیل یہودی شکل۔ انتہائی کامیاب ادیب کی روشن مثال۔

اس وقت مشرقی جرمنی کا کول ہاس پیٹر ناصرۃ سے کہہ رہا تھا" میں ایک سوشلسٹ ملک سے آیا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ انسانیت کی ترقی کیسی ہونی چاہیے۔ مگر میں یہ نہیں کہتا کہ اچھا ادیب ہونے کے لیے لفٹ ہونا ضروری ہے۔ میں بائیں بازو کا بھی ہوں اور رائٹر بھی۔ لکھتے ہوئے انسان خود بخود لفٹ ونگ ہو جاتا ہے۔ دنیا کے حالات ہی ایسے ہیں۔"

برازیل کے سیزر نے جواب دیا" ہاں ہمارا دل بھی تو بائیں طرف دھڑکتا ہے۔ اگر تم ایک اچھے ادیب ہو تو تم کو ضرور احساس ہوگا کہ دنیا میں کتنی گڑبڑ ہے اور حالات کو بدلنا چاہیے۔ ادیب اصلی مورخ ہے۔ حکومتیں تاریخ نہیں بناتیں وہ تاریخ کو منجمد کر دیتی ہیں۔" اتحق اوپاز نے جواب دیا۔

جمیل حسین فلسطینی اس پارٹی میں مدعو نہیں تھا ورنہ وہ اتحق کی بات کا جواب دیتا۔ انگریز یہودی رچرڈ (جو یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھاتا تھا) نے اتحق کو گھیر لیا۔" ایک بات بتاؤ اتحق۔ تم اسرائیلی اتنی بلندی سے بات کیوں کرتے ہو۔ میں ابھی ابھی یونیورسٹی میں تمھارے توپ

ادیب ابراہیم یشوع کا لیکچر سن کر آ رہا ہوں — اس قدر بد دماغی۔" اطالیہ کے یہودی آلڈو دونوں سیکولر اعتدال پسند موسوی پنجے جھاڑ کر اسحق کے پیچھے پڑ گئے۔ اسحق خاصا گھبرایا ہوا چپکا بیٹھا رہا۔ پولینڈ کا طویل الاقامت مائیکل پاس سے گذرا۔ ٹھٹھک کر بحث سننے لگا۔ وہ ایک کمیونسٹ ملک اور یورپ کے عیسائی ورثے کا نمائندہ، یورپ کے ان تین یہودی دانشوروں کو صیہونیت کے نظریات کے متعلق جھگڑتا سن کر خاموش رہا۔ آگے بڑھ گیا۔ اب یوگوسلاویہ کا جنس کلہ میعودی جو دانوسکی قریب آیا۔ وہ بھی بحث میں شامل نہیں ہوا۔ کونے میں فرش پر بیٹھے پیٹر ناضرۃ نے ماؤتھ آرگن بجانا شروع کر دیا۔ پھر میری ناضرۃ اچانک ایک سواحلی گانا گانے لگی:

"ملائکہ ملائکہ —"

"وژن — وژن اصل چیز ہے۔" اسحق نے ذرا جوش سے دہرایا۔

جولیس نیرز مارٹن آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اب تک اسحق سے صیہونیت کے متعلق جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "ہر رائٹر کے اندر کہیں نہ کہیں ایک یوٹوپیا چھپا ہوتا ہے۔ مستقبل کے متعلق۔"

"اور وہ رائٹر جو ماضی کی طرف دیکھتے ہیں؟" میعودی نے دریافت کیا۔

"مستقبل ماضی کا خیال دلاتا ہے اور ماضی مستقبل کا۔ ماضی کا حوالہ دیے بغیر محض حال کے متعلق لکھ کر تم وجودی ادیب نہیں بن سکتے۔" اسحق نے جواب دیا۔

تھیا نے ریکارڈ پلیئر پر میوزک چلا دی۔ رقص شروع ہو گیا۔ کچن میں جمع لوگ گا رہے تھے۔ برٹ قہقہے لگا رہا تھا۔ اسحق نے کچن میں واپس جا کر اسرائیل کا ایک مقبول عبرانی گیت چھیڑا۔ سب کورس میں شامل ہو گئے (غالباً برٹ اور تھیا بھی یہودی تھے) گیت میں حیا۔ حیا۔ برابر دہرایا جا رہا تھا۔ یعنی زندگی۔ زندگی۔ زندگی۔ دوسرے بیڈ روم کی دیوار پر نصب فون کی گھنٹی بجی۔ برٹ اس طرف لپکا۔ کچن میں گانا جاری رہا۔ سارا اپارٹمنٹ موسیقی اور حیا۔ حیا۔ کی تکرار سے گونج رہا تھا۔ اچانک لیلیٰ اربل باورچی خانے میں آئی اور اس نے آہستہ سے کہا "تھیا ایمسٹرڈم سے فون آیا ہے۔ برٹ کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

سناٹا — برٹ فون پر مصروف تھا۔ لیلیٰ بولی برٹ کی بہن ایمسٹرڈام سے بات کر رہی ہے۔"
تھیا نے متفکر ہو کر مجھ سے کہا "یہاں کے شور اور گانے بجانے کی آواز میری نند کے کانوں میں پہنچ گئی ہوگی۔ وہ کیا سوچے گی۔ میرے سُسر وہاں اتنے بیمار پڑے تھے اور میں یہاں رنگ رلیاں منا رہی ہوں۔"
نند بھاوج کا مسئلہ عالمی ہے۔
برٹ بات ختم کر کے کچن میں آیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ برٹ میز پر ٹک گیا۔ چند لمحوں بعد بولا "والد نوے سال کے تھے۔ بھرپور زندگی گزاری۔ وہ استاد تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد سارے ہالینڈ میں موجود ہیں — انھوں نے ساری عمر اپنا علم دوسروں تک پہنچایا۔ میری بہن کہہ رہی تھی کہ وہ آخر وقت تک ہوش و حواس میں تھے۔ میرے یہاں آنے سے ذرا پہلے بیمار پڑے تھے۔ مجھ سے کہا تم ضرور امریکہ جاؤ۔ اپنے علم اور تجربے میں اضافہ کرنے کا کوئی موقع کبھی نہ کھوؤ۔ میری وجہ سے مت رکو۔ میرا کیا ہے میں تو اپنی زندگی گزار چکا۔ کل صبح میں ان کی تجہیز و تکفین کے لیے ہالینڈ جاؤں گا۔ ہفتہ بھر کے لیے شام جیمز بک اسٹور میں مجھے اپنا افسانہ پڑھنا تھا وہ میرے بجائے تھیا پڑھ دے گی۔ "THE SHOW MUST GO ON"۔
"اب ہم لوگ چلتے ہیں۔ برٹ۔" اسحٰق نے کہا۔
"ہرگز نہیں۔ پارٹی جاری رکھو۔ میں ذرا لیٹ جاؤں۔" وہ کچن سے ملحق بیڈ روم میں جا کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھیا نے درمیانی دروازہ بند کرنا چاہا۔ برٹ نے کہا "نہیں۔ دروازہ کھلا رکھو۔ میں تم سب کو تفریح کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"
پارٹی رات کے دو بجے تک جاری رہی۔

سوپ اوپیرا

جمو بک اسٹور میں حسب معمول سب لوگ فرش پر بیٹھے کوک، سیون اَپ اور بیئر سے شغل کررہے تھے۔ تھیا برٹ کا افسانہ پڑھ رہی تھی۔ انڈونیزیا کے اشویندو اور فرانز با چپس کھائے ہمہ تن گوش تھے۔ ان دونوں کا برٹ اور تھیا سے سابق آقا اور موجودہ آزاد قوم والا وہی نوسٹلجک دوستانہ رشتہ قائم ہوگیا تھا جو ایک عجیب قومی کیمسٹری کے ذریعے انگریزوں اور ہندستانیوں پاکستانیوں کے درمیان استوار ہے۔ یونان کے آری نے اپنی تازہ نظمیں سنائی۔

ایک بار آری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ ایک غریب موچی تھا۔ وہ اب بھی اپنے ہاتھ سے جوتے بناتا ہے۔ افلاس کی وجہ سے میں بارہ سال کی عمر تک اسکول نہیں جاسکا۔ "امریکہ کے بارے میں اس کے ری ایکشن ہمیشہ بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ برٹ کے ہالینڈ سے واپس آنے کے بعد ایک روشن اتوار کو ہم لوگ بہت دُور دریا کنارے پکنک کے لیے گئے۔ پولین اور باربکیو چولہے وہاں پہلے سے موجود تھے اور جنگل بیابان میں جابجا نفیس و نرم پلاسٹک کے استر والے کوڑے کے بند ڈھول۔ پولین کی صفائی دیکھ کر آری نے مجھ سے کہا۔ "یہ امریکن یقیناً صبح و شام اسے بھی ویکیوم کلین کرتے ہوں گے۔"

آری یونان کے نیشنل ریڈیو میں کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کافی لوگوں کا تعلق ذرائع ابلاغ سے تھا۔ نادلسٹ اشویندو جکارتہ کے سب سے بڑے اخبار سے منسلک تھا۔ شوانگ پیکنگ فارن لنگویج پریس کے شعبہ انگریزی تراجم کے نگراں اور چینی مصنفین کے ایسوسی ایشن کے غیر ملکی تعلقات کی کمیٹی کے چیف تھے۔ (گویا پیکنگ میں اُن کی وہی حیثیت تھی جو ماسکو میں مریم سالگا نک کی ہے) آئرلینڈ کا ڈرامہ نگار آئرن کیون کیسی آئرش ٹائمز کے لیے لکھتا تھا۔ اسپین کا ناولسٹ سانچیز ایسیر لیسوٹیلی ویژن اور فلم ڈائرکٹر تھا۔ ہنگرین شاعر نیکولس ہرازتی (جس کی ایک

کتاب کا دیباچہ ہنرخ بول نے تحریر کیا تھا) اخباروں کے لیے بھی لکھتا تھا۔ مشرقی جرمنی کا افسانہ نگار وولف گانگ کول ہاس فلم اسکرپٹ رائٹر بھی تھا۔ فلپائن کا ہوزے لکایا ماہنامہ "دی ریویو" کا ایڈیٹر تھا۔ برازیل کا جولیس سیزر مارٹن شاعر اور ناولسٹ برازیلین ٹیلی ویژن کے ڈرامے لکھتا تھا۔ اسرائیلی ناولسٹ اسحق اور پاز جرنلسٹ تھا۔ پولینڈ کے جرزی پرزیڈکی کا تعلق اسٹیج اور یونیسکو سے تھا۔ مائیکل رونی کر پولش اسٹیج اور فلم ڈائرکٹر تھا اور اطالوی ناولسٹ آلدو روزیلی روم کے سب سے اہم ادبی رسالے THE LIVING CHINA کا ایڈیٹر تھا۔ برٹ کا تعلق ہالینڈ میں تھیٹر سے تھا۔ سرخ چین کے شاؤشن وہاں کے لیے بے حد اہم صحافی تھے۔ بحیثیت اخباری نمائندے دوسری جنگ عظیم کے دوران لندن میں رہ چکے تھے اور ایڈگر اسنو کے ساتھ مل کر انھوں نے THE LIVING CHINA لکھی تھی۔ جب ساری دنیا کے اتنے سارے ادیب جرنلسٹ اکٹھے ہوں تو ان سے مل کر کسی بھی اخبار والے کو بہترین کاپی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس روز آیوا سٹی کے ایک اخبار کے دو نمائندے اس جنگل میں آن پہنچے۔ کافی خوشگوار جھائیں جھائیں ہوئی۔ جولیو سیزر مارٹن حسب معمول دھاڑا۔ "جرنلسٹ اور رائٹر روز مرہ کے حقیقت سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق مصالحت کا ہے۔ ایک جرنلسٹ اور ایک رائٹر دونوں مثلاً جنگ کے متعلق لکھتے ہیں۔ رائٹر ایک قسم کا سوشل فلٹر ہوتا ہے۔ کل کے اخبار کے لیے لکھنے میں اور تاریخ کو مخاطب کر کے لکھنے میں بہت فرق ہے۔"

اسحق اوپاز بولا "جرنلسٹ کے لیے بھی اخلاقی کمٹمنٹ ہوتا ہے۔"

کول ہاس نے کہا "ساری ادبی تخلیق تجربے اور تخیل پر منحصر ہے۔" ادب بذات خود حقیقت نہ ہو مگر حقیقت رکھتا ہے۔"

پیٹر اور باقی لوگ ندی کنارے جا کر پلاسٹک کا ایک گول چکر ایک دوسرے کی طرف پھینکنے کے مقبول کھیل میں مصروف ہو گئے۔ (سائنس کی طرح میں اسپورٹس کے معاملے میں بھی بلینک ہوں) آری یونانی تھا اور یونانی بہت عمدہ باورچی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بہترین مرغیاں باربیکو کیں۔

شام کو جب ہم لوگ آیوواسٹی واپس جانے کے لیے گاڑیوں میں بیٹھنے لگے اورنگا۔ حسبِ معمول دیر لگا رہی تھی۔

روڈلفو جسے میں ہالی ووڈ فلموں کا ساؤتھ امریکن فلموں کا ولین کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ شروع میں ایک خاتون کے ساتھ وارد ہوا تھا۔ جسے وہ اپنی بیوی کہتا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ خاتون غائب ہوگئی اور اس کے چند روز بعد اس کی بے حد حسین اور باوقار بیوی جو انگریزی کا ایک لفظ نہ جانتی تھی ارجنٹینا سے آن پہنچی۔ روڈلفو اسی طرح شرارت سے کندھے اُچکا کر مسکراتا رہا۔ اس وقت وہ نہایت خلوص اور سنجیدگی سے بیوی کو فرکوٹ پہنا کر گاڑیوں کی طرف لا رہا تھا۔ سورج ندی میں ڈوبنے والا تھا اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

"ہم لوگ روانہ کیوں نہیں ہوتے؟" میں نے پوچھا۔

اچانک کیا دیکھا کہ پویلین کے سامنے بہت سارے ساتھی سر جھکائے گھاس پر گھٹنوں کے بل چلنے میں مصروف ہیں۔

آرتی ہنستا ہوا بھاگا آیا "اورنگا کا بندہ گھاس میں گم ہوگیا۔"

"خدایا وہ بوند سا بندہ اندھیرا پڑے اتنی گھاس میں کیا ملے گا۔ بھوسے کے ڈھیر میں سوئی۔" نادیا بولی۔

لیکن بی بی اورنگا کشتی نے شرق و مغرب کے بتیس ملکوں کے ادبا و شعرائے کرام و ناقدین کو گھاس میں اپنا بندہ ڈھونڈنے کی مہم پر لگا دیا تھا۔ وہ سب مارے اخلاق کے اس ناممکن تلاش میں جتے ہوئے تھے۔ بے چارے بزرگ ہنگرین نقاد بالا زینگل چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے بندہ ڈھونڈتے بہت قابلِ رحم معلوم ہوئے۔

"مل گیا۔" اورنگا دفعتہً چلائی۔ اورنگا اور الفریڈو کی مادری زبان کولمبیا کی ہسپانوی تھی مگر صاف انگریزی بولتے تھے۔ الفریڈو (کھچڑی داڑھی، خوب صورت اور مرنجاں مرنج) سوشیولوجی میں ڈاکٹریٹ لے چکا تھا اور اپنے جنوبی امریکن ملک کولمبیا کا مشہور شاعر تھا۔

بندہ وولف گانگ کول ہاس نے اپنی جرمن تیز نگاہی سے ڈھونڈ نکالا تھا۔

"کمال ہے۔" نادیا نے سر ہلا کر کہا۔

"اور کافی نا قابل یقین ہے۔" فراز بولا۔

عموماً عورتیں نا قابل یقین ہوتی ہیں۔" آری نے جواب دیا۔

"یہ میل شوونزم کا رویہ ہے۔" امریکن جرنلسٹ لڑکی نے کہا۔

"مادام۔ میں پرانی دنیا کا ایک کٹر میل شونسٹ ہوں۔" آری نے اپنے سر سے ٹوپی اُتار کر بڑے اخلاق سے جھکتے ہوئے جواب دیا۔

"ترکوں اور یونانیوں کے رویوں میں زیادہ فرق نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہو نہیں سکتا۔ جغرافیہ اور تاریخ کا تقاضہ یہی ہے۔" آری لیلیٰ سے مخاطب ہوا۔ "اس پر یاد آیا۔ لیلیٰ تم دعوت کب کر رہی ہو؟ گولاش اور پلاؤ۔"

ایئر کنڈیشنڈ سوپر مارکیٹوں میں اشیائے خورد و نوش کا بے تحاشا تنوع اور فراوانی اور ارزانی مشرقی یورپ والوں کے لیے تحیر خیز تھی۔ ایک شام ہفتہ وار خریداری کے بعد میں ہنگری کی ایگنس اور ان کے شوہر بالا زینگل کے ساتھ سوپر مارکیٹ کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھی باقی لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ جو اپنی اپنی ٹرالیاں بے تحاشا سامان سے لاد کر کاروں کی طرف لا رہے تھے۔ اس وقت شیشے کی دیوار کے پیچھے چنے ہوئے کیٹ اینڈ ڈوگز فوڈ" کے عظیم الجثہ بنڈلوں پر میری نظر پڑی۔ آدھی سے زیادہ دُنیا کے انسانوں کو پیٹ بھر کھانا میسر نہیں یہاں پالتو جانوروں کے لیے نعمتوں کے انبار۔" میں نے کہا۔

"ہمارے ہاں ہنگری میں تو میز پر جو بڑی بچتی ہے وہی اپنے کتوں بلیوں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔" بالا زینگل نے ملائمت سے کہا۔

"جو شرفا کا قاعدہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ٹیلی ویژن پر اپنے فوڈ کے اشتہارات میں کتے بلیاں اداکاری بھی کرتے تھے۔ کولمبیا نیشنل اور امریکن براڈ کاسٹنگ کے ہر NET WORK کے تحت چھ سو اسٹیشن کل ملا کر دو ہزار اور مقامی اور سٹلائٹ اسٹیشن ان کے علاوہ رات گئے تک اور صبح منہ اندھیرے سے مختلف لہروں پر کلیسائی پروگرام بعض مرتبہ اس انداز کے گویا جیزس کرائسٹ بھی ایک ایڈورٹائزنگ CAMPAIGN ہیں۔ امریکن مذہبی آزادی کے مظاہر یہ بھانت بھانت کے بے شمار خرچ ساٹھ کروڑ ڈالر سالانہ کر کے اپنے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ اُن کے واعظ پچھلی صدی کے BIBLE-THUMPING دورہ کرنے والے پادری کے عصری اوتار ہیں جو میڈلسن ایونیو نیویارک کے ایڈورٹائزنگ اور پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ جیسی مہارت بھی رکھتے ہیں۔ یہ واعظ باقاعدہ پادری کے بجائے LAYMEN ہیں ان میں سے ایک مقبول واعظ کو نو لاکھ ڈالر سالانہ مع PERKS تنخواہ ملتی ہے (ہندستان سے جانے والے ہندو سوامی اور یوگی بھی اپنا اپنا پرچار انتہائی مہنگے ماہرین تعلقاتِ عامہ کے ذریعے کر رہے ہیں۔ ان کے آشرموں کا بجٹ لاکھوں ڈالر سالانہ کا ہے۔ یہ سارا پیسہ ان کو ان کے دولت مند امریکن چیلے دیتے ہیں)۔ سارا ٹیلی ویژن تجارتی ہے اور اشتہاروں کے درمیان سوپ اوپیرا۔ (سنی مقبل رومینٹک سیریل جو گھریلو عورتوں میں مقبول ہیں) کامیڈی، مباحثے۔ "ٹاک شو" رقص و موسیقی، پرانے اور نئے فلم، ڈرامے، تعلیمی اور بچوں کے پروگراموں کے تنوع کا کوئی حد و حساب نہیں۔ غیر تجارتی پبلک براڈ کاسٹنگ سروس (پی بی ایس) کے انتہائی اعلیٰ درجے کے عالمانہ اور انٹلکچویل پروگرام، ڈرامے، فلم، مباحثے، انٹرویو، ہر امریکن نیٹ ورک صبح سے لے کر آدھی رات تک متعدد بار اور بے حد ڈرامائی طریقے سے اپنے خبرنامے پیش کرتا ہے۔ مذہبی اور دوسری مفید سروسوں میں بہروں کے لیے بیک وقت متوازی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے جاتے ہیں۔ ساری دُنیا میں بکھرے نمائندے (مرد اور عورتیں) سٹلائٹ کے ذریعے روم، پیرس، لندن، ماسکو وغیرہ سے اپنی خبریں سناتے ہیں۔ امریکہ میں موجود خبریں پڑھنے والے خواتین و حضرات بہ لحاظ ملک گیر مقبولیت "ٹاک شو" کی ہر دلعزیز شخصیتوں جونی کارسن، یا ڈک ایویٹ وغیرہ کی طرح اہم ہیں۔ اکثر اہم اور فوری پروگراموں میں

انٹرویو کرنے والے لاس اینجلز میں بیٹھے ہوئے ہیں اور واشنگٹن اور نیویارک میں موجود شخصیتوں سے بالمشافہ گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلام کو حسبِ معمول پہلے عرب اسرائیلی مسئلے کی وجہ سے اور اب ایرانی کرائسس کی وجہ سے انتہائی منفی پبلسٹی مل رہی ہے۔ مشرق کا اسٹریوٹائپ ہمیشہ سے منفی رہا ہے۔ کوئنگ اسٹریس میں بھی ویلن عموماً ایک خشمناک عرب یا ترچھی آنکھوں والا اورینٹل ہوتا ہے۔ (اہلِ مشرق کے لیے سفید فام مغرب کا یہ تعصب صدیوں پرانا ہے اور ان کے لاشعور میں رچ بس چکا ہے)۔ آج بھی پگڑی باندھے۔ سیاہ فام 'ہندو' یا 'چینی' اس امریکن فوک اور کاؤ ویلن ہے یا ایک "پُراسرار" ذیلی کردار۔ رڈیارڈ کپلنگ کے LESSER BREEDS WITHOUTHYE کی معنوی اولاد۔ ایرانی کرائسس کے متعلق ذرائع ابلاغ نے جنگ پسندی ہسٹریا کو جنم دیا ہے۔ اسلام اور IAW مڈل ایسٹ گویا خون آشام ہلاکت پسماندگی اور جنون کا دوسرا نام ہے۔ ہندوستان کا تذکرہ بھی محض کوڑھیوں، بھکاریوں اور افلاس کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ ایک مزاحیہ خبرنامے میں لڑکی نے پڑھا۔ کلکتہ میں ایک عورت نے پانچ بچوں کو جنم دیا۔ ماں اور بچے خوش اسلوبی سے بھوکے مر رہے ہیں۔" امریکنوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا طرزِ زندگی ساری دنیا کو متاثر کر چکا ہے۔ سوویت یونین میں پوپ میوزک (خواہ وہ اس کا سوویت یونین ورژن ہی کیوں نہ ہو) اور جینز مقبول ہو چکی ہے) سارا یورپ اور ساری "تیسری دنیا" امریکن رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔

قدیم یونان اور روما نے یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ، امپیریل گپتا عہد نے مشرقی ایشیا اور میڈیول عربوں نے آدھی دنیا، امپیریل مغلوں نے ہندوستان، ایران نے نصف ایشیا اور امپیریل برطانیہ نے ہندوستان اور آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنے اپنے تمدن سے متاثر کیا تھا۔ 1945 عیسوی کے بعد سے امریکہ کا بول بالا ہے۔

لیکن مشرق کے متعلق مارکو پولو اور اُن کے بعد سولھویں صدی سترھویں میں دوسرے

یورپین سیاحوں نے واپس جا کر جوانٹ سنٹ باتیں اپنے لوگوں کو بتلائی تھیں۔ ایک عام مغربی آج بھی ہمارے متعلق تقریباً اتنا ہی جانتا ہے۔ ترقی یافتہ طاقت ور مغربی اقوام کا سنڈروم۔ تیسری دنیا والے ہم سے سیکھنا اور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو ہماری ضرورت ہے، ہمیں ان کی نہیں (یہاں دانش گاہوں یا مستشرقین یا اہل علم وفضل کا نہیں ایک عام قومی رویے کا ذکر ہے) لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے آج بھی مارکو پولو اور برنیر کے عہد سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ آج راجستھان میں ایک عورت ستی بھی ہوتی ہے اور عوام اسے دیوی بنا کر پوجتے بھی ہیں۔ مسلمان عورتیں آج بھی چلتے پھرتے سیاہ خیمے ہیں۔ ہندو لڑکیاں زیادہ جہیز نہ لانے کے جرم میں دھڑا دھڑ زندہ جلائی جارہی ہیں۔ اچھوتوں کا مسئلہ پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک صورت اختیار کر چکا ہے اور ایران میں عورتیں بھی 'اسلامی انصاف' کے نام پر گولی سے اڑائی جارہی ہیں۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دو بالکل مختلف قسم کے معاشرے ہمیشہ ایک دوسرے کو عجیب اور نا قابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ انگریز حاکموں کا رہن سہن۔ ان کی عورتوں کی آزادی اور مرد اور عورتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رقص کرنا ہمارے اجداد کو شیطانی افعال معلوم ہوئے تھے۔ اسی طرح ہماری روایات، پردہ وغیرہ اہل مغرب کو سمجھ میں نہیں آتا۔ (مغرب تو دُور کی بات ہے خود ایک ملک میں رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے معاشروں کے متعلق لاتعداد غلط فہمیوں اور تعصبات میں مبتلا ہیں) اور اب ایران نے اسلام کو جس رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کے ردعمل پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔

ہماری نفسیات یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مسائل یا روایات کا معروضی تجزیہ کرنے کے بجائے نہایت جذباتی ہو کر معذرت آمیز دفاع میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ (مثال کے طور پر ہم مغرب کی برائی بھی کرتے جاتے ہیں لیکن ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے بچے بڑھیا انگریزی مدرسوں یا کانونٹ اسکول میں داخل ہو جائیں اور اپنے قومی کردار کے اس تضاد پر ہم کبھی غور نہیں کرتے)۔

امریکن اپنے قومی مسائل پر بلاکم وکاست بحث کرتا ہے۔ ٹی وی پر اور اخباروں میں سی آئی اے کی ریشہ دوانیاں، سیاسی معاملات۔ معاشرے کی تمام خرابیاں، جرائم، تشدد، نسلی

منافرت، منشیات کا استعمال، بن بیاہی نوعمر ماؤں کی تعداد میں اضافہ، حقوقِ نسواں، بوڑھوں کی تنہائی۔ لیکن ان مسائل کو حل کرنے کے لیے منظم اور موثر طریقے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی طرح محض منسٹروں کے بیانات اور پند و نصائح اور زبانی جمع خرچ نہیں۔ بوڑھوں کی تنہائی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اُن کے پورے کے پورے شہر آباد کر دیے گئے ہیں۔ جن کا سارا انتظام وہ خود کرتے ہیں۔ اپنے ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن اور سمفنی آرکسٹرا اور کمیونٹی سنٹر چلاتے ہیں۔

سیاسی مذاکروں میں اب فلسطینی مجاہدوں کا نقطہ نظر بھی تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جو چند سال قبل ممکن نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکن ذرائع ابلاغ پر یہودی غالب ہیں۔ ماہرین علوم و فنون، موسیقار، سائنس داں، یونیورسٹی پروفیسر، مصنفین، فن کار، اہم نظریہ ساز، سیاست داں، بڑے سرمایہ دار "شو بزنس" والے اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں قوم یہود سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی زندگی میں اُن کی شدید اہمیت اور افادیت اور ان کے متواتر اور موثر پروپیگنڈے کی وجہ سے ہماری امریکن اکثریت اسرائیل نواز ہے۔ میں نے ابھی اینٹی اسلام، ٹیلی ویژن خبرناموں وغیرہ کا ذکر کیا تھا لیکن ایک اہم نکتہ نظر انداز نہ کیجیے۔ اشکنازی یہودی مغرب سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مغربی تہذیب JUOAEO - CHRISTIAN یہودی مسیحی تہذیب ہے۔ انجیل مقدس کا عہد نامہ قدیم مسیحی اجتماعی لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے۔ (خود حضرت عیسیٰ یہودی تھے)۔ مسیحی یورپ نے صدیوں تک یورپین یہودیوں کو اس وجہ سے پرسیکیوٹ کیا کہ ان کے فلسطینی اجداد نے یسوع مسیح کا مصلوب کروایا تھا۔ مگر وہی یورپین یہودی مغربی تہذیب کے معماروں میں شامل ہیں۔ اسپنوزا، ہیڈیگر، ہائینے، مینڈل سون، ہنری برگساں، کارل مارکس، فرائیڈ، آئین اسٹائین اس طویل فہرست کے چند نام ہیں۔ اُن کے مقابلے میں قرونِ وسطیٰ کے بعد کے کسی عالمی سطح کے عرب دانشور کا نام پیش کیجیے! جب نشاۃ ثانیہ کی یورپین اقوام کا سابقہ انحطاط پذیر عربوں سے پڑا۔ وہ اپنے ابنِ رشید ابنِ خلدون وغیرہ کو بھی بھول چکے تھے۔ آج اگر آپ اہلِ مغرب اور خود ہندوستان کے غیر مسلموں کو بتلایئے کہ میڈیول

عربوں نے تاریک یورپ کو روشن کیا تھا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ آج کے عرب تو وہ شیوخ ہیں جن کی عیاشی اور احمقانہ فضول خرچی ضرب المثل بن چکی ہے۔ حال میں لندن اسٹیج پر ایک واقعہ بہ طور لطیفہ پیش کیا گیا کہ ایک عرب نے سارا شہر لندن خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ لہٰذا اپنے مانوس سفید فام مغربی یہودیوں کے مقابلے میں ایک اجنبی مذہب اسلام (جو صلیبی جنگوں کے زمانے ہی سے بدترین مغربی تعصب کا شکار رہا ہے) اور ایک "پس ماندہ" اجنبی مشرقی قوم عرب یا ایرانی جہاں تک پبلک کے ردعمل کا تعلق ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ خود اپنے امریکی یہودی دانشوروں کے کارناموں کے مقابلے میں امریکن عوام جب ان "شیوخ" کے "کارنامے" دیکھیں گے جو ہالی ڈڈ میں ایسے محل تعمیر کرتے ہیں جن کی چھتوں پر برہنہ عورتوں کی طلائی مورتیاں بنی ہوں یا جن کی وجہ سے طوائفوں نے اپنے نرخ میں اضافہ کر دیا ہے تو امریکن خواص و عوام کے ذہنوں میں کس قسم کا "عرب امیج" بنے گا؟ علاوہ ازیں مسیحی مغرب خصوصاً ہٹلر نے یہودیوں پر جو ظلم کیے، اس کے لیے مسیحی یورپ اور امریکہ اجتماعی احساسِ جرم میں بھی مبتلا ہے اور فلسطینی حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اسرائیل کی حمایت کرتا ہے جن دنوں ٹیلی ویژن پر کیے بعد دیگرے فلسطینیوں کے حقوق کے متعلق اُن کے حامی کالے لیڈروں اور یہودی لیڈروں کے مابین مباحثے پیش کیے گئے۔ اس کے چند روز بعد ہی نازی جرمنی کے گیس چیمبرز میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کی ہلاکت کے متعلق ایک رونگٹے کھڑے کرنے والی انتہائی موثر فلم۔ THE HOLOCAUST دکھلا دی گئی۔ چنانچہ فلسطینیوں کے وقف کا تھوڑا بہت جو اثر ہوا ہوگا وہ اس سے زائل ہو گیا۔ یعنی یہ کہ یورپین یہودیوں پر اتنی بڑی قیامت گزر گئی۔ ان کے پس ماندگان کے ملک اسرائیل کی ہر حالت میں حمایت کرنی چاہیے۔ اور بین السطور میں یہ کہ اسرائیلیوں کے ساتھ فلسطینی "دہشت پسند" وہی سلوک کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں جو نازیوں نے کیا تھا۔ سیاست اور میڈیا کی بے انصافی کی یہ بڑی ہولناک صورتِ حال ہے اور سوچ کر دل ٹوٹتا ہے۔ بسلسلۂ مسیحی احساسِ جرم ایک اور بات یاد آئی۔ حال ہی میں پوپ نے اپنے ایک فتوے کے ذریعے قوم یہود کو "خدا کے قتل"— (نعوذ باللہ!) یعنی حضرت عیسیٰ کو مصلوب کروانے کے جرم میں بری الذمہ قرار دیا ہے!

امریکہ میں شیکسپیئر کا ڈرامہ مرچنٹ آف وینس اپنے مشہور یہودی منفی کردار شائی لاک کی وجہ سے اب اسٹیج نہیں کیا جاتا! چنانچہ ٹیلی ویژن پر عرب شخصیات انٹرویو کرنے والوں کا رویہ بھی جارحانہ اور مخاصمانہ ہوتا ہے کبھی نادیا میرا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ ''فوراً چینل لگاؤ۔ یاسر عرفات یا پرائم منسٹر شاہ حسین سے بات کر رہی ہے۔'' یا میں اکسائٹمنٹ سے چلاتی۔ ''نادیا یاسر عرفات بول رہے ہیں۔''

لیکن اس سے قطع نظر بالخصوص پبلک براڈ کاسٹنگ سروس کے نفیس پروگرام ہوتے ہیں۔ پی بی ایس پر ایک بے حد خیال انگیز اور ظرافت آمیز سلسلہ MEETING OF THE MINDS چل رہا تھا جس میں کارل مارکس، امریکن شاعرہ ایمیلی ڈکنسن، تھورو، روسو، ڈارون، ملکہ میری، انٹوانیٹ اسٹلا دی ہن وغیرہ وغیرہ ایک گول میز کے گرد بیٹھ کر ایک دوسرے سے اور آج کے اہلِ علم سے بے حد پُر لطف تکرار اور بحث و مباحثہ کرتے۔

''ان پروگراموں کو دیکھنے کے بعد اپنے مصری ٹیلی ویژن کا خیال آتا ہے۔'' نادیا سرد آہ بھر کر کہتی اور میں اس وقت انڈین ٹی وی کے بارے میں خاموش رہنا مناسب سمجھتی۔ اور سوچتی آخر ہم لوگ اتنے نااہل کیوں ہیں؟ اتنے ذہین اور اتنے نااہل! کہ اسی نااہلی، خودغرضی، گھٹیاپن اور بے ایمانی نے ساری قومی زندگی اور قومی سیاست کو ایک لامتناہی اوپیرا بنا کر رکھ دیا جس کے چند اہم کردار وہی کلیشے دہرائے جاتے ہیں۔ اور پوری قوم یوجین آئینسکو کے ڈرامے ''گینڈے'' کے کرداروں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔

گینڈا دلدلی جنگلوں میں رہتا ہے اور فطرت کے اوّلین تجربوں کی یادگار ہے۔ اس کی زرہ بکتر جیسی موٹی کھال میں بندوق کی معمولی گولی سوراخ نہیں کر سکتی۔ وہ دنیا کی سب سے کریہہ المنظر مخلوق ہے۔ وہ محبت کی جبلت سے یکسر عاری، انتہائی احمق اور طاقت ور اور جنونی اور مکروہ جانور۔ اسے بجھائی بھی کم دیتا ہے۔ وہ یا تو اندھے پاگل پن کی کیفیت میں حملہ آور ہوتا ہے یا بس اونگھتا رہتا ہے۔

پی بی ایس کے ماسٹر پیس تھیٹر میں ایک شام آئینسکو کا ہولناک شاہکار ''گینڈے'' دکھلایا گیا تھا جس میں یکے بعد دیگرے سارے کردار گینڈے کی طرح چنگھاڑتے ہوئے گھر سے نکل

بھاگتے ہیں اور DFF. STAGE ——— دریچے کے ——باہر گینڈوں کے غول اپنی بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ایک فلیٹ میں جمع لوگ ایک کے بعد ایک جنونی کیفیت میں چیختے ہوئے دریچے سے کود کر اس حیوانی بھیڑ میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ ساری انسانی آبادی گینڈوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ فقط ایک آخری آدمی رہ جاتا ہے۔

میں نے ابھی کالے لیڈروں کا ذکر کیا تھا جو قومی زندگی میں نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ اسلام بھی اپنی مساوات کی وجہ سے ایک حد تک کالوں ہی میں کامیاب ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں میں تھوڑا بہت NEW LEFT بھی پیدا ہو چکا ہے۔ خصوصاً وسیع شرب کیلی فورنیا میں۔

14 نومبر کو میں مغربی ساحل اور جنوبی ریاستوں کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔ اس سے قبل یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے کے ڈپارٹمنٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر بروس پرے نے وہاں کا پروگرام طے کرنے کے لیے فون کیا۔ کہنے لگے "اس درس گاہ میں چالیس ہزار طلبا پڑھتے ہیں۔ مگر کیا عجیب اتفاق ہے کہ کل شام کیمپس پر ایک پارٹی میں ملاقات آپ کی بھانجی زیبا حیدر سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آپ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں ٹھہرنے کی بجائے ان کے ساتھ قیام کرنا پسند کریں گی۔"

"آپ کو اُردو آتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں یہاں اُردو ہی پڑھاتا ہوں۔ تین دن کے لیے نیویارک سے جتندر کمار جین بھی آنے والے ہیں۔"

میں نے بات کاٹی "کمال ہے کہ زیبا سے آپ کی ملاقات ہو گئی جبکہ وہ برکلے میں پڑھتی بھی نہیں۔ کیا دُنیا اتفاقات کا ایک عجیب و غریب سلسلہ نہیں؟"

سن شائن اسٹیٹ

ایک بار پھر شکاگو، دوسرا طیارہ برائے ڈینوز جو ریاست کولوریڈو کا بہت بڑا شہر ہے۔ اب سرخ چٹیل کوہستانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈینوز سے مغرب بعید کی سمت جاتے ہوئے محض سُرخ پہاڑ اور وسیع، پتھریلی وادیاں۔ اچانک سرسبز کیلی فورنیا۔ مڈویسٹ میں سردی پڑنے لگی تھی۔ کیلی فورنیا دھوپ سے معمور تھا۔

پچھلی صدی میں گولڈرش کے دوران سیرا نیوادا میں سونے کی کانیں دریافت کرنے والوں نے سان فرانسسکو بسایا تھا وہ لوگ فورٹی نائنرز کہلاتے تھے جنھوں نے 1849 عیسوی میں گولڈرش شروع کیا۔ کالج میں ہم لوگ ایک پرانا امریکن گیت گاتے تھے۔

DWELL A MINER, FORTY NINER, GAO A

DAUGHTER CLEMENTINE

یہ بھی رومانس اور لیجنڈ کا شہر ہے۔ سارے امریکہ کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہاں کے باشندے طرح طرح کے کارنیوال مناتے ہیں اور اپنی خوش باش زندگی کے لیے مشہور ہیں۔

سان فرانسسکو کے نزدیک اوک لینڈ کی طیران گاہ پر چچازاد بہن خالدہ حیدر کی لڑکی زیبا مع اپنی پاکستانی دوست کوکب۔ زیبا کون کورڈیا یونیورسٹی مونٹریال (کینیڈا) سے ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن کے امتحان میں پانچ سو طلبا میں اوّل رہی تھی اور سان فرانسسکو کے ایک فاسٹ فوڈ چین اسٹور کی منیجر بن چکی تھی۔

کوکب نے زیبا کی کار اسٹارٹ کر کے فراٹے سے برکلے کی سمت جانے والی فری وے پر چھوڑ دی۔ یہ نوعمر پاکستانی لڑکیاں انتہائی خوداعتمادی اور اطمینان کے ساتھ سان فرانسسکو میں

اپنے اپنے کیریئر شروع کر رہی تھیں اور قریب کے شہر ماؤنٹین ویو میں ایک بنگلہ کرائے پر لے کر رہتی تھیں۔

امریکہ میں دو ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔ ہر ریاست میں سرکاری یونیورسٹیوں کا ایک COMPLEX ہے۔ ''یونیورسٹی آف کیلیفورنیا'' اس ریاست کے چھ شہروں میں اسی نام سے موجود ہے۔ مشہورِ عالم ''بیرل یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے'' کا حسین اور پُر فضا کیمپس۔ خود شہر سان فرانسسکو دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے ایک سرسبز پہاڑیاں، اونچے نیچے بل کھاتے راستے سورش ہسپانوی طرز کے مکانات، عظیم الشان ڈاؤن ٹاؤن، تیز نیلا بحرالکاہل۔

منصور العارفین برکلے میں کیمپس کے نزدیک پارکر اسٹریٹ نامی ایک خوش منظر محلے کے اندر ایک نفیس اپارٹمنٹ میں اپنے ساتھی طالب علم یونس کے ساتھ رہتا تھا۔ یونس پاکستان کے سب سے بلند پایہ قائد اعظم اسکالرشپ پر ریاضی پڑھنے آیا تھا۔ دونوں بے حد ذہین، نیک اور خوش مزاج لڑکے تھے۔ منصور العارفین جو لاہور میں کنڈرگارٹن کلاس سے زیبا کا ہم جماعت رہا تھا، برکلے میں پڑھنے کے علاوہ جزوقتی ملازمت بھی کر رہا تھا۔ ایک شام اُن کے ہاں آئے ہوئے ایک ہندستانی طالب علم نے مجھ سے کہا۔ بتائیے ہمارے پتاجی کی ہر پندرھویں روز چٹھی آتی ہے، کہ واپس آ جاؤ واپس جا کر جوتیاں چٹخائیں؟ جتنا یہاں پڑھا ہے اس کے لحاظ سے منتریوں کی سفارش لگانے پر سات آٹھ سو کی نوکری ملے گی یا نہ بھی ملے۔ یہاں پارٹ ٹائم کام کر کے بھی اتنا کما لیتے ہیں کہ ایسے اچھے اور فرنشڈ اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیتے ہیں۔ مع وال ٹو وال کارپٹ، بڑھیا فرنیچر، مستقل گیس، فریجڈ ٹیلیفون لگوانے کے لیے صبح بل کمپنی سے کہو چھ گھنٹے کے اندر اندر اُن کا آدمی ٹیلیفون لگا جائے گا۔ بمبئی میں اپارٹمنٹ کتنا مہنگا ملے گا؟ اور وہ بھی خالی۔ فرنیچر، بنا گیس، یہاں مکانوں کی کوئی کمی نہیں۔ اسٹوڈنٹ لوگ اس ٹھاٹھ سے رہتے ہیں، جب ہر طرح کی آسائش یہاں موجود ہے تو ہم واپس جا کر پیارے دیش میں کیا بھاڑ جھونکیں؟''

''گھر یاد نہیں آتا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت یاد آتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی سب۔ یہی تو ہم لوگوں کا یہاں...... ہے'' اس

نے افسردگی سے کہا۔

پارکر اسٹریٹ سے کچھ فاصلے پر نہایت کلرفل بازار تھا۔ بےفکر ابشاش ماحول لوگ باگ بانسری گٹار مینڈولین بجاتے پھر رہے تھے۔ اپاہج طلبا اپنی موٹر کرسیوں پر مزے سے گھوم رہے تھے۔ ایک اپاہج نوجوان اپنی مخصوص کار خود چلاتا ہوا آیا۔ بغیر کسی کی مدد کے خود اپنے کل پرزوں پر چلتا ہوا کار سے اُتر کر کتابوں کی دوکان میں داخل ہوگیا۔ کیمپس پر ایک آرکیڈ میں ایک کالا طالب علم میوزک سامنے رکھے ہوئے وائلن پر کوئی کلاسیکل نغمہ بجا رہا تھا۔ وائلن کا کیس سامنے کھلا رکھا تھا۔ سامنے سے گزرتے طالب علم ٹھٹھک کر سنتے کیس میں چند سکے رکھتے اور آگے چلے جاتے وہ آدمی اپنی موسیقی فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ یہ گویا اس کا جزوقتی پیشہ تھا۔

کیلی فورنیا بہ لحاظ سائنس اور ٹیکنالوجی باقی سارے امریکہ سے آگے ہے۔ ساتھ ہی آزاد منش فن کاروں اور ادیبوں کا اڈہ ہے۔ سان فرانسسکو نیویارک اور شکاگو کی طرح بڑا ادبی اور صحافتی مرکز ہے۔ سارے انوکھے دل جلے شرب بھی یہیں شروع سے ہوئے، ہندو آشرموں کی افراط، بھانت بھانت کے ایکو ونک قائد کے حلقے۔ ہپی سب سے پہلے یہیں نمودار ہوئے تھے۔ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے اپنی آزاد خیالی کے لیے مشہور ہے۔ ایک صبح اس کے چوک میں ہائیڈ پارک لندن کی طرح جگہ جگہ مختلف مسائل پر دھواں دھار تقریریں کی جارہی تھیں۔ چہار طرف طرح طرح کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک سمت کے لب یعنی ہم جنسوں کی آزادی کے علم بردار اپنے اسٹال سجائے بیٹھے تھے اور اپنے پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے۔ یونین کی عمارت کے سامنے جم غفیر، شاہ مخالف مظاہرہ، دھواں دھار تقریریں، لڑکے اور لڑکیاں درختوں پر چڑھے بیٹھے تھے۔ '''انسانیت کش شاہ ایران کو امریکہ سے واپس کرو۔'' کے پرچم اور پوسٹر ایک لڑکی'' کمیونسٹ پارٹی آف یو ایس اے'' کا پمفلٹ میرے ہاتھ میں تھما کر آگے بڑھ گئی۔ تہران میں یرغمالیوں کی نظربندی کا دسواں یا گیارھواں روز تھا اور سارے ملک میں ایک تہ چا تھا۔

ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کی عمارت کے سامنے '' گھڑیال نے گجر بجایا''۔ روز دوپہر کو یہ گھنٹہ گھر باری باری ان سب ملکوں میں سے ایک کی قومی دھن بجاتا ہے جن کے طالب یہاں

پڑھ رہے ہیں۔" زیبا نے بتایا۔" کل پاکستان کی قومی دھن بجی تھی۔"

نوجوان طالب علم ذوالفقار علی بھٹو اسی کیمپس پر گھومتے تھے۔ اس بات کو ابھی اتنا زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ اور وہ جلاوطن محمد رضا پہلوی جن کے خلاف سامنے یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے چوک میں احتجاج جلسہ ہو رہا تھا۔ محض چند سال قبل بحیثیت اعلیٰ حضرت شہنشاہ آریہ مہر' وزیراعظم پاکستان —— بھٹو سے ملنے اسٹیٹ وزٹ پر گز وفر پرویزی کے ساتھ پاکستان جاتے تھے اور بھٹو کی زمین داری واقع ضلع لاڑکانہ میں شکار کھیلتے تھے۔ کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ۔

گھنٹہ گھر کے نزدیک ایک خوب صورت پل کے نیچے پہاڑی نالے کا پانی بہتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر بروس پرے کے دفتر کے کلیسائی دریچوں کے باہر اونچے درخت خوش گوار دھوپ میں نہا رہے تھے۔ کمرے کے اندر اُردو کے چند امریکن طالب علم پھانسی کے سزا یافتہ دہشت پسندوں کے متعلق سوالات کرنے میں مصروف تھے جن کا تذکرہ " آخر شب کے ہم سفر" میں کیا گیا تھا۔ (ڈاکٹر بروس پرے نے وہ مضمون اپنے امریکن شاگرد مارٹن کو زیروکس کر کے لانے کے لیے کہا)، مارٹن پل کی پل میں غائب ہو گیا۔

اتنی خوبصورت، سہانی، دلچسپ، مسرت بخش، فرحت انگیز دُنیا اور چند انسانوں کو چند انسان سیاست کے نام پر پھانسی دے کر، گولی سے اُڑا کر، زہر بم پھینک کر، خنجر بھونک کر اس عالم رنگ و بو سے معدوم کر دیتے ہیں آخر کیوں؟ ایران میں پچھلے برسوں میں کتنے مارے گئے اور اب بھی کتنے مارے جا رہے تھے۔ بساطِ ارض پر ہر جگہ شانتی، شانتی۔ چند امریکن سوامی مالا جپتے باہر نالے کے پل پر سے گزر گئے۔" یہاں برکلے میں ایک ماتا جی بھی نمودار ہو گئی ہیں۔" دوپہر کو کیمپس کے ایک جھلملاتے ریستوران میں لنچ کی میز پر جتندر کمار جین نے مجھ سے کہا" کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔" میں نے جواب دے دیا۔

امن ہر قیمت پر امن حاصل کرنا چاہیے۔

تو فلسطینی مجاہد؟ کویکرز کے پاس بھی اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

اس پلیٹ گلاس طعام خانے کے باہر سرسبز سرسراتے جنگل پر بارش کی جانفزا پھوار پڑ رہی تھی۔ سرمئی راستے پر کیمپس پولیس کی پٹرول کار گشت کرتی نکل گئی۔ طعام خانے کے مقابل میں اسٹوڈنٹس یونین کی یونانی عمارت کے چوک میں معزول شاہِ ایران کے خلاف مظاہرہ جاری ہے۔ "میں اس جلسے کی تصویریں لیتی مگر اپنا کیمرہ گھر بھول آئی۔" میں نے کہا۔ "مجھے کنجی دیجیے میں جا کر لے آتا ہوں۔" مارٹن نے کہا۔ زیبا نے اسے کنجی دے کر منصور العارفین کے اپارٹمنٹ کا پتہ اور اندر کا نقشہ سمجھایا۔ لونگ روم سے گیلری میں جا کر بائیں دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ فرش پر بہت سا سفری اسباب بکھرا نظر آئے گا۔ اس میں کیمرہ تلاش کر لینا۔ آسان بات ہے۔"

مارٹن نے ہوش مندی سے سر ہلایا اور ترنت کیمرہ لے کر واپس آیا۔ کھانے کے بعد اس نے "پت جھڑ کی آواز" کی ہیروئن "تنویر فاطمہ" کی ابنارمل نفسیات کے متعلق ذہین سوالات کیے۔ اِدھر جتندر کمار جین (جن کے اور راقم الحروف کے لیے لنچ دیا گیا تھا) فصیح و بلیغ اُردو بول رہے تھے۔ موصوف تین دن کے لیے نیویارک سے آئے ہوئے تھے۔

مغرب اور سوشلسٹ ممالک کی یونیورسٹیوں میں جو طالب علم برصغیر کی زبانیں پڑھنا شروع کرتے ہیں وہ اکثر اُردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ نامور ہندی ادیب جب نجی طور پر بات چیت کرتے ہیں تو بے ساختہ اور لامحالہ اُردو بولتے ہیں۔ لیکن اُردو کی جو صورتِ حال ہے تو ہے۔ عبرت۔ عبرت۔ پریذیڈنٹس رُوم (جس کی دیوار پر یونیورسٹی کے سابق پریذیڈنٹوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ منعقد راقم الحروف کے سیمینار کے لیے (جس کا اعلان سان فرانسسکو کرانیکل میں چند روز قبل کیا جا چکا تھا)۔ کافی سامعین موجود تھے۔ اُردو والے...... آہاہا۔ دیکھیے صاحب مغرب میں بھی لوگ اُردو پڑھ رہے ہیں۔ بنکاک یا قاہرہ بغداد کی یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھائی جائے تو اتنے مرعوب نہ ہوں گے۔

سیمینار سے قبل پروفیسر بردس پرے نے لسانیات کے دارالعمل میں کارِ جہاں دراز ہے جلد اوّل کے دو طویل ابواب "باغی سپاہی" اور "کیا پلٹن اور کیا پائے سوز" ریکارڈ کروائے اور مارٹن نے لکھنؤ کے متعلق پوچھا۔ یہ الگ بات ہے کہ دتی اور لکھنؤ دونوں کے تلفظ معدوم ہونے

والے ہیں۔

سان فرانسسکو ایک پرستانی شہر ہے۔ ابھی خیال آیا کہ اس کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں۔ امردوں کو انگلستان میں FAIRY کہتے ہیں۔ سان فرانسسکو میں سُنا ہے ہر ساتواں شخص GAY ہے۔ اُردو میں اس قسم کے لوگوں کو "جنت کی چڑیاں" کہا جاتا تھا (نجانے اس کی وجہ تسمیہ کیا تھی شہر میں پرانا رومینٹک ماحول قائم رکھنے کے لیے چند سڑکوں پر ٹرام گاڑیاں باقی رکھی گئی ہیں۔ زیبا اور میں ایک ٹرام گاڑی پر چڑھے۔ اس نے ٹن ٹن کر کے چڑھائی پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ زیبا بیگم جو مسلسل میری تصویریں کھینچتی رہتی تھیں اچانک چلتی ٹرام سے سڑک پر اُتریں۔ تصویر کھینچی اور پھر کود کر او پر آ گئیں۔ میں نے خوب ڈانٹا" اور نہ ہوئے اس وقت بشیر خاں ڈرائیور ورنہ زمین آسمان ایک کر دیتے۔" میں نے کہا۔ "آپ کی والدہ محترمہ کے ہشکارنے پر روانہ ہونے والی کار کے پیچھے لگیج کیریئر میں اُن کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔"

"لگیج کیریئر—؟" زیبا نے اپنی والدہ محترمہ کی طرح آنکھیں گول کر کے پوچھا۔

"ہاں اس زمانے میں ڈگی کے بجائے ہوتا تھا۔ ہمارا لگیج کیریئر بہت چوڑا تھا۔ ہم لوگ اس پر چڑھ کر بیٹھ گئے بری طرح حادثہ ہو جاتا۔ بشیر خاں نے ایک راہ گیر کے بتانے پر کار روکی اور خوب جھاڑا۔" فرانسسکو واپس پہنچے جب ٹرام گاڑی پولک اسٹریٹ کے نزدیک رکی۔ پولک اسٹریٹ شہر کے GAY لوگوں کی آماجگاہ تھی۔ اُن کی رقص گاہیں شراب خانے، کتابوں اور رسالوں کی دکانیں (ایک چینی کتب فروش کی دوکان کے دریچے میں PLAY BOY کی قسم کے اَن گنت CAKE رسالے رکھے ہوئے تھے) ان کے مخصوص فیشن کی ملبوسات کے ڈپارٹمنٹ اسٹور اور ریسٹوران۔

دوسرے روز ہم لوگ سان فرانسسکو سے چند میل دُور ایک حسین یورپین نما ساحلی شہر سامسلیٹو گئے۔ وہاں ایک ریسٹوران کے دریچے میں چند خواتین سی بیٹھی نظر آئیں۔ دوبارہ غور سے دیکھا وہ سب حضرات تھے۔ واپسی پر رات کو سان فرانسسکو کی ایک نیم تاریک رقص گاہ میں جھانکا، وہاں رنگ برنگی متحرک روشنیوں میں مرد مردوں کے ساتھ ڈسکو رقص کر رہے تھے۔ بڑا بھیانک سا ماحول تھا۔ لیکن ہمیں مغرب کے اس اخلاقی زوال پر اپنے اخلاقی برہمی کے اظہار

کرنے سے پہلے روایتی فارسی اور روایتی اُردو شاعری پڑھ لینی چاہیے۔

''سنا ہے برکلے میں ایک لزبین بار بھی موجود ہے۔ لگے ہاتھوں وہ بھی دیکھتے چلیں۔'' منصور العارفین نے برکلے کی سمت کار موڑتے ہوئے کہا۔ سان فرانسسکو کی یہ GAY دُنیا باقاعدہ ٹورسٹ اٹریکشن بن چکی ہے۔'' اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ برکلے واپس پہنچ کر ہم لوگ اس بار کا پتہ نشان ڈھونڈتے پھرے۔ ایک سنسان سڑک پر ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے ایک ٹرک کھڑی تھی۔ برجس میں ملبوس سیاہ مردانہ فلیٹ ہیٹ ترچھی لگائے ایک خاتون ایک دروازے سے نکلی اور ٹرک اسٹارٹ کر کے روانہ ہوگئی۔

ایک عورت دروازے کے سامنے جھاڑو دے کر شکستہ بوتلیں سمیٹ رہی تھیں۔ ایک خوش شکل لڑکی چست مردانہ لباس پہنے (جو عام لڑکوں اور لڑکیوں کی جینز یا سلیکس سے مختلف تھا) سر پر سیاہ مردانہ ہیٹ ترچھی لگائے چیلو کا کیس سنبھالے سڑک پار کر کے اس دروازے پر پہنچی۔ جھاڑو والی عورت بڑبڑائی۔ ''کیا ہوا؟'' نووارد لڑکی نے پوچھا ''برابر کی دکان والے سارا کچرا اور ٹوٹی بوتلیں جان بوجھ کر یہاں پھینکتے ہیں۔''۔ جھاڑو والی نے جواب دیا۔

''سُور کے بچے''۔ چیلو بجانے والی لڑکی بولی، اور اندر چلی گئی۔ بعض اوقات کسی منظر کی صرف ایک جھلک یا چند الفاظ ایک صورتِ حال کو منکشف کر دیتے ہیں۔ ظاہر تھا کہ پاس پڑوس کے لوگ اس کلب کو ناپسند کرتے تھے۔

کار سے اُتر کر ہم چاروں ذرا تذبذب میں تھے۔ اندر کس طرح جائیں۔ صاف پتہ چل جاتا کہ ان لوگوں کو ایک عجوبہ سمجھ کر بطور سیاح اُنھیں دیکھنے آئے ہیں۔ ہمت کر کے میں زیبا اور منصور العارفین اور یونس اندر گئے۔

بار پر دو اُداس صورت لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک موٹے شیشوں کی عینک لگائے کم رو بھدی سی لڑکی تھی۔ دیواروں پر ویمنز لب تحریک کے زیرِ قیادت دیے جانے والے لیکچروں مذاکروں اور فلم شوز وغیرہ کے پوسٹر لگے تھے۔ ''یہ بڑا غضب ہوا کہ ویمنز لب تحریک یہاں ایک حد تک لزبین خواتین کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔'' زیبا نے کہا۔

کلب خالی پڑا تھا۔ بلیرڈ کی میز کے قریب چیلو بجانے والی لڑکی اپنا ساز درست کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ کوارٹیٹ کی باقی اراکین ابھی نہیں آئی تھیں۔ شاید وہاں موسیقی کا پروگرام ہونے والا تھا۔ بار پر بیٹھی خواتین نے ہمیں ناگواری سے دیکھا۔ منصور العارفین اور یونس بالکل دُشمن علاقے میں کھڑے تھے۔ ''چلو واپس چلیں۔ آئیڈیا ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ہم چاروں جو دراصل خاصے نروس تھے۔ باہر آئے۔ جہاز والی کوڑا اسیٹ کر جا چکی تھی۔ اسٹریٹ لیمپوں کی پیلی بیمار روشنی میں سڑک اور زیادہ افسردہ اور بیمار معلوم ہو رہی تھی۔

سان فرانسسکو شہر میں ہیٹ ایش بری کا محلہ بھی اب خاموش پڑا تھا۔ پندرہ سال قبل جہاں سے ذیلی کلچرز اور آزاد رویوں کے یہ سارے غلغلے اُٹھے، اسی محلے کے باغیوں نے سارے مغرب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ہپی۔ فلاور چلڈرن۔ ایل ایس ڈی کھانے والے ہم جنسوں کی آزادی کے علم بردار ہرے کرشنا والے بھی کا اس محلے میں ظہور ہوا۔ اب وہ خطہ بہت باعزت ہو گیا تھا۔ وہ باغی امریکہ اور مغرب کی سماجی تاریخ میں اپنا احتجاجی رول ادا کر کے غائب ہو گئے۔ (ایلن گنز برگ جس کی معرکۃ الآرا طویل نظم HWOL نے مڈل کلاس امریکہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ان سر پھروں کا گرو تھا، احتجاج کی اب ضرورت نہیں رہی۔ دس پندرہ سال کے اندر اندر وہ سارے جدید رویے اب امریکن زندگی کے مرکزی دھارے میں شامل ہو چکے تھے۔ مڈل کلاس منافقت کے خلاف جو زبردست احتجاج اس نئی نسل نے کیا تھا وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔

فرشتوں کی ملکہ مریم کا شہر

اہلِ ہسپانیہ نے بسایا تھا۔ ایل پیو بلو دی نیوترا اسینورالا رینا دی لاس انجلس۔ "ہماری بی بی ملکۃ الملائکہ کا شہر" امریکہ اور میکزیکو کی جنگ کے بعد صلح نامے کی رو سے امریکہ نے اس شہر اور سارے کیلیفورنیا پر قبضہ کرلیا۔ امریکہ کی قومی اساطیر میں پلگرم فادرز ریڈ انڈین قبائل کے خلاف لڑائیاں، پائینرز، کاؤبوائے، وائلڈ ویسٹ کی آبادکاری، گولڈ رش امریکن خانہ جنگی، حبشی غلاموں کی آزادی وغیرہ شامل ہے جسے مارک ٹوین، برٹ ہارٹ، دوسرے ناول نگاروں اور بعد میں ہالی ووڈ فلموں میں پیش کیا گیا۔ اسی گولڈ رش کے لیے ہزارہا چینی بحرالکاہل عبور کر کے کیلیفورنیا پہنچا تھا۔

"غریب میکزیکن اب بھی متواتر سرحد پار کر کے تلاشِ روزگار میں لاس انجلز آتے رہتے ہیں۔" میرے بھتیجے منصور حیدر نے کہا کہ ہم لوگ لاس انجلز ایرپورٹ سے بہت دُور نارتھ ہالی ووڈ کی طرف جارہے تھے۔ یہ شہر بہت بڑا ہے مگر سان فرانسسکو جیسا خوب صورت نہیں۔ میں نے اظہارِ خیال کیا شمالی ہالی ووڈ کے ایک خوب صورت رہائشی علاقے میں ہسپانوی طرز کے سُرخ کھپریل والے سفید دومنزلہ مکان میں میرے بھتیجوں کا اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔ داخلے کے ہال میں بھورا دبیز قالین۔ بڑھیا صوفے۔ نفیس جالی کے پردے۔ اُوپر اسی طرح کا اپارٹمنٹ جیسا سان فرانسسکو میں منصور العارفین کا تھا۔ میرے بھائی سیّد مصطفےٰ حیدر کے تین بڑے لڑکے یہاں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس انجلز میں زیرِ تعلیم تھے اور جز وقتی ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ اُن کی بڑی بہن ناہید اسی طرح شہر کی یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا میں ڈیڑھ سال ٹیکس ایڈمنسٹریشن پڑھ کر اپنی سی ایس پی کی ملازمت پر کراچی واپس جاچکی تھی۔ اس سے چھوٹا جلال حیدری ایس پی جو کراچی میں مجسٹریٹ تھا پندرہ ماہ کی چھٹی لے کر بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے آیا تھا۔ مجھلے اور

چھوٹے عدنان حیدر اور منصور حیدر انٹرنیشنل فنانس وغیرہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ وہ زمانے لد گئے جب برصغیر کے نوجوان شیکسپیئر اور ارسطو کے مطالعے کے لیے انگلستان جاتے تھے۔

بچوں کے باورچی خانے کے دریچے میں سے دور ایک پہاڑی پر سفید حروف میں HOLLY WOOD لکھا صاف نظر آتا تھا۔ مکان سے کچھ فاصلے پر سانتا مونیکا سان مارینو وغیرہ جانے والی سڑکوں کے بورڈ لگے تھے۔ ذرا فاصلے پر سن سیٹ بولیوار تھی۔ معقول لڑکپن میں ان جگہوں کے نام بڑے سحرانگیز لگتے تھے۔ سان فرنینڈو ویلی، جان اسٹین بک وغیرہ کے ناولوں میں اس کا ذکر بہت پڑھا۔ وہ وادی سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ دو پہاڑیوں کے درمیان کھلی فضا کے یونیورسل ایمفی تھیٹر میں ساڑھے پانچ ہزار سیٹیں تھیں اور اسٹیج پر فرینک سناٹرا۔ ڈونا سمر، کینی راجوز وغیرہ شام کو اپنے شو پیش کرتے تھے۔ ایک صبح یونیورسل سٹی میں سیاحوں کی طویل قطاریں اندر جانے کی منتظر تھیں۔ بچوں کے ساتھ قطار میں اپنی "گلیمر ٹرین" کی باری کی منتظر تھی جب اچانک فرینک اسٹین سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ سہم کر رہ گئی۔ وہ مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ سبز رنگ کا میک اپ کیسے بے حد طویل القامت دیوپیکر فرینک اسٹین اس مستقل تماشے کا ایک کردار تھا۔

گلیمر ٹرین ساری یونیورسل سٹی کا چکر لگاتی ایک سرنگ میں داخل ہوئی۔ اچانک LASER شعاعیں چمکنے لگیں۔ سائنس فکشن کے متعدد کردار فولادی اسپیس سوٹ پہنے ٹرین کی طرف لپکے۔ بھیانک دھماکے، طرح طرح کی آوازیں۔ آؤٹر اسپیس کے ایک جہاز نے ٹرین کا راستہ روک لیا۔ LASER توپیں چلیں۔ ٹرین کا کنڈکٹر خوفناک آواز میں بولا۔ "مسافرو۔ بڑا افسوس ہے کہ ہم ایک غیر متوقع مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ لیکن فکر نہ کیجیے۔" (پھر بندوقیں چلیں) ایک سو بیس سیاحوں سے بھری گلیمر ٹرین ایک UFO پر چڑھ گئی۔ بلپ، بلپ، روشنیاں۔ ٹرین مصنوعی خلا میں پرواز کرنے لگی۔ سیاروں کی جنگ شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد ٹرین سرنگ سے باہر نکلی (یہ سارا ماجرا یونیورسل پکچرز کی فلم ـــــ BATTLE OF GAIACTICA کا تھا جسے روزانہ ان ہزاروں سیاحوں کے لیے اس سرنگ میں کئی بار دہرایا جاتا تھا جن کی "گلیمر ٹرینیں" ایک کے بعد ایک ساری یونیورسل سٹی کے عجائب و غرائب کی سیر کرواتی رہتی تھیں۔

ہماری ٹرین اب ندی کے اونچے چوبی پل پر چڑھی۔ وسط میں پہنچتے ہی پل "ٹوٹ" گیا۔ ٹرین ایک دھچکے سے ٹوٹے ہوئے راستے پر سے نکل کر "بحیرۂ احمر" پر آئی۔ یہ جھیل TEN COMMANOMENTS فلم کے لیے بنائی گئی تھی۔ اچانک پانی کے دو حصے ہوئے اور ٹرین حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرح "بحیرہ احمر" میں سے نکل گئی۔ ایک اور جھیل پر پہنچے جس کے اندر "JAWS" والی شارک پڑی ہوئی تھی۔ دور جھیل کے وسط میں آدمی ناؤ میں بیٹھا تھا۔ مصنوعی شارک نے اس پر حملہ کیا۔ مصنوعی آدمی پانی میں گر پڑا۔ خون کا فوارہ اُبلا۔ اب شارک منہ کھول کر ہماری طرف لپکی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اصل شارک نہیں۔ ٹرین جھیل کے کنارے سے آگے بڑھی۔

یہ سارے تماشے متواتر بالکل صحیح وقت پر دکھائے جاتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کی بھول چوک نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر اس شارک سے میکینکل حرکت اور رفتار میں ذرا سی بھی غلطی یا دیر ہو تو یہ ٹرین سے ٹکرا سکتی ہے۔ "لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" جلال میاں نے کہا۔ "سرنگ میں جب وہ مریخ کا آدمی ٹرین کی طرف بڑھا اور LASER تو پیں چلیں تو چند سیکنڈ کے لیے مجھے بھی ڈر لگا تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔

اب ہم لوگ وائلڈ ویسٹ کے ایک پچھلی صدی کے شہر میں سے گزر رہے تھے جس میں سینکڑوں کاؤبوائے فلم بن چکے تھے۔ ایک دومنزلہ مکان میں مستقل آگ لگ رہی تھی اور ایک مصنوعی کاؤبوائے اوپر سے کود رہا تھا۔ اس کے بعد یورپ کے مختلف شہر، جھیلیں، قرونِ وسطیٰ کے قلعے۔ ٹرین سے اُتر کر ہم لوگ ایک مستقل سیٹ پر گئے۔ جہاں ایک جمبو جیٹ رکھا تھا جو گویا پانی میں ڈوب رہا تھا۔ ڈائرکٹر نے ناظرین میں سے چند کو اوپر بلایا اور ان کو سمجھا کر جمبو جیٹ کے اندر فلم بندی شروع کی۔ چند منٹ بعد وہیں ٹی وی اسکرین پر وہ پورا سین دکھلا دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ اصل فلم کے انٹرکٹ دکھلائے گئے جن میں جیک لیمن اور ڈیرن مک گیون نے کام کیا تھا۔ اصل فلم کے مناظر اور اُن کی نقل میں کوئی فرق نہ تھا۔

سارا ہالی ووڈ کا "پیالہ" یعنی گول وادی اور اس کے چاروں طرف پہاڑ یونیورسل سٹی کے

اوپر کھلے ریستوران سے نظر آتے ہیں۔ ریستوران میں ہر میز پر قیمتی کاغذ KLEENAX رومالوں کے بڑے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ (یہ ڈبے ہر امریکن گھر کے ہر کمرے میں بھی موجود ہوتے ہیں) اس وسیع کھلے ریستوران میں جہاں سینکڑوں لوگ آ جا رہے تھے کوئی یہ ڈبے چرانے والا نہ تھا۔

ایک مرتبہ کراچی میں مشہور کرکٹ کمنٹیٹر اور صحافی عمر قریشی نے (جو برکلے میں ذوالفقار علی بھٹو کا ہم جماعت رہ چکا تھا) مجھے بتایا تھا کہ جب وہ یو سی ایل اے میں پڑھتا تھا تو وہ اور اس کے خوش شکل ساتھی ہالی ووڈ فلموں کا خصوصاً BIBLICAL EDICS میں (جن کا ان دنوں بہت زور تھا) چھوٹے چھوٹے رول کیا کرتے تھے۔ جس کے ان کو بہت پیسے ملتے تھے۔ اسی ریستوران میں کچھ دیر بعد تینوں بچے مزید کافی وغیرہ لانے کے لیے دکانوں کی سمت گئے۔ قریب کی میز پر تنہا بیٹھی ایک حسین لڑکی نے توصیفانہ نظر ان پر ڈال کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ جواباً میں بھی مندرجہ ذیل مکالمہ:

''یہ بے حد ہینڈسم نوجوان یہاں اداکار ہیں؟''

''نہیں۔''

''کون ہیں؟ ہسپانوی۔ اطالوی؟''

''پاکستانی۔''

لڑکی۔ بلینک۔ پھر۔ ''ان کو یہاں ڈسکور کر لینا چاہیے۔''

''ان بے حد ذہین اور پڑھائی کے شوقین بچوں کو فلموں میں کام کرنے کا قطعی شوق نہیں۔ کیا تم ٹیلنٹ اسکاؤٹ ہو؟''

لڑکی (ٹھنڈا سانس) ''نہیں۔ یہاں کام کی متلاشی۔ آپ؟''

''میں؟ (پراسرار توقف) خاتون لاما۔''

لڑکی بلینک۔

''لاما۔ بدھسٹ سوامی۔''

''اوہ۔ لیڈی گوروا!''

میں: مشفقانہ، روحانیت سے پُرمسکراہٹ چہرۂ پُرنور۔

لڑکی: اچانک دلچسپی میں برازیل سے آئی ہوں۔ کیا میں یہاں کامیاب ہوسکوں گی؟ یعنی کراؤڈ سین کے علاوہ؟

میں: ہو بھی سکتی ہو اور نہیں بھی۔ یہ اس آدمی پر منحصر ہے جو شمال سے آئے گا۔ قد بہت لمبا ہوگا۔ سرخ بال۔ بائیں کنپٹی پر زخم کا نشان اور اس کے نام کا پہلا حرف ایل ہوگا۔''

بچے واپس آئے۔ یہ عجیب و غریب مکالمہ کان میں پڑا۔ اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ اتنے میں اس بے چاری کا فرانٹ سا ساتھی آگیا اور پرتگالی میں اس سے تیز تیز بولنے لگا۔ مجھے اشٹین بک کے ناول THE WAY WARD BUS کی غریب لڑکی یاد آئی جو کلارک گیبل پر عاشق تھی اور ہالی ووڈ پہنچ کر اسٹار بننے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔

ڈزنی لینڈ دنیا کا ''مسرور ترین مقام'' کہلاتا ہے اور اس کی سیر کے لیے کم از کم ایک ہفتہ درکار ہے۔ اسی وجہ سے دور دور سے لوگ آ کر ڈزنی لینڈ ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ جو ایک برق رفتار مونو ریل کے ذریعہ اس حیرت ناک جگہ سے ملحق ہے۔ وہ مونو ریل ایک بہت اونچے پُل پر ایک پٹری پر زائیں زائیں چلتی رہتی ہے۔

یہ اتنی تیزی سے ترچھی ترچھی چل رہی ہے کہیں گر نہ جائے۔ میں نے نیچے سڑک پر کھڑے ہو کر فکرمندی سے کہا۔ ''پھوپھی آپ کا مزاج بالکل میکینیکل نہیں ہے۔ فکر نہ کیجیے یہ ریل بالکل نہیں گرے گی۔'' عدنان میاں ہنس کر بولے۔ نیچے کار پارک میں امریکن سیلانیوں کی ہزارہا کاروان کاریں موجود تھیں۔ ان متحرک پرتکلف گھروں میں دوسرے شہروں سے اپنے بچوں کے ساتھ ڈزنی لینڈ آئے تھے۔

ڈزنی لینڈ کے اندر ''واشنگٹن ڈی سی'' میں ابراہیم لنکن کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ ایک

تھیٹر ہال میں زبردست ریوالنگ اسٹیج پر والٹ ڈزنی کے سارے بولتے گاتے ناچتے جانور پلوٹو گرنی ڈونلڈ ڈک وغیرہ وغیرہ مزاحیہ ڈرامہ پیش کرنے میں مصروف تھے۔ ہر پتلا میکینیکل اور الیکٹرونک تھا۔ ایک جگہ امریکن تاریخ کے سارے ادوار یکجا کر دیے گئے تھے۔ ''مین اسٹریٹ'' میں گھوڑے والی ٹرامیں چل رہی تھیں۔ ایک سینما حال میں خاموش فلم دکھائے جا رہے تھے۔ فینسی لینڈ میں اسنووائٹ اور بونے ایلس کا پورا ونڈر لینڈ، سلیپنگ بیوٹی اور کنگ آرتھر کے قلعے مع دربار اور نائٹ اور ساحر اور سب متحرک اور گویا جھیلوں کے کنارے گھنے جنگلوں میں اصلی ہاتھی۔ سرکس ٹرین فیرٹیلز لینڈ میں کاؤبوائے اور ''انڈین'' اور وائلڈ ویسٹ کے سموچے قصبے۔ پورا لندن شہر۔ اس کے اوپر اُڑتا پیٹرپین۔ ایک دریا کے دونوں طرف پریوں کے مشہور مغربی کہانیوں کے مناظر موجود تھے۔

دریا پر سے تماشائیوں کی کشتیاں گزر رہی تھیں۔ ٹومارو لینڈ یعنی ''کل کی دنیا'' میں سائنس کے عجائبات خلا کا ''بلیک ہول''۔ پھر مارک ٹوئین کی اسٹیم بوٹ'' جو دنیا کے مشہور جنگلوں'' میں بہتے ''دریاؤں'' پر سے گزر رہی تھی۔ ہسپانوی بحری قزاقوں کے جہاز کرسٹفر کولمبس کا جہاز۔ پرانی وضع کی ٹرین نیو اورلینز کے ایک پرانے محل میں مسخرے بھوت ٹام سوائیر کا جزیرہ سولھویں سترھویں میں نئے براعظم اور ملک دریافت کرنے والے یورپیوں کے جہاز مغرب نے پچھلے چار سو سال میں جو زبردست ترقی کی ہے اس کا پورا مرقع ڈزنی لینڈ میں انتہائی دلآویز اور ڈرامائی طریقے سے پیش کر دیا گیا تھا۔

ڈزنی لینڈ کے نیچے مصنوعی سمندر ہے۔ اس کا ایک حصہ جھیل کی صورت میں نظر آ رہا تھا، اس میں ڈبکی کشتیاں کھڑی تھیں۔ ہر جگہ سیاحوں کی بھیڑ، بچے، جوان، بوڑھے مگر سب خاموش، منظم قطاریں، شور وغل مفقود۔ ایک ڈبکی کشتی میں اُتر کر عدنان منصور اور میں دریچوں کے سامنے بیٹھ گئے۔ کشتی تہ آب چلی گئی۔

اب روشن سمندر میں تمام آبی کائنات نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ طرح طرح کی مچھلیاں، سمندری پودے، جنادری گھونگھے، شکستہ بادبانی جہاز اُن کے اندر زیوروں اور قیمتی

ظروف سے بھرے صندوق ہر چیز مصنوعی "سمندر" کا چکر لگا کر سب مرین اوپر آئی۔

کچھ فاصلے پر رو پہلے قصرِ اقوام کے گرداگرد ایک ندی بہہ رہی تھی۔ پل پر سے گزر کر سیاحوں کی قطاریں چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں ایک قطار میں نہر پر چلتی اس فینسی محل کے اندر داخل ہوئیں۔ جس کے پھاٹک کے اندر عربی سمیت دُنیا کی ہر بڑی زبان میں "امن" لکھا ہوا تھا۔

نہر کے دونوں جانب فرش سے بے حد اونچی چھت تک ہر ملک و قوم کے "بچے" یعنی گڑیاں اور گڈے آنکھیں جھپکا جھپکا کر ایک ساتھ انتہائی دلآویز دُھن میں گا رہے تھے ITS A SMALL WORLD بہت سی گڑیاں غیر مرئی طور سے معلق فضا میں ناچ گا رہی تھیں۔ ہر ملک کی گڑیوں کے پیچھے ان کا قومی پس منظر تھا۔ ہندستان کی نغمہ سرا رقصاں گڑیوں کے پیچھے تاج محل (جس کی سیڑھیوں پر ایک شیر بیٹھا تھا) "قصرالاقوام" کے اندر یہ ہزاروں کی تعداد میں متحرک گڑیاں گڈے جانور اور پرندے جو سب پلکیں جھپکا جھپکا کر ایک ساتھ گا رہے تھے۔ انجینئرنگ کا کمال تھا۔ کس قدر پیچیدہ مشینری اس نازک اور وسیع فینسی کو چلانے کے لیے کام کر رہی ہوگی۔ مختلف قوموں کے طرزِ تعمیر کی محرابوں (چینی، مراقشی وغیرہ وغیرہ) نیچے بل کھاتی نہر پر سے گزرتی اس انتہائی خواب ناک ماحول میں سے نکل کر کشتی محل سے باہر آئی۔ وہ گیت برابر جاری رہا۔ قصرالاقوام ڈزنی لینڈ کا حاصل مشاعرہ تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میں نے عدنان میاں سے کہا کوئی اور چیز دیکھنے کے بجائے مثلاً JOURNEY INTO INNERSPACE یا "ذرّے کے دل کے اندر سفر" یا "خلا کا بلیک ہول" وغیرہ۔ مجھے اس سے قطعی دلچسپی نہیں۔ سائنس سمجھ ہی میں نہیں آتا)۔

ایک بار پھر کشتی میں بیٹھ کر اس رو پہلے نغمے کے اندر سے گزرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم لوگ پھر وہاں گئے وہ رقصاں اور نغمہ سرا گڑیا گڈے اور وہ گیت ایک ناقابلِ فراموش خواب تھا جبکہ ایل اے سے دور لونگ بیچ پر دُنیا کا سب سے بڑا جہاز کوئن میری برطانیہ کی عظمتِ رفتہ کے ایک دھندلے خواب کی صورت میں کھڑا ہے۔ برطانوی شاہی روایات نے اہلِ امریکہ کو ہمیشہ مسحور کیا۔ انھوں نے یہ جہاز خرید کر اسے ایک ٹورسٹ اٹریکشن بنا دیا ہے۔ نیچے بکنگھم پیلس کے

سنتریوں کی وردی پہنے امریکن پہرہ دیتے ہیں اور بینڈ برطانوی دھنیں بجاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران کوئین میری ایک فوجی جہاز بنا دیا گیا تھا۔ ایک کیبن کے باہر لکھا تھا۔ ''ونسٹن چرچل یہاں رہے۔''

ایک دکان میں ایک پنجابی پاکستانی نوجوان اپنے ملک کی گھریلو مصنوعات فروخت کر رہا تھا۔ تانبے کے گلدان، پشاوری چپلیں، مخملی واسکٹیں، کرتے۔ وہ نوجوان چرچل کے بعد دنیا کا نمائندہ تھا۔

ڈاؤن ٹاؤن لاس انجلز میں ہالی ووڈ بولوار تمام مشہور فلم اسٹاروں کے ناموں سے مزین ٹائیلوں سے بنی سائیڈ واک پر سے گزرتے منصور میاں چینی تھیٹر دکھلانے لے گئے۔ جس کے فرش کے سیمنٹ میں فلمی اداکاروں کے دستخط اور پنجوں کے نشان ثبت تھے۔ راستے میں ایک آرکیڈ کے نیچے ایک نوجوان چمڑے کی پوشاک میں ملبوس، زنجیریں لگائے، کھڑا اطمینان کے ساتھ کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ منصور میاں نے کہا ــــــ

''پھوپھی دیکھیے یہ یہاں کے لیدر پیپل LEATHER PEOPLE میں سے ایک ہے۔'' جس طرح سان فرانسسکو میں زیبا اور منصور العارفین نے وہاں کی یہ عجیب الخلقت مخلوق دکھائی تھی۔ یہ ''چرمپوش لوگ'' جنت کی چڑیوں کا گویا ایک ذیلی فرقہ تھا۔ ان کے شراب خانے لیدر بار کہلاتے تھے۔ یہ لوگ نزاکت اور انسانیت کے بجائے اپنی دبنگ مردانگی کو مشتہر کرتے ہیں۔ اور چمڑے کے کپڑے پہن کر زنجیروں اور کیل کانٹوں سے لیس ہو کر اونچی بنے گھوما کرتے ہیں۔

منفرد برطانوی طنز نگار ایولین واہ نے 1948 عیسوی میں کیلی فورنیا کے چند روز قیام کے بعد اپنا وہ شاہکار طنزیہ ناول "THE LOVED ONES" اس خطے کی انوکھی رسوم تجہیز و تکفین کے بارے میں لکھا تھا۔ ''فارسٹ لان کا قبرستان اس ناول کا موضوع تھا۔ سان فرانسسکو میں منصور العارفین نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان نے بڑے اطمینان سے اپنا تعارف کرایا کہ وہ مردوں کا ہیئر ڈریسر ہے (پس ماندگان متوفی کا پورا میک اَپ ہیئر اسٹائل مینی کیور وغیرہ

کرواتے ہیں تا کہ آخری دیدار کے وقت متوفی اپنی بہترین حالت میں نظر آئے)۔

فارسٹ لائن میں مشہور عالمی فلمی ستارے اور کروڑ پتی مدفون ہیں۔ پھاٹک پر مکان کے سائز کی ایک مرمریں کتاب کے پچھلے صفحات پر اس انوکھے گورستان کے متعلق عبارت نقش ہے۔ اندر ہی ایلوتین واہ کے ناول کی سیٹنگ، چوڑی سڑکیں، پرفضا سرسبز ٹیلے، بل کھاتے خیابان، آبشار، چمنستان، جابجا خوشنما گرجا گھر، سبزے کی سطح پر ننھے ننھے کتبے، درختوں اور گرجاؤں میں بجتی پوشیدہ موسیقی، پرندوں کی مدھم چہکار، بلبل کے ریکارڈ کیے گئے نغمے۔ پھاٹک کے نزدیک ایک ٹیوڈر عمارت کے اندر دفاتر، مُردوں کی بیوٹی پارلر لاشیں حنوط کرنے کا دارالعمل، شام ہو چکی تھی۔ دفاتر بند تھے۔ گل دستوں اور پھولوں کی روشن دکان میں البتہ ایک لڑکی کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے فوراً ایلوتین واہ کے ناول کی ہیروئن کا خیال آیا۔ عجیب بات ہے، ٹیگور کے شانتی نکیتن میں ایک مرتبہ ایک جلسے کی بھیڑ میں ایک کابلی والا گھومتا پھرتا نظر آ گیا تھا جو شاید مقامی سُود خور پٹھان تھا۔

دفاتر سے کچھ فاصلے پر ایک کوشک کے دریچے میں بیٹھی متبسم خاتون نے فارسٹ لان کا مصور نقشہ پیش کیا۔

شام کے چھ بجنے والے۔ ہم لوگ آخری بلکہ اکیلے سیاح تھے۔ سارا فارسٹ لان بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ ایک چڑھائی پر گئے تا کہ "ابدی موسیقی اور ابدی راحت کی وادی" بھی دیکھ لیں، جو نقشے میں اس طرح کے ناموں والی ان گنت جگہوں میں سے ایک تھی۔ سارے قبرستان کو پھر دیکھنا ناممکن تھا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ سناٹے میں ایک سانولا آدمی نچلی سڑک پر بڑبڑاتا ہوا اکیلا چلتا نظر آیا۔ نہ جانے کون تھا۔ مخبوط الحواس یا بہرہ شکل سے ہندستانی یا پاکستانی سا معلوم ہوا۔

"اس سے بات کر کے پوچھیں؟" عدنان نے فوراً ولنٹیر کیا۔

"نہیں بھئی۔ کیا پتہ پاگل ہو۔ اب بھاگو یہاں سے۔" میں نے کہا۔ ہم لوگ واپس آئے۔ دور سیرا نیواڈا کے سلسلۂ کوہ پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک رولز رائس دبیز گمبھیرتا سے گذرتی اوپر چلی گئی۔ کیا پتہ کلارک گیبل یا ٹائرن پاور یا لینڈ ڈارقل کا کوئی عزیز یا پرستار پھول

چڑھانے آیا ہو۔ ہم لوگ پھاٹک سے باہر نکلے۔ اچانک میری نظر آسمان پر پڑی۔ محرم کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اس جگہ فارسٹ لان کیلی فورنیا میں محرم کا چاند عجیب سا لگا۔ یہ لوگ اس فینسی دُنیا میں رہنے اور فینسی قبرستانوں میں دفن ہونے والے محرم اور اس کی کائنات سے ناواقف ہیں اور واقعہ کربلا کو پہچاننے کے لیے تو تیسری آنکھ چاہیے۔

ٹیلی ویژن پر شروع شروع میں نیوز کاسٹر ایران کو آئی رین کہہ رہے تھے۔ اب انہیں ایران کہنا آگیا تھا۔ ایک روز منصور میاں کے ایک پاکستانی دوست نے مجھ سے کہا" آج مجھے کالج میں لڑکوں نے ایرانی ایرانی پکار کر بہت تنگ کیا۔ میں نے کہا کہ میں پاکستانی ہوں۔ تو وہ بولے۔ پھر بھی تو مسلمان تو ہو سب مسلمان ظالم ہوتے ہیں اور غیر منطقی اور نیم منطقی اور نیم مجنوں۔ دوسرے دن اسلام آباد کے امریکن سفارت خانے پر حملے کی خبر آئی۔ شام کو وہ لڑکا آ کر بولا" آج لوگوں نے پاکستانی پاکستانی کہہ کر آوازے کسے۔

"اب کیا کروں؟"

"کہہ دو تم انڈین ہو۔" میں بولی۔ دوسرے دن کلکتہ اور حیدرآباد کے امریکن قونصل خانوں پر ہندستانی مسلمانوں نے دھاوا بولا۔ اب اس لڑکے نے آ کر کہا۔

"اب انڈین بتانا بھی خطرے سے خالی نہیں! اب کیا کروں؟"

دور ڈزنی لینڈ کے اس خواب ناک روپہلے محل میں وہ خوب صورت الیکٹرونک گڑیاں بڑی بڑی معصوم آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسلسل وہ دلنشیں گیت گا رہی ہیں۔ IT IS A SMALL WORLD لیکن یہ بساطِ عالم صد افسوس کہ بازیچۂ اطفال ڈزنی لینڈ نہیں۔ کاش کہ ہوتی۔ بچوں کا ایک آرٹسٹ دوست جو شیشے اور چمکیلے ذروں کے موزیک کا منفرد کام تھا۔ میری آمد سے قبل اپارٹمنٹ کے لونگ روم کی دیواروں پر اپنی تصاویر چھپا گیا تھا تاکہ میں اُن کو دیکھ کر اس کے ہندستان جانے کا بندوبست کروں۔ وہ تنزک بدھسٹ نیپالی تبتی دیو مالا کی تصاویر بناتا تھا۔ اور ہندستان کے سپنے دیکھتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ سا سیٹو جا کر وہاں کسی پکچر گیلری کے ذریعہ اپنی تصاویر فروخت کرنے کی کوشش کرے اور سان فرانسسکو میں ہندستانی کونسل جنرل سے مل

لے۔" بچے فن کا کوئی قدر دان نہیں"۔ اس نے آہ بھری۔ وہ ہپی نہیں تھا۔ بالکل نارمل شخص تھا۔
"امریکہ میں واحد انسان اس تکنیک کو استعمال کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔ وہ یونیورسٹی سے آرٹ کی ڈگری لے چکا تھا۔ جس روز وہ اپنی تصاویر دیواروں سے اُتار کر ان کو ایک چھوٹے ٹرک میں رکھ کر سان فرانسسکو روانہ ہوا، مجھے بہت رنج ہوا۔ نیپال اور تبت جائے بغیر وہاں کے اسرار کی تصویریں بنانے والے اس سفید فام امریکن کے اندرونی خواب نہ جانے کیا ہوں گے۔ اس نے دو تین تصویریں ایرانی فینٹسی کی بھی بنائی تھیں۔ نیپال اور تبت اور ایران! کہ خواب اور حقیقت میں بہت فرق ہے۔

گو سارا امریکہ لوگوں نے اپنے اپنے خواب دیکھتے ہوئے تعمیر کیا تھا۔ لیکن امریکہ میں کالوں کا مسئلہ باقی ہے۔ لاس اینجلز میں 65 عیسوی میں نسلی فساد ہوئے تھے۔ ایک شام ڈاؤن ٹاؤن میں سیر گشت کرتے ہوئے عدنان میاں نے مجھ سے کہا "پھوپھی دیکھیے سامنے جو سڑک ہے یہ پورا ایک بلاک کا راستہ بے حد خطرناک ہے۔ اگر رات گئے پیدل گزریں تو کالے عموماً چاقو نکال کر پرس چھین لیتے ہیں۔" "لیکن ہم تو عین اسی سڑک پر کھڑے ہیں اور اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔" "کوئی بات نہیں ہمارے ساتھ نکل چلیے۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔" ایک دیوار کے سہارے چند کالے کھڑے تھے۔ جس طرح فلموں میں خطرناک لوگ کھڑے دکھلائے جاتے ہیں۔ ہم اُن کے پاس سے گزر گئے۔ انھوں نے ہم کو دیکھا کچھ بولے نہیں۔ بلاک سے نکل کر میری جان میں جان آئی۔ چند روز بعد پھر ہم لوگ اسی راستے سے گزرے۔ اب مجھ میں ہمت آگئی تھی۔ "گوروں نے خواہ مخواہ کالوں کو بدنام کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ اپنا پرس مضبوطی سے تھام کر عدنان اور منصور کے ساتھ پھر اس سائڈ واک پر سے گزری کالوں کا جتھا اسی جگہ پر موجود تھا۔ ان میں سے ایک نے عدنان کو مخاطب کیا۔ میری جان نکل گئی۔ یاالٰہی خیر یاالٰہی خیر۔ عدنان میاں مسکراتے ہوئے ان کے پاس گئے۔ انھوں نے سگریٹ مانگا۔ سگریٹ دینے کے بعد وہ لپک کر ہم سے آن ملے۔

"آئندہ ہرگز ہرگز رات برات اس سڑک پر سے نہ گزرنا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

''خطرناک شہر ہے۔ تم یہاں رہتے ہو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے۔''

''ہمیں معلوم ہے۔'' مطمئن جواب ملا۔

امریکہ میں کالوں کا مسئلہ یقیناً اب بھی موجود ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر وہی ہیں۔ افلاس زدہ محلوں میں وہی رہتے ہیں۔ بے روزگاروں کا سرکاری وظیفہ زیادہ تر اُن ہی کو ملتا ہے۔ گوروں کے مقابلے میں چھ فیصدی زیادہ تر کالی لڑکیاں بن بیاہی مائیں ہیں شکاگو میں 78 عیسوی میں نومولود بچوں میں 42 فیصد کو بن بیاہی ماؤں نے جنم دیا تھا اور ان میں 80 فی صد بن بیاہی مائیں کالی تھیں۔ امریکہ میں چار بچوں والا شہری کنبہ جن کی سالانہ آمدنی چھ سات سو ڈالر یعنی تقریباً چار ہزار روپے ہوا سے BELOW NATIONAL POVERTY LINE سمجھا جاتا ہے۔ کالوں کی زیادہ تعداد اس بے حد کم آمدنی والے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔

صرف دس دن یہاں گزار کر یہ جگہ بھی کتنی مانوس معلوم ہو رہی ہے۔ نمبر 119 نارتھ ریجمونٹ کی مالکن ایک بد مزاج بوڑھی عورت ہے۔ جوانی میں حسین رہی ہوگی اور کیا پتہ جوانی میں یہ بھی ایکٹرس بننے کے ارادے سے یہاں آئی ہو۔ اہلِ دنیا کی کہانی عجیب و غریب ہے مثلاً نکڑ کی دکان پر سیرین بریڈ، یعنی نان بیچنے والا لبنانی یہ یا اس کے باپ دادا کن حالات میں یہاں پہنچے ہوں گے؟ امریکہ کے تقریباً سارے شہروں میں اس کے بھائی بند مڈل ایسٹرن نان بیچنے والے موجود ہیں جس طرح یونانی اطالوی اور البانوی ریسٹوران والے اور اس جگہ بھی سارے امریکن قصبوں اور محلوں اور شہری مضافات کی طرح وہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ ایک عالی شان پبلک لائبریری۔ یورپین اور مڈل ایسٹرن ریسٹوران۔ بنک، ہال، سوپر مارکیٹیں، مکانوں کے باغوں میں MOTORIZED LAWNMOWER کی سیٹ پر بیٹھی گھاس ٹھیک کرتی بیویاں۔

''ایل اے'' تجارت اور کامیابی کا شہر ہے۔ امریکن خواب کی تعبیر؟ کرسمس آنے والی ہے۔ دوکانوں کی سجاوٹ اور چکاچوند اور گہما گہمی میں اضافہ۔ ''مانا کہ یہ CONSUMER سوسائٹی ہے مگر ہم چیزیں خریدتے خریدتے اُکتا چکے ہیں۔'' ایک روز نو عمر منصور میاں نے مجھ سے کہا۔

ایلن گنز برگ نے اپنی نظم "کیلی فورنیا کی ایک سوپر مارکیٹ" میں لکھا تھا۔ والٹ وٹ مین! سر میں درد لیے پورے چاند کو تکتا گلیوں میں سے گزرتا میں تمھارے متعلق کیا سوچ رہا ہوں! بھوکا اور تھکا ہارا، اور تصویری پیکروں کی تلاش کرتا اور تمھاری فہرست سازی کے خواب دیکھتا میں پھلوں کی ایک جگمگاتی سوپر مارکیٹ میں گیا۔ سیب، راہداریوں میں شوہروں کی بھیڑ۔ ٹروپیکل ناشپاتیوں میں بیویاں۔ ٹماٹروں میں بچے اور تم گارسیا لورکا! تم تربوزوں میں کیا کر رہے تھے؟ میں نے تم کو بھی دیکھا۔ بوڑھے لاولد اکیلے۔ والٹ وٹ مین! تم ریفریجریٹر کے گوشت اور دکانوں کے ملازم چھوکروں کو تاک رہے تھے۔ میں نے تم کو ہر ایک سے سوال کرتے سنا۔ میں تمھارے پیچھے پیچھے گھوما کیا۔ ہم گلیاروں میں ٹہلتے رہے۔ تمام منجمد نعمتوں کا مزا چکھا اور کیشئر کے پاس سے نہ گزرے۔ والٹ وٹ مین ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا ہم رات بھر تنہا سڑکوں پر گھومیں گے؟ درختوں کے سائے تاریکی بڑھا دیتے ہیں۔ مکانوں میں روشنیاں بجھ جائیں گی۔ ہم دونوں تنہا ہوں گے۔ محبت کے گمشدہ امریکہ کے خواب دیکھتے مکانوں کے باغات کی سڑکوں پر کھڑی نیلی کاروں کے سامنے سے گزرتے اپنے خاموش کاٹج واپس آ جائیں گے؟

آہ۔ پیارے بابا۔ بزرگ عزیز۔ ہمت کا سبق سکھانے والے تنہا بڑے میاں کس قسم کا امریکہ تمھارا تھا۔ جب شیرون نے اپنی کشتی کھینی اور تم ایک دھواں دھواں ساحل پر اُترے اور لیتھ کے سیاہ پانیوں میں کشتی غائب ہوتی دیکھا کیے؟" ——

ایک شام سن سیٹ بولوار پر سے گزرتے ہوئے محرم کا چاند پھر دکھلائی پڑا۔ دفعتاً خیال آیا جس تاریخ کو آسٹن میں ڈاکٹر گیل مینو نے ڈنر رکھا ہے وہ شاید نویں دسویں کی رات ہوگی۔ گھر واپس پہنچتے ہی پروگرام دیکھا اور گیل مینو کو آسٹن فون کیا' گیل مجھے بالکل خیال نہیں رہا جب تم نے آیوواسٹی فون کر کے پروگرام بنایا تھا۔ لیکچر وغیرہ تو ٹھیک ہے مگر 30 نومبر کو نویں یا دسویں تاریخ محرم کی ہوگی اور میں ڈنر میں شرکت نہ کر سکوں گی۔"

"اب کیا کروں؟" یونیورسٹی آف ٹیکسس آسٹن کے شعبہ انڈین ہسٹری کی پروفیسر گیل مینو کی آواز آئی۔ "مجھے بھی خیال نہیں رہا کہ وہ عاشورہ ہوگا۔ میں نے ایک مہینہ قبل ہی پروگرام

طے کیا ہے۔ یونیورسٹی کے سو کے قریب لوگوں کو تم سے ملوانے کے لیے دعوت نامے بھیج چکی ہوں۔ اب تو وہ دعوت ملتوی نہیں کی جاسکتی۔ مجھے یقین ہے امام حسینؓ معاف کر دیں گے۔ تم سفر میں ہو۔ ٹھیک بات ہے نا؟"

"لیکن شبِ عاشورہ کو ڈنر۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

جلال میاں بولے "پھوپھی۔ ہمارے ایک دوست کے پاس اسلامی اور انگریزی مخلوط کیلنڈر ہے۔ ہم اسے فون کر کے صحیح تاریخ پوچھتے ہیں۔" "معلوم ہوا 31 نومبر گیارہ محرم ہوگی۔ میں نے کمیل کو دوبارہ فون کیا۔" "شکر ہے۔" اُس نے کہا" روانگی سے چند گھنٹے قبل جلال الدین میاں نے گھبرا کر کہا" ارے آپ کو اب تک بیورلی ہلز تو دکھلائے ہی نہیں۔" اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ ہم لوگ گھر سے نکلے۔ بیورلی ہلز کا چکر لگایا۔ منصور میاں کے بشاش فربہ دوست جمال نے کہا" یہ پھاٹک کھلا ہوا ہے۔ اندر چلتے ہیں۔ یہ جارج ہیملٹن کا مکان ہے۔ کہہ دیں گے غلطی سے آگئے تھے۔ تفریح رہے گی۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ مگر یہاں کسی فلم اسٹار کے پھاٹک پر پہرہ نہیں جیسا ہمارے ہاں کا شیوہ ہے۔"

(امریکہ میں مکانوں کے گرد احاطے کی دیوار یا جنگلہ نہیں ہوتا کیونکہ آوارہ بکریاں یا گائیں گھاس اور پھول نہیں چریں گی) ہماری اور اُن کی نفسیات میں بہت فرق ہے۔ ہمارے ہاں احساسِ دولت اور اسٹیٹس سمبل کا شدید غلبہ ہے۔ جو اُن کے ہاں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، اگر آپ کے فلم اسٹار اپنے پھاٹکوں پر سنتری نہ کھڑے کریں تو شاید اُن کے پرستار عوام اُن کے مکانوں پر ہلّہ بول دیں۔ یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔" جلال میاں نے کہا۔

ایک جگہ" بے بی گوڑبال یوگی گرو مہاراج" کا محل ایستادہ تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں اہلِ مغرب اس قسم کے لوگوں سے کس طرح مسحور ہو جاتے ہیں۔ دہرہ دون کے ایک معمولی راوت گھرانے کے مکان سے بیورلی ہلز کیلی فورنیا کے اس محل تک کا راستہ صرف اس روحانی طور پر مضطرب اور ناآسودہ اور کنفیوزڈ مغرب کے چیلوں کی وجہ سے ہی طے ہوا۔ HUWL کے آگے اور

کیا ہے ایلین گنز برگ؟

رات کے ایک بجے گھر واپس پہنچ کر پیکنگ کی۔ ایئرپورٹ جانے کے لیے سب صبح چار بجے اُٹھ گئے۔ میں نے ٹیلی ویژن کھولا۔ ہالی ووڈ کے کسی اسٹیشن سے پرسس کھمباٹا کے ارشاداتِ عالیہ سننے کے بجائے میں نے ایک کلیسائی پروگرام لگایا۔ کسی ہسپانوی سروس میں فرشتوں کی ملکہ تقدیس کی جا رہی تھی۔ نیوترا اسنورا۔ نیوترا اسنورا۔ ہم سب کے لیے دُعا کیجیے۔ یہ دُنیا بہت رحم کے قابل جگہ ہے میں نے دل میں کہا۔

دریچے کے باہر ہالی ووڈ کی پہاڑیوں پر پَو پھٹی۔ اب ان سرخ صحراؤں کا قصہ ہے، جہاں کاؤبوائے اور ریڈ انڈین اب بھی بستے ہیں۔

کاؤبوائے اور ریڈ انڈین

ایرکرافٹ جنوبی کیلی فورنیا سے مڑ کر اب جنوبی مغربی صحراؤں اور سُرخ پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ ریاست ایری زونا کے شہر ٹوسون کا ایرپورٹ کچھ کچھ چک لالہ (راولپنڈی) ایرپورٹ معلوم ہوا۔ امریکن طیران گاہوں کے عام معیار سے بہت مختصر۔ ہوائی جہاز ایرجیٹی کی سقف گیلری سے جا لگنے کے بجائے میدان میں رُک گیا۔ سامنے کے دروازے میں بی بی لبنڈا اوننگ کھڑی نظر آئیں۔ اُن کے پیچھے مشہور انڈولوجسٹ ڈاکٹر مائیکل مہار۔ ریاست اری زونا اپنے صحرائی حسن کی وجہ سے PAINTED PESERT کہلاتی ہے اور ہسپانوی میکزیکن تہذیب کی چھاپ۔ دیوپیکر کیکٹس۔ چاروں طرف خشک پہاڑ۔ شدید گرم، یونیورسٹی کے پوئیٹری سنٹر کے مہمان خانے میں چہار دیواری والا عقبی صحن۔ عرب اندلسی مکانوں کی صدیوں پار سے آئی ہوئی آواز بازگشت۔

کھانے والے کمرے کی دیوار پر سوویت یونین کا یوجینی یونیسکو ایک پوری نظم انگریزی میں لکھ گیا تھا۔ باورچی خانے کے دریچے کے باہر زرد پھولوں والا گھنا درخت۔

شام کو یونیورسٹی پولیس کی خاتون افسر نے آ کر خیریت دریافت کی۔

صحرائی راتوں میں وسعت اور تاریکی اور سناٹے کا احساس زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صحرا کی ان تنہا ردیوں یعنی گلہ بانوں نے جو کاؤبوائے کہلائے۔ اپنی خیمہ گاہوں اور چوبی کاٹجوں کے سامنے یا الاؤ کے گرد سیاہ آسمان کے نیچے بیٹھ کر گٹار بجاتے ہوئے وہ نغمے تخلیق کیے۔

اس اندھیری رات میں کیمپس سے بہت فاصلے پر ہندی پروفیسر انوپ چنڈولا کے رولا کے روشن مکان میں اگر استعارے کو آگے لے جایا جائے تو یوں کہیے کہ میدان علم کے نئے کاؤبوائے جمع تھے اور کاؤگرلز ڈاکٹر لری فلیمنگ (آگ کا دریا پر جن کا طویل مقالہ جرنل آف

ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں شایع ہوا تھا) ایک پاکستانی پنجابی نوجوان ڈاکٹر ریاض جو یونیورسٹی کے عربی فارسی مخطوطات کے نگراں تھے اور بہت سے امریکن پروفیسر اور پروفیسر نیاں جن کو ڈاکٹر اور رابرٹ۔ روی جو بسلسلۂ ریسرچ لکھنؤ میں رہ چکے تھے۔

ذرا ایک منٹ ٹھہریے۔ مغرب کے ذخائر علوم وفنون شرقیہ۔ پوری انڈیا آفس لائبریری سارا برٹش میوزیم ہندستان کے تمام کتب خانے۔ ہندستان کے ایک سائیکل رکشا کھینچنے والے کے لیے بے معنی ہیں۔ کیونکہ اس کی کچھ مدد نہیں کرتے۔

کسی بھی مغربی کیمپس پر جا کر کبھی کسی کو یہ خیال آتا ہے کہ مثلاً علی گڑھ یا لکھنؤ، الٰہ آباد یا ڈھاکہ یا اور کوئی یونیورسٹی ٹاؤن ہندستان اور بنگلہ دیش میں ایسی جگہیں ہیں چند ہزار نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے ہم قوم مفلوک الحال مدقوق نوجوان یا بوڑھے چلچلاتی دھوپ اور لو یا کڑکڑاتے جاڑے یا برسات میں سائیکل رکشا کھینچتے ان طلبا اور ان کے استادوں کو یونیورسٹی لاتے لے جاتے ہیں۔

اب میں ڈاکٹر چنڈ ولا کے ڈرائنگ روم آپ کو واپس لیے چلتی ہوں۔ موصوف بہت ہی خلیق اور بھلے آدمی تھے۔ گڑھوال کے باشندے۔ یہاں اٹھارہ سال سے پڑھا رہے تھے۔ اُن کی بیوی بھی بہت ملنسار اور نیک خاتون تھیں۔ ہندی گیتوں میں دیوی کے تصور پر ڈاکٹریٹ کر چکی تھیں۔

شکتی کے تصور کی تجسیم مختلف ہے۔ بنیادی تصور یکساں ہے اور علامہ اقبال کو تو دیو استبداد اور جمہوریت کی نیلم پری دونوں ایک سے معلوم ہوئے تھے۔

دوسرے روز اسکول آف جرنلزم کے صدر شعبہ ڈاکٹر فورڈ کی ایک کلاس میں راقم الحروف نے انڈین جرنلزم پر لیکچر دیتے ہوئے ڈاک ہرکاروں کے ذریعے سرکاری خبر رسانی درباری وقائع نویسی کا تذکرہ کیا جو سامعین کے لیے بالکل غیر متوقع چیز تھی، کیونکہ وہ ہندستان کے اٹھارھویں صدی سے شروع ہونے والے چھاپے خانوں اور اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہ جانتے تھے۔

ایک دلچسپ بات ہے۔ عہد وسطیٰ میں عرب کاغذ سازی نے اسلامی تہذیب دنیا میں

پھیلائی تھی۔ پندرھویں صدی یورپ میں چھاپے کی ایجاد کے کچھ عرصے بعد مارٹن لوتھر کی اصلاحِ دین کی کامیاب اشاعت ہوسکی۔ آج کے ایران میں آیت اللہ خمینی کی تقریروں کے کیسٹ شاہ کی شہنشاہیت کے آخری دنوں میں ایران میں گھر گھر بجائے گئے تھے۔ اس روز دور دراز طہران میں امریکن یرغمالیوں کی قید کا شاید تیسواں دن تھا۔ لیکچر کے دوران ایک لڑکا ٹیلی پرنٹر کا کاغذی فیتہ لالاکر میز پر رکھتا جارہا تھا۔ اس پر چھپی ہر ایران کے متعلق ہر خبر کے آخر میں دو الفاظ درج تھے —— SLUG KHOMEINI اس پیمانے کے قومی غم وغصے اور تنفر کا اظہار پچھلی جنگ عظیم میں جرمنوں کے خلاف ہی کیا گیا تھا۔

تیسرے روز پروفیسر فورڈ نے بے حد تعجب سے بار بار پوچھا ''آج انھوں نے چند امریکن عورتوں کو رہا کردیا ہے۔ عورتوں کو کیوں رہا کیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

''بہت ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ شیعہ اسلام میں فاطمہؓ بنت رسولؐ خاص اہمیت کی مالک ہیں علاوہ ازیں شیعہ مذہبی قانونِ وراثت وغیرہ بھی عورتوں کے لیے زیادہ منصفانہ ہے۔ ممکن ہے اسی لیے یہ ایرانی علما عورتوں کو کچھ اہمیت دیتے ہوں۔ مگر چند ماہ بعد ماہر تعلیم خانم پارسا کو گولی سے اُڑادیا گیا۔

اس صبح (ADVANCED JOURNALISM) کی کلاس میں مَیں نے ایرانی تاریخ میں شاہ اور ملا کی آویزش، شیعہ اسلام میں امامت کے تصور وغیرہ کے متعلق ایسے طلبا کو سمجھانے کی کوشش کی جو مسئلۂ خلافت و امامت تو خیر بہت آگے کی بات ہے، اسلام ہی سے قطعاً ناواقف تھے۔

ڈاکٹر فورڈ نے بعد میں اس کلاس سے کہا کہ اس لیکچر پر مبنی ایک اسٹوری ایران پر تیار کرے۔ (ہر امریکن یونیورسٹی کے مدرسہ صحافت کی طرح اس اسکول آف جرنلزم کا بھی اپنا ضخیم روزانہ اخبار تھا جسے طلبا شائع کرتے تھے)۔

تیسرے پہر کو میں ڈاکٹر مائیکل مہار کے ساتھ لفٹ میں اوپر جارہی تھی۔ ایک فلور پر ایک صاحب پھرتی سے داخل ہوئے۔ ''میں ابھی واشنگٹن سے واپس آرہا ہوں۔ بھاگا بھاگا گیا تھا کہ

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ والوں کو ایران کے متعلق کچھ سمجھاؤں! میں نے بچشم خود تہران میں شاہ کے مخالف مظاہرین کو گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا ہے اور ان کو مارنے والے فوجی امریکن اسلحہ جات سے لیس ہوتے تھے۔ امریکہ سے اس شدید تنفر کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مگر وہاں کسی نے میری نہیں سنی۔" اتنا کہہ کر وہ صاحب ایک طور پر اسی سرعت کے ساتھ لفٹ سے نکل گئے۔

صدر شعبۂ فارسی تھے۔ ڈاکٹر مہار نے بتایا کہ شام کو شیعہ علوم شرقیہ میں "وزٹنگ انڈین میوزیم جرنلسٹ" کے لیے پارٹی کے دوران فارسی ادبیات کے وہ خوش رفتار و خوش گفتار امریکن پروفیسر پھر ملے۔ فارسی ایرانی لب و لہجے میں بولتے تھے۔ دو سال ایران میں رہ چکے تھے۔ پارٹی کے دوران ایک مصری پروفیسر سے میں نے دریافت کیا۔ مصر میں قبطیوں کو کیا بہت تنگ کیا جاتا ہے؟"

"نہیں۔ مگر وہ امریکہ آ کر یہی کہتے ہیں تا کہ ہم مذہب عیسائی امریکنوں کی ہمدردی حاصل کریں اور گرین کارڈ مل جائے۔" انھوں نے جواب دیا۔

یہ بات بھی مجھے سو فیصدی صحیح معلوم نہیں ہوئی۔ کیونکہ اسلامی انتہا پسند مصر میں آج کل قبطی گرجا پر حملے کر رہے ہیں۔

دکھی دنیا کے ان ہولناک مسائل سے بے نیاز کیمپس پر ایک جگہ گھاس پر بیٹھے ہرے کرشنا والے امریکن چھوکرے کیرتن گا رہے تھے۔ ایک لڑکا ہارمونیم بجا رہا تھا۔ ایک ڈھول اُن کے لٹریچر کی کتابوں کا انبار سامنے رکھا تھا اور ایک " JESUS FREAK " نوجوان ایک سرمنڈے امریکن سنیاسی کی ناک کے نیچے بائبل ٹھونس کر مناظرے میں مصروف تھا۔ بے حد دلچسپ بحث جاری تھی۔ ہندو یوگیوں کے پھیلائے ہوئے CULTS کے ردِعمل کے طور پر نوجوانوں میں چند عیسائی فرقے بھی نمودار ہو چکے ہیں۔ " JESUS FREAKS " ان میں سے ایک گروہ ہے۔

ایک ساڑی پوش خاتون کو قریب سے گزرتا دیکھ کر سنیاسیوں نے بڑی خوشی سے "ہرے کرشنا!" کا نعرہ لگایا۔ میں نے نہایت متانت سے اس کا جواب دیا۔ شواہوا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

اُن کے چہرے اُتر گئے۔ اور وہ پھر اپنے ڈھول بجرے اور مناظرے کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہرے کرشنا والے امریکنوں کے سامنے شِوا کا نام لو تو بہت خفا ہوتے ہیں۔'' میں نے لنڈا سے کہا ''مکمل مفاہمت دیوتاؤں میں بھی نہیں ہے۔ تو قبطیوں اور مسلمانوں اور ایرانیوں اور امریکنوں اور عربوں اور اسرائیلیوں میں کیسے ہوگی۔''

ایرپورٹ سے شہر جاتے ہوئے میں نے پروفیسر مہار سے کہا تھا کہ ''درمونٹ کے گھنے رنگ برنگے جنگلوں اور کوہساروں کے بعد یہ صحرا کس قدر مختلف ہے۔ کیا تم کو مشرقی ساحل کی کسی یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا؟''

''پن سلوینیا اور شمال میں منی سوتا میں وہاں گئی نہیں۔ وقت نہیں ملا۔ درمونٹ میرے کزن نے بلایا تھا۔ ایرٹکٹ بھیج دیا تھا۔''

پروفیسر مائیکل مہار نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ دوسرے روز اپنی کھچا کھچ بھری عمرانیات کی کلاس میں تعارف کراتے ہوئے فرمایا جب یہ بمبئی سے آیوواسٹی پہنچیں تو آیوواسٹی سے برلنگٹن تک جانے کا ایرٹکٹ پہلے سے اُن کا منتظر تھا جو ان کے کزن نے کینیڈا سے بھیجا تھا۔ یہ یگانگت اس معاشرے کی خصوصیت ہے۔ جس میں EXTENDED خاندان کو اصل خاندان میں شامل سمجھا جاتا ہے۔''

''آپ کو یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوئی لیکن ہم لوگوں کو آپ کا معاشرہ عجیب لگتا ہے جس میں ''اصل'' خاندان اور EXTENDED خاندان میں فرق کیا جاتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

مغرب میں رشتہ داروں کی اجنبیت ہم لوگوں کو ہمیشہ متحیر کرتی ہے۔ میں مغربی جرمنی میں ایک ایسے میاں بیوی کو جانتی ہوں۔ میاں ہندستانی ہیں بیوی جرمن۔ جب کبھی وہ لڑکی اپنی ماں کو اپنے بچے کے چند گھنٹے کی 'بے بی سٹنگ' کے لیے بلاتی تھی بطور معاوضہ ماں کے لیے قیمتی تحائف رکھ جاتی۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں نانیاں دادیاں خود تحائف لاکر بے تکان بے بی سٹنگ کرتی ہیں۔''

''اسی لیے جوائنٹ فیملی کے متعلق کچھ بتاؤ۔'' ڈاکٹر مہار بولے۔

جوائنٹ فیملی اور کاسٹ سسٹم وغیرہ پر آپ خود کافی لیکچر دے چکے ہوں گے لیکن میرے خیال میں آپ کے شاگرد یہ بالکل نہیں جانتے کہ یہ زندگی کس قسم کے مکانوں میں گزاری جاتی تھی۔" میں نے بلیک بورڈ پر ایک روایتی انڈو مسلم "مردانہ" اور "زنانہ" مکان کا نقشہ بنایا۔ دالان در دالان کے اندر ایک قطار میں بچھے پلنگ، مچیاں، آنگن، مشرق کی گھریلو اجتماعی زندگی میں فرد PRIVACY کا تصور تقریباً مفقود تھا۔

مرزا ابوطالب اصفہانی جو کلکتے سے 1799 عیسوی میں ڈبلن گئے تھے۔ انھوں نے ایک آئرش مکان میں قیام کر کے حیرت کے ساتھ قلمبند کیا تھا کہ ان لوگوں کے ہاں ہر کام کے لیے الگ الگ کمرے ہیں۔ کھانے کا کمرہ الگ۔ سونے کا الگ۔ بیٹھک کا الگ۔ اور باورچی خانے میں قیمہ اور پیاز کاٹنے کے لیے آہنی مشینیں اور برصغیر ہندو پاکستان و بنگلہ دیش کے روایتی مکانات آج بھی اسی طرح کے ہیں جیسے مرزا ابوطالب کے زمانے میں تھے اور جو تعجب مرزا ابوطالب کو آج سے پونے دو سو سال قبل انفرادیت پرست مغرب میں پہنچ کر ہوا تھا اسی تعجب سے امریکن طلبا مشرقی طرزِ زندگی کے متعلق سن رہے تھے۔ مغرب میں آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں بھی بغیر اطلاع یا بن بلائے بلا اجازت نہیں پہنچ سکتے لیکن اسی وجہ سے آپ کو ماہرینِ نفسیات اور سوامیوں سے اپوائنٹمنٹ لینے پڑتے ہیں۔ میں نے کہا۔

شام کو یونیورسٹی کے ایک آڈیٹوریم میں "اسلام میں عورتوں کا درجہ" پر لیکچر دیتے ہوئے محسوس ہوا کہ سامعین کے لیے اسلام بھی ایک دوسرے گرہ کی چیز تھی۔ یہ موضوع اس وقت ڈاکٹر فورڈ اور ڈاکٹر فلیمنگ نے اسلامی ممالک میں انتہاپسند تجدیدیت کی لہر کے مدنظر تجویز کیا تھا۔ "حرم۔" "چار شادیاں" "پردہ" "مسلم عورتوں کی کم تر حیثیت" وغیرہ عام تصورات اور سعودی عرب اور ایران کے موجودہ حالات کے تناظر میں ایک پیچیدہ اور نازک موضوع تھا۔ اسلام میں حقوقِ نسواں اور اسلامی تاریخ میں عورتوں کے اہم رول وغیرہ کے متعلق بے حد وضاحتی اور تقریباً تبلیغی لیکچر کے بعد حسبِ معمول آیت اللہ خمینی کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ۔

آپ کہتی ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو یہ سب حقوق دیے ہیں۔ مگر ملا خمینی نے تو پردے کا

حکم صادر کیا ہے۔ آپ کہتی ہیں اس روایتی پردے کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ ورنہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کھلے منہ حج کرنے کا حکم نہ ہوتا۔ اور آپ نے کہا اسلام میں چرچ اور CLERGY نہیں ہے۔ تو پھر یہ ایران کے آیت اللہ لوگ کون ہیں؟'' امریکنوں نے سوال کیا۔

سامعین میں ایک نہایت جوشیلے پاکستانی مسلمان بھی تھے۔ انھوں نے میری تقریر پر نہایت کٹر ملاپن کے اعتراضات کیے۔

جس وقت میں نے کہا۔ مغربی عورتوں کو شوہر سے علاحدہ اپنی جائیداد رکھنے کا حق اب جا کر ملا ہے۔ قرآن نے یہ حق چودہ سو برس قبل دیا تھا وغیرہ۔ اس وقت سامعین ایک امریکن لڑکی ''بالکل ٹھیک''۔ ''بالکل درست'' کہے جا رہی تھی۔ شہر ٹوسون کے روزنامے کے دو رپورٹر اگلی صف میں بیٹھے تھے۔ ان کے سوالات سے نپٹنے کے بعد ہال سے باہر نکلنے لگی تو وہ لڑکی سامنے آئی اور مصافحے کے بعد گرم جوشی سے بولی ''السلام علیکم''! میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ قطعی شرعی لباس۔ پیشانی تک اسکارف لمبی آستین۔ ٹخنوں تک لمبا فراک۔ ''مرحبا۔ اسلام آج کل اتنا بدنام ہو رہا ہے۔ آپ نے اس کی صحیح صورت پیش کی۔'' اس شرعی امریکن لڑکی نے کہا۔

''کیا تم اسلامی تاریخ کی طالب علم ہو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''الحمدللہ میں خود مسلمان ہوں۔ وہابی مسلمان۔''

لیجیے صاحب۔ اب تک امریکن ''ہندو'' صافے اور کرپانیں باندھے امریکن ''سکھ'' لڑکے لڑکیاں نظر آتے تھے۔ اب تبلیغی جماعت کی کوشش سے اکا دکا طالب علم مسلمان بھی ہونے لگے اور وہ بھی FUNDAMENTALIST۔ کیونکہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے والوں کو اس مذہب کا انتہا پسند روپ ہی بھاتا ہے۔ ہرے کرشنا والے مغربی لوگ ہندوستان کے پیدائشی سناتن دھرم ہندوؤں سے کہیں زیادہ کٹر ہیں یہ CONVERT کی نفسیات ہے۔

دوسری صبح شہر کے اخبارات میں مفصل دو کالم کی رپورٹیں چھپیں۔ ''موزلم جرنلسٹ کا کہنا ہے''۔ ایران کی صورت حال کے متعلق موزلم جرنلسٹ کا خیال ہے کہ یہ ایران کی انتقامی کارروائی ہے کیونکہ سی آئی اے کی مدد سے شاہ—— وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ امریکہ کو چاہیے کہ ایران کا یہ

مطالبہ کہ شاہ کے جرائم کی تحقیقات کی جائے منظور کر لے۔" وغیرہ وغیرہ لفظ "انڈین" وہاں عموماً ان قبائل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کو ہم ریڈ انڈین کہتے ہیں۔

ریاست ارِی زونا نواہو اور ہوپی انڈین قبائل کا وطن ہے۔ کیلی فورنیا کے ساتھ ارِی زونا اور ٹیکس بھی میکزیکو نے جنگ میں ہار کر امریکہ کو دے دیے تھے لیکن "سرخ ہندوستانی" قبائل سے گورے مہاجروں کی لڑائیاں جاری ہیں۔ اپاش قبیلے سے بیس سالہ جنگ 1886 عیسوی میں جیتی گئی تھی۔ گایوں کے ریوڑ پالنے والے RANCHERS نے گلوں کی حفاظت کے لیے کاؤبوائے نوکر رکھے۔ امریکن رومانس کی تخلیق، سرخ ہندوستانیوں اور ڈاکوؤں کے علاوہ خود بھیڑ پالنے والوں، گائے پالنے والوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔ مزید کاؤبوائے رومانس۔

"کوئی ریڈ انڈین بستی دکھلایئے۔" میں نے پروفیسر مہار سے کہا۔

اس روز بڑی دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایولین وردی اور لنڈا کے ساتھ ڈاکٹر مہار کی کار میں صحرا کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سُرخ مرچیں نظر آئیں۔ جو دھوپ میں سکھائی جا رہی تھیں۔ مرچیں میکزیکن کھانوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

میکزیکو کی سرحد پار کر کے ہر سال تقریباً تیس لاکھ میکزیکن اور باقی جنوبی امریکہ کے لوگ غیر قانونی طور پر براہِ ٹیکسس امریکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ پریشان حال تیسری دنیا امریکہ کی سرحد سے شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن خود امریکہ کے اندر ہر شخص مصروفِ عیش نہیں ہے۔

چند خستہ حال مکان دکھائی دیے جن کے سامنے کھٹارا کاریں کھڑی تھیں۔ چند ریڈ انڈین ان کھٹارا کاروں کے انجنوں پر چڑھے کاہلی سے تمباکو پی رہے تھے۔ کچھ بہت ہندوستانی سا منظر تھا۔ سستی اور بے پرواہی۔

"چراغ تلے اندھیرا۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔

"یہ لوگ کاہل ہیں اور اپنا طرزِ زندگی بدلنا نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر مہار نے کہا۔ "لیکن اب پچھلے دس سال سے اُن کے ہاں بھی سیاسی شعور پیدا ہو چلا ہے۔"

"کمال ہے۔ کالوں نے لڑ بھڑ کر، دکھ اُٹھا کر، قربانیاں دے کر امریکن کلچر میں اپنا اہم

مقام حاصل کرلیا۔ موسیقی، ادب، تعلیم، سیاست ہر جگہ مگر ملک کے یہ باشندے اور اُن کا یہ حال، اُن کی اپنی یونیورسٹیاں اور اپنی موسیقی اور اپنے اخبار ہونے چاہئیں تھے۔ آخر وجہ کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''بہت سے انڈین ملک کی سفید فام آبادی میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت کھو چکے ہیں اور اُن کی اکثریت پس ماندہ رہ کر اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

بستی کا انڈین کیرنڈی سنٹر سنسان پڑا تھا۔ احاطے کی دیوار پر ایک انڈین لڑکا بڑی چابکدستی سے ایک قبائلی رقص کا فریسکو بنانے میں مصروف تھا۔ سوالات کا مختصر جواب دیتا رہا۔ نہ مسکرایا نہ خود سے کوئی بات کی۔ سنٹر سے نکل کر ہم لوگ شاہراہ کے کنارے ایک میکزیکن ریستوران میں گئے۔ میکزیکن انڈین مخلوط النسل لوگ سرخی مائل رنگت، کھڑا نقشہ، کچھ ہریانہ کے جاٹ سے معلوم ہوتے تھے۔ (ریڈ انڈین قبائل دراصل منگولین لوگ تھے جو ہزار سال قبل آبنائے بیرنگ عبور کر کے سائبیریا سے امریکہ پہنچے تھے)۔ سولھویں صدی عیسوی میں ہسپانوی اور پرتگالی فاتحین نے مایہ اور ازبک وغیرہ پوری تہذیبیں اُجاڑ ڈالیں مگر جب باقی ماندہ (انڈین) رومن کیتھولک ہو گئے تو ہر جگہ اور جنوبی امریکہ اور ادھر گوا اور فلپائن میں مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کرتے رہے۔ انگریز اور دوسرے شمالی یورپین اور پروٹسٹنٹ فاتحین کے برعکس ان لوگوں میں نسلی تعصب نہیں تھا اور میرے خیال میں یہ اُن کے اندلسی عرب ورثے کا لاشعوری اثر تھا۔ یعنی یہ کہ جب مفتوح ذمی یا کافر نے اسلام قبول کیا تو بلا تخصیص رنگ و نسل امت میں شامل کر لیا گیا۔

سیاہ چشم میکزیکن ویٹرس نے مرچوں والا کھانا پیش کیا۔ ایک ریڈ انڈین لڑکی اپنا قومی لباس پہنے بال میں ایک پر لگائے ریستوران سے نکلی اور اپنی کار ڈرائیو کرتی روانہ ہو گئی۔

اور آگے ریگستان کے وسط میں ایک سفید رنگ کا ہسپانوی کیتھڈرین تیز نیلے آسمان کے مقابل میں ایستادہ تھا۔ سامنے دیو قامت کیکٹس۔ اندر مذہبی تصاویر اور شمعوں کے ہجوم میں ایک حنوط شدہ نوجوان راہب شیشے کے تابوت میں خوابیدہ لاش کے سیاہ لبادے پر پنوں کے ذریعے بے شمار تصاویر ٹانک دی گئی تھیں۔

زیادہ تر تصویریں نوجوان فوجی سپاہیوں کی تھیں۔ جو اُن کی ماؤں نے ان کی منتیں مان کر

اس مقدس پادری کے کفن پر ٹانک دی تھیں۔

جب ہم لوگ ٹوسون واپس آ رہے تھے۔ وہ ریڈ انڈین اسی طرح اپنی کاروں کے انجنوں پر چپ چاپ بیٹھے تمبا کو پیتے نظر آئے۔ کالوں کی مانند یہ لوگ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟

''اب ایک کاؤبوائے اسٹور بھی دیکھی چلو شاید وہاں کاؤبوائے بھی نظر آجائے۔'' ڈاکٹر مہار نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''اس دکان میں گھوڑوں کی مرصع زین چمڑے کے ملبوسات، ٹوپیاں، ایڑی والے مرصع جوتے، مرصع پیٹیاں کنار۔ غرض یہ کہ پورا کاؤبوائے ساز وسامان بک رہا تھا۔ برآمدے کے باہر گھوڑا باندھنے کی کھونٹیں بھی موجود تھیں۔ جب گلہ بانی کمپیوٹر اور راؤٹر اور REMOTE CONTROL سے شروع ہوگی۔ کاؤبوائے بھی معلوم ہو جائیں گے۔

رات کو لنڈا کے ہاں دعوت میں اُن کے ماہر موسمیات شوہر نے نہایت نفیس کھانا تیار کیا تھا۔ معہ مرچوں والی سیکز بیکن مسور کی دال، باقی مہمان ایک ایک ڈش ساتھ لائے تھے۔ ڈاکٹر ریاض کے بیوی بچے چند روز بعد لاہور جانے والے تھے۔ ڈاکٹر اور مسز چنڈولہ کچھ عرصہ قبل ہندستان ہو آئے تھے۔ وہی معاملہ یہاں ہر طرح کی آسائش تھی۔ مگر دل وطن میں اٹکا تھا۔

لنڈا کے اونچی چھتوں والے بنگلے میں برطانوی ہند کی چھاؤنیوں کے بنگلے کی جھلک موجود تھی۔ دشتِ اری زونا کے پرانے کیمپ ماحول اور گرم موسم نے یہ اسٹائل تخلیق کیا ہوگا۔

لنڈا اُردو جدیدیوں کے بارے میں مقالہ لکھنے میں مصروف تھی۔ ''یاد رکھو اگر تمھارے بجائے تیسری دُنیا کی کوئی لڑکی، الجیرین، یا تھائی لینڈ یا انڈونیزیا سے یا کوئی کالی امریکن ہی یہ مقالہ لکھنے ہندستان و پاکستان آتی۔ اُردو حلقوں میں اسے اس قدر اہمیت نہ دی جاتی لیکن تم سفید فام ہو۔ اور امریکن ہو ہمارا COLONIAL HANGOVER ابھی زائل نہیں ہوا ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ایک مرتبہ رالف رسل نے مجھ سے اظہار خیال کیا تھا کہ لوگ ان کو اس لیے زیادہ قابل ذکر سمجھتے ہیں کہ ایک انگریز اُردو پڑھتا پڑھاتا ہے۔

اور اب دس گیلن وزنی ہیٹ پہنے تیل کے کروڑ پتیوں کے دیس ٹیکس جارہی ہوں۔

تنہا ستارہ

ساری دنیا کے بچے اور قبل از بلوغ سطح کے ذہن کے لوگ ہالی ووڈ کے HORSE OPERAY پر عاشق ہیں۔ امریکن ''وائلڈ ویسٹ'' کے یہ کردار سر شہسوار دستے یعنی RANGERS شیرف۔ بہادر اور نیک دل اور اصول پرست کاؤ بوائے بدطینت اور بے رحم آؤٹ لا اور مجرم اور ڈاکو یہ گویا ایک —— MORALITY PLAY MODERN کے علامتی کردار تھے۔ مجھے ایک اندوہناک کاؤ بوائے گیت یاد آیا۔

امپرنٹ کے زمانۂ ادارت میں بعنوان GUN IS A GUN IS A GUN رابرٹ کینیڈی کے قتل کے بعد امریکہ میں بندوقوں اور پستولوں کی فراوانی پر ایک مضمون لکھا تھا (صدر کینیڈی بھی ٹیکسس کے شہر ڈیلاس میں مارے گئے تھے)۔

تو اس کاؤ بوائے گیت سے میں نے وہ مضمون امپرنٹ میں شروع کیا تھا اور وہ گیت یوں تھا۔

''صبح منہ اندھیرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر RANOG پر گیا
وہاں مجھے سفید لینن میں ملبوس کوئلے جیسی سیاہ آنکھوں اور لہراتے بالوں
والا ایک نوعمر کاؤ بوائے دکھائی پڑا۔ اپنے دوست اور عزیز میں بوسٹن میں
چھوڑ آیا۔ میرے ماں باپ کو پتہ نہیں میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں
پہلے ٹیکسس گیا اور ایک RANOG پر نوکری کر لی۔ میرے سینے پر گولی
آن لگی اور موت میرا مقدر ہے۔''

پروفیسر آرنلڈ ٹوئینبی کا کہنا ہے ''شمالی امریکن کاؤ بوائے، جنوبی امریکن GAUCGOS (امریکن، یورپین، ریڈ انڈین، مخلوط النسل، شہسوار گلے بان) اور آسٹریلیا کے ریوڑ ہانکنے والوں نے از منہ رفتہ کے سیتھین، تاتاری اور عرب شہسواروں کی طرح دنیا کو مسحور کیا۔ امریکن اور

آسٹریلین STEPPES (وسیع چراگاہوں کی امکانی قوت اتنی زبردست تھی کہ انھوں نے زرعی اور صنعتی تمدن کے پروردہ لوگوں کو کم از کم ایک نسل کے لیے خانہ بدوشوں میں تبدیل کر دیا جبکہ ان خطوں کے اصل باشندوں نے گلہ بانی کی بجائے محض PASTORALPRE سطح پر شکار کر کے جانور مارنے اور کھانے کے طرزِ زندگی پر اکتفا کیا۔ اور اس سے آگے ترقی نہ کی۔

ٹیکس LONE STAR STATE کہلاتی ہے اور LONE RANGER ایک رومانی شہسوار کردار ہے۔

چنانچہ ٹیکساس پہنچ کر آپ ہوپ ایلونگ کیسڈی اور رائے روجرز وغیرہم کے پس منظر کی جھلکیاں دیکھنے کی اُمید تو رکھ سکتے ہیں مگر محمدی بیگم مرحومہ اڈیٹر تہذیب نسواں کی حیات اُن کی بہن کی ہاتھ کی ایک کاپی بک پر لکھی ذرا غیر متوقع چیز ہے۔

جب ڈاکٹر گیسل مینو نے مجھے آیووا سٹی فون کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ ہندستانی مسلم عورتوں کی اوّلین تعلیمی تحریک پر کام کر رہی ہے اور اس سلسلے میں محمدی بیگم، عبداللہ بیگم، نذر سجاد حیدر، وغیرہ پر کافی ریسرچ کر چکی ہے۔ گیلی کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر ملنسار اور دلچسپ لڑکی ہے۔ یہ الفاظ دیگر چنڈوخانے کی ایک رُکن۔ (اس رکنیت کو آپ محض اپنی چھٹی حس کے ذریعے ہی پہچان سکتے ہیں)۔

ڈسون سے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد ٹیکساس کا شہر آسٹن جس کے ایرپورٹ پر منتظر گیل مینو ویسی ہی نکلی جیسی توقع تھی۔

"گیل یونیورسٹی آف ٹیکساس ایٹ آسٹن میں انڈین ہسٹری پڑھاتی تھی۔ اور علی برادران اور خلافت تحریک پر اس کی کتاب نیویارک سے چھپنے والی تھی (اب شائع ہو چکی ہے)

اری زونا محض رہا تھا۔ یہاں شدید سردی تھی۔ آسٹن خوب صورت شہر تھا۔ موسم خزاں کے زرد عنابی درختوں سے معمور کیمپس کے نزدیک ایک خیاباں کے کنارے جو لارل لین کہلاتا تھا۔ گیل کا مکان سنہرے درختوں میں پوشیدہ تھا۔ دوسری منزل پر مہمان کمرے کی دیواروں پر ایک انگریز نما بزرگ کی تصویریں آویزاں تھیں۔

''ہاں۔ بوب کے دادا انگریز تھے۔ امریکہ آ گئے تھے۔ میں خود فرانسیسی نژاد ہوں۔ بوب یونیورسٹی میں امریکن ہسٹری پڑھاتا ہے۔''

''گیل چار سال لکھنؤ میں رہ چکی تھی جہاں اس کا پہلا شوہر بسلسلہ CARE تعینات تھا۔ اس کا خورد سال بچہ نام لکھنؤ میں خدا کو پیارا ہوا تھا۔ اور وہ پلٹتے ہوئے ایک بچی متبنّی کر لائی تھی۔ اس کا نام لیلیٰ رکھا تھا اور اسے شہزادیوں کی طرح پال رہی تھی۔ میں شروع شروع میں اس سے اُردو بولی لیکن وہ یہاں رہ کر خود ہی اُردو بھولتی جا رہی ہے۔''

گیل نے بوب کے انگریز دادا کی تصویر کے نیچے چمڑے کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا: باہر زرد پھولوں والے درخت پت جھڑ کی ہواؤں میں سائیں سائیں کر رہے تھے۔ آج سے ساٹھ ستر سال بعد لیلیٰ کی پوتیاں کہیں گی۔ ہماری دادی ہندستان سے آئی تھیں (اگر دنیا اس وقت تک باقی رہی)۔

''ہندستان میں بہت دنوں تک کئی مرتبہ تمہارے تعاقب کی کوشش کی، مگر ملنے کا موقع نہ ملا۔ میں اپنی کتابوں کے سلسلے میں بھی بہت سے سوالات کرنا چاہتی تھی۔ عصمت اور تہذیب نسواں کے تو میں نے سارے فائل کھنگال ڈالے۔'' گیل نے کہا۔

گیل اور بوب کا کتب خانہ بہت وسیع اور گیل کا اُردو ذخیرہ کتب قابل ذکر تھا۔ اس نے مجھے محمدی بیگم کی سوانح زندگی کا غیر مطبوعہ قلمی نسخہ دکھایا جو ان مرحومہ کی بڑی بہن نے لکھا تھا اور جو وہ میرٹھ یا لاہور جانے کہاں سے کھود لائی تھی۔

شام کو اپنے باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہوئے اس نے کہا ''پچھلی صدی کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ رجعت پسند اور تنگ نظر تھے۔ اس وجہ سے اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ میرے خیال میں یہ تجزیہ صحیح نہیں۔ ذرا ان بزرگوں کے ڈیلیما پر غور کرو۔ ایک ایسی قوم جس کی اپنی کوئی زبردست تعلیمی روایات نہ ہوں۔ بہ آسانی مغربی اثر قبول کر لیتی ہے لیکن ہندی مسلمانوں کی اپنی درسی اور تہذیبی بے حد اعلیٰ اور درخشندہ روایات تھیں۔ اور اب اُن کو احساس دلایا جا رہا تھا کہ وہ روایات ناکارہ اور فرسودہ

ہوگئیں۔ مسلمان عورتیں خود ایک رچے ہوئے تمدن کی خالق اور پروردہ تھیں۔ برطانوی کولونیل رنگ میں رنگ جانا اُن کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ ان کا اپنا تہذیبی تفاخر اور برتری کا احساس اور غروران کے اس مدافعانہ رویے میں شامل تھا۔"

"ایک امپریل قوم جو یک لخت غلام قوم بن گئی۔" میں نے کہا۔ "اس طرح کی صورت حال میں دو رویے ہو سکتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں کا ردعمل کہ اتاترک نے اسے مکمل مغربی چولا پہنا دیا۔"

پروفیسر گیل مینوانڈو مسلم تہذیب اور تاریخ کی استاد تھی۔ اگلے روز یونیورسٹی کے ایک طعام خانے میں راقم الحروف کے لیے جو لنچ دیا گیا۔ اس کے میزبان اطالوی نژاد جواں سال ماہر اقتصادیات پروفیسر جنوزی صوبہ بہار کے زرعی مسائل کے ماہر نکلے۔ (اوران کے نفیس عالی شان دفتر کی دیواروں پر بہار کے ننگے بھوکے ہل کندھے پر اُٹھائے کسانوں کی تصویر تکلیف دہ) سنٹر فور ایشین اسٹڈیز کے ڈاکٹر بھرت بھٹ (جغرافیہ)۔ جیمز برو (اینتھروپولوجی) (راجہ راؤ (فلسفہ) ہرمین وان اولفن اور جنل اور افریقی ادبیات ولسانیات۔ گاکری۔ اسپواک۔ (انگریزی ادب) اور "پبلک لیکچرز کے دفتر" کی ایک خاتون لنچ کے مہمانوں میں شامل تھیں۔ ناولسٹ راجہ راؤ عرصے سے ہندو فلسفہ پڑھا رہے تھے اور عنقریب ریٹائر ہونے والے تھے۔ بھرت بھائی گجراتی تھے اور گاکری انتہائی ذہین بنگالین جو اپنے امریکن یہودی مصنف شوہر سے طلاق لے چکی تھی۔ اس کے سابق خاوند نے طلاق کے بعد اس کے متعلق ناول بعنوان THE BRIDE WORE COLD لکھا تھا جو شائع ہو چکا تھا۔ گاکری فل پروفیسر تھی اور بے حد بائیں بازو کی وچار دھارا سے تعلق رکھتی تھی۔

ڈچ نژاد پروفیسر وان الفن نے لسانیات کی تجربہ گاہ کے ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں ایک گھنٹے کا انٹرویو بزبان اُردو ریڈیو ٹیپ کروایا۔

"مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہوگئیں" والا شعر گیل نے فریم کروا کر اپنے دفتر کے کمرے میں لگا رکھا تھا۔ قریب اس کے مرحوم بچے کی تصویر رکھی تھی۔ دریچے کے باہر کیمپس کے

درخت سرد ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ صحت مند طلبا کے خوش پوش غول کسی جگہ کوئی دبلا پتلا لاغر کمزور انسان نظر نہ آیا۔ اور ہر کیمپس پر اتنے ہجوم کے باوجود خاموشی اور سکون۔ کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرتا۔ مصائب اور پریشان حالی کے پیدا کردہ عصابی تناؤ اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے بھی ہم لوگ ہر جگہ چیختے چلاتے پھرتے ہیں۔ اونچی آواز میں بولنا قومی خصوصیت بھی ہے۔

دوسرے روز یونیورسٹی میں "جدید ہندوستان کی ہندو اور مسلم عورت" پر لیکچر دینے سے قبل گیل نے تعارف کرواتے ہوئے نذر سجاد حیدر اور اُن کی پھوپھی اکبری بیگم مصنفہ گودڑ کا لال کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکچر کے دوران مجھے گودڑ کے لال کی ثریا یاد آ گئی۔ مصنفہ نے اسے لاہور میڈیکل کالج پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔ جو گویا ہندوستانی عورت کی بغاوت اور آزادی کی علامت تھی۔ مگر نقاب پہن کر ڈاکٹری کی تعلیم ممکن نہ تھی۔ وہ بے حد حسین تھی تا کہ لوگ اس پر نظر نہ ڈالیں وہ چہرے پر سیاہ پوڈر مل کر کلاس میں جاتی تھی۔ امریکن سامعین کو یہ قصہ انوکھا لگے گا۔ مگر آج سے ستر سال پہلے ایک پردہ نشین مصنفہ نے جو تحقیق اور اپنا آئیڈیل کردار پیش کیا تھا" وہ آج بھی ایک حد تک مشرقی عورت کا مسئلہ ہے۔ روایت کی پابندی اور روایت سے انحراف۔" بعد میں لامحالہ مسز گاندھی کے متعلق متوقع سوالات۔

گجراتی نژاد امریکن بھرت بھائی نے دریافت کیا۔ آپ نے کہا تھا کہ ہندوستانی ہاؤس وائف بڑی خود اعتمادی سے مشترکہ خاندان کا انتظام کرتی آئی ہے۔ تو کیا مسز گاندھی کی حکومت ایک ایسا سنڈروم ہے کہ۔

"کوئی سنڈروم نہیں ہے۔ آپ امریکن لوگ نظریہ سازی کے اتنے شوقین ہیں کہ آپ نے فوراً سے پیشتر اس کی بھی ایک تھیوری بنالی۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ایک دیونی سی میم میرے نزدیک آئی۔ اور اپنا تعارف کرایا۔ وہ اسرائیل کی کسی یونیورسٹی کی لائبریرین تھی اور امریکہ آئی ہوئی تھی۔

"آپ نے برطانوی ہند کی سیاسی شعور والی عورتوں میں ایک مغلیہ گوہر جان کا ذکر کیا کہ اس نے وائسرائے کو ڈیفائی کیا تھا اور یہ کہ وہ یہودی تھی۔"

"ہاں آرمنی یہودی۔"

"اگر وہ یہودی تھی تو آرمنی کیسے ہوئی؟ محض یہودی کہیے۔ ایسے یہودی جو آرمینیا میں رہتے تھے۔"

دیکھیے گوہر جان کی یہودی قومیت یا اس کی یہودیت کی شناخت آپ کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں، میرے لیے وہ ایک ایسی خاتون تھی جس کے اجداد آرمینیا سے کلکتہ آ گئے تھے اور بس۔"

گراں ڈیل اسرائیلی خاتون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بھنا کر دوسری طرف کو ٹہل گئی۔ اب ایک اداس صورت لڑکی نے ذرا نیچی آواز میں کہا۔

"میں ایرانی ہوں۔ میں اور میرا شوہر یہاں پڑھتے ہیں۔"

وہ خاموش اور سہمی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل کی بات تھی کہ ایرانی طلبا اپنے پیسے کے بل بوتے پر سارے مغرب میں دندناتے پھرتے تھے اور کافی بددماغ مشہور تھے۔ اب وہ امریکہ میں ہر جگہ گھبائے ہوئے تھے۔ سچ ہے ہوا۔ کبھی کے دن بڑے۔ کبھی کی راتیں۔

تیسرے روز ربعہ راؤ نے لنچ پر بلایا تھا۔ کیپل کے گھر سے نکلتے کلب جاتے ہوئے راستے میں کیمپس کا بازار پڑتا تھا۔ ایک چوراہے پر ہاٹ لگا ہوا تھا۔ بوہمن لڑکے کان میں بندے پہنے ہوئے مختلف دست کاریاں فروخت کر رہے تھے۔ چند نوجوان گٹار بجا کر اپنی موسیقی بیچنے میں مصروف تھے۔ پرانی تصویریں اور نیکسس کی ریڈ انڈین گھریلو مصنوعات بک رہی تھیں۔ بڑا پُرسکون اور سہانا دن تھا۔ ایک آدمی اپنے بازی گر کتے کا تماشا دکھا رہا تھا۔ پُرامن بے فکری کے دن اور اس طرح کے خوب صورت کیمپوں سے نکل نکل کر لاکھوں کی تعداد میں ایسے خوش باش نوجوان میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ محض ویت نام اور کوریا نہیں۔ دوسری جنگ عظیم اور اس سے پہلے، اور اس سے پہلے۔ "ایک گولی میرے سینے میں آن لگی اور موت میرا مقدر ہے۔"

ساری دنیا کے نوجوانوں کا گیت ہے۔ ساری "پہلی" "دوسری" اور "تیسری دُنیا" کے نوجوانوں کا ترانہ جن کو جنگ کا ایندھن بنایا جاتا ہے۔ یہ دُنیا ویدانتی ربعہ راؤ کی رتی نہیں جسے

سانپ سمجھ لیا گیا۔ سچ مچ سانپ ہے۔

آراستہ و پیراستہ یونیورسٹی کی طرح فیکلٹی والوں کا طعام خانہ بھی ہیلٹن ہوٹل معلوم ہو رہا تھا۔

"ہماری درسگاہیں دراصل اتنی دولت مند اس لیے ہیں امریکن صنعتوں کی طرف سے بھی اُن کو بھاری امداد ملتی ہے۔ یہ صنعتیں اپنے ٹیکنولوجسٹ یہاں ٹرین کرتی ہیں۔" گیل نے کہا "اور ٹیکسس تو بہرحال تیل کی وجہ سے بے انتہا دولت مند ریاست ہے۔"

شام کو بوب گیل اور میں شہر کے ایک ریسٹوران میں کھانا کھانے گئے۔ پارک میں اَن گنت کاریں۔ اندر بے فکر چہرے۔ اچانک میں نے گیل سے کہا۔

"یہ لوگ یا کسی بھی امریکن چھوٹے شہر یا بڑے شہر کے لوگ تیسری دُنیا کی درماندگی کو سمجھ سکتے ہیں؟"

"نہیں" گیل نے افسردگی سے جواب دیا۔

آخری شام گیل کے ہاں ڈنر تھا جسے منسوخ کرنے کے لیے میں نے اسے لاس انجلز سے فون کیا تھا لیکن جو محرم کی گیارھویں تاریخ پڑنے کی وجہ سے منسوخ نہ ہوا تھا۔ گیل بیگم نے اس شام زرد غرارے کا جوڑا (جو لکھنؤ میں سلوایا تھا) اور جھمکے پہنے اور بریانی پکائی۔ نچلی منزل میں اس کا وسیع ایوان نشست اور باورچی خانہ اور کتب خانہ دانش گاہ کے دانشوروں سے بھر گیا۔ کاٹری کہنے لگی اتنے کم وقت میں تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ علی گڑھ تحریک سے متعلق کتابوں سے بھری ایک الماری کے سامنے ایک بزرگ امریکن ماہر اسلامیات کسی سے ایران کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے "اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ ہم لوگوں کی کبھی نہیں سنتا۔"

یہ پرانا مسئلہ ہے۔ اہلِ سیاست نے اہلِ دانش کی بات کب سُنی ہے۔

ایک امریکن خاتون ایلزبتھ فرینا اور ایک عرب خاتون باسما قطان بزرگان نے ایک ضخیم کتاب "مڈل ایسٹرن ویمن اسپیک رننا المسلمات فی الشرق الاوسط مجید ثن۔ زنان مسلمان خاور میانہ سخن می گویند۔" جو انھوں نے مل کر ایڈٹ کی تھی۔ مجھے دی۔ یہ کتاب یونیورسٹی آف ٹیکسس

پریس آسٹن اور لندن (برطانیہ) سے شائع ہوئی تھی اور اس میں حضرت عائشہؓ حضرت رابعہ بصریؒ میڈیول SERPENT AND THE ROPE راجہ راؤ کا مشہور انگریزی ناول ہے۔

افغان شاعرہ رابعہ بلخی، اُم کلثوم، خالدہ ادیب خانم مصری لیڈی ہدیٰ شراوی، جدید عراقی شاعرہ نازک الملائکہ، الجیرین مجاہدہ جمیلہ بو حیرد، جدید لبنانی ناولسٹ لیلیٰ بعلبکی، ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد وغیرہ کے متعلق مضامین اور اُن کی چیدہ تخلیقات شامل تھیں۔ ان ہی جیسی خواتین میں سے ایک جدید ایرانی ماہرِ تعلیم ڈاکٹر پارسا کو چند ماہ بعد اُن کے اپنے ہم وطنوں کا فائرنگ اسکواڈ گولی سے اُڑا دینے والا تھا۔ ہیہات۔ ہیہات۔ اُن کی پیش رو زرّیں تاج طاہرہ کو بھی تو گلا گھونٹ کر اندھے کنوئیں میں گرا دیا گیا تھا۔

اے پیر حرم رسم و رہ۔ شاہنشہی چھوڑ۔ گیل کی میز پر محمدی بیگم مرحومہ کی سوانح عمری سامنے رکھی تھی۔ صد شکر کہ انھوں نے اور اُن کی نسل کی مصلح، حریت نسواں کی علم بردار خواتین نے کولونیل برطانوی عہد میں جنم لیا۔ مطلق العنانی کے دور میں پیدا ہوئی ہوتیں تو شاید وہ بھی ماری جاتیں۔

باہر سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ گیل کے سیاہ بلے نے کتب خانے کے دریچے میں سے جھانکا اور بے بس انسانوں کو اپنے مسائل کے ناکام حل تلاش کرتے دیکھ کر اُکتا کر پھر باغ میں کود گیا۔

ڈکسی مون

یونیورسٹی آف آیووا میں، بید مجنوں سے گھری آیووا ندی کے کنارے ایستادہ، "انگلش اینڈ فلاسفی بلڈنگ" کی چوتھی منزل پر انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایڈون گنزر میرے سفر کے انتظامات جنات کی طرح منٹوں میں کر دیا کرتا تھا۔ کئی ہفتے قبل اس نے مجھے اطلاع دی تھی۔ "تم نیواورلینز بطور سیاح جا رہی ہو اور وہاں کسی کو جانتی نہیں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تم وہاں کسی ہوٹل میں قیام کرو۔ میں نے ایک سنگ تراش خاتون مسز شیری سیلون کے ہاں تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا ہے۔"

آسٹن سے روانگی کی صبح گیل نے مجھ سے کہا۔ "نیواورلینز بہت بڑا ایرپورٹ ہے۔ وہاں کے جم غفیر میں تم حسب معمول اپنی سلیکس میں ملبوس اترو گی تو ممکن ہے وہ خاتون تم کو میکزیکن یا ایشیائی نژاد امریکن سمجھ کر پہچان نہ سکے۔"

میں نے گیل کے باورچی خانے سے مسز سیلون کو فون کیا۔ ایک نہایت دوستانہ آواز سنائی دی۔ (نیویارک سے لاس اینجلز بھی بات کیجیے تو آواز اتنی صاف سنائی دیتی ہے جیسے مخاطب سامنے موجود ہے) میں نے کہا۔

"میں ٹیکسس ایرلائنز کی فلاں فلائٹ سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر پہنچ رہی ہوں۔ گلابی رنگ کا طویل اسکارف اور نیلا اورینٹل ڈریس۔"

"یہ اورینٹل ڈریس کیا چیز ہوتی ہے؟" گیل نے ننھی لیلیٰ کو ناشتہ کراتے ہوئے سر اٹھا کر پوچھا۔

"امریکن ساؤتھ تم باقی امریکنوں کے لیے بھی ایک مختلف دنیا ہے۔ ایڈون نے بتایا تھا کہ یہ ایک خالص سدرن فیملی ہے۔ DEEP SOUTH کے لوگوں کے شمال کے YANKEES

ہی خاصے اجنبی ہیں۔ یہ مسز سیون گلابی دوپٹہ اور نیلی شلوار قمیض کیا سمجھ پاتی؟"

"کیا پتہ وہ غرارہ پہنے تمہیں ایرپورٹ پر ملے اور جھک کر تسلیم عرض کرے۔" گیل نے کہا۔

"انہیں لوگوں کے متعلق میرے اندازے عموماً صحیح نکلتے ہیں۔ یہ مسز سیون بے حد سویٹ اور پُرخلوص خاتون ہیں۔ لیکن مشرق کے متعلق کچھ نہیں جانتیں۔"

میرا قیاس درست ثابت ہوا۔

طیارہ ٹیکسس کے بہت بڑے شہر ڈیلاس پہنچا وہی شہر یہاں 63 عیسوی میں صدر کینیڈی قتل ہوئے۔ وہاں اُتر کر معلوم ہوا کہ نیو اورلینز جانے والی ٹیکسس ایرلائنز سے ٹھیک اسی وقت نیو اورلینز پہنچا دیا جائیگا۔ جس وقت آپ ٹیکسس ایرلائنز سے پہنچیں تو بے حد معذرت کے ساتھ کاؤنٹر کی...... کہا تھرو بکنگ کے ذریعے سامان ایک ہوائی جہاز سے دوسرے میں منتقل ہوتا منزلِ مقصود پر مل جاتا ہے۔ پرواز منسوخ ہونے کی وجہ سے میں واحد مسافر تھی جو طیارہ تبدیل کر کے اس پرواز سے نیو اورلینز جارہی تھی۔ ایک کارکن بار بار معافی چاہتا کار میں بٹھا کر دوسری طیران گاہ میں لے گیا۔ دوسری ایرلائنز کے لاؤنج میں پہنچا کر ایک بار پھر معذرت چاہی اور واپس گیا۔

نیو اورلینز پر میرا ایک بیگ غائب ہوگیا۔ میں نے متعلقہ دریچے والے سے کہا۔ اس نے مزاحمت سے جواب دیا۔ ایسی گڑبڑ شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ اپنی جائے قیام کا پتہ دیجیے۔ آج شام کے چھ بجے سے قبل بیگ آپ کو مل جائے گا۔

مسٹر اور مسز سیلون بھی غائب تھے۔ میں نے اس آدمی سے اس کا نام اناؤنس کرلیا۔ چند منٹ میں ایک خوش شکل متوسط العمر جوڑا مع ایک بچی نمودار ہوا۔

"ہم ٹیکسس ایرلائنز والی فرودگاہ میں منتظر تھے۔" مسز سیلون نے کہا۔

سیلون نام سے ظاہر ہوتا تھا کہ موصوف آئرش نژاد کیتھولک تھے وہی نکلے۔ شیری سیلون ورجینیا کے انگریز نژاد کیتھولک تھی۔ (یاد کیجیے ورجینیا وہ پہلی نوآبادی تھی جو سر والٹر ریلے نے 1607 عیسوی میں بسائی تھی)۔

"لیکن میرے دادا محض سو سال قبل انگلستان سے آئے تھے۔" شیری نے کہا جن کا لب و لہجہ اب تک خاصہ برطانوی تھا۔

"راستے میں ہم لوگ ذرا اپنی پوتی کی سالگرہ پارٹی میں شریک ہوتے چلیں۔" شیری بولی۔ "میرا بیٹا بہو عنقریب ایک دوسرے کو طلاق دینے والے ہیں۔ بیٹا دوسرے گھر میں اُٹھ گیا ہے۔ بچی کی سالگرہ کے لیے آ جائے گا۔"

ایک رہائشی علاقے میں ایک نئی وضع کے بنگلے کے اندر ایک معمولی شکل کی لڑکی نے استقبال کیا۔ کمرہ نشست میں چند مہمان موجود ہیں۔ ایک طرف ننھی سی ڈائننگ ٹیبل پر ننھا سا نقرئی ٹی سیٹ رکھا تھا۔ ننھی ننھی کرسیوں پر چند بچے بیٹھے تھے۔ چند منٹ بعد ایک بے انتہا خوب صورت نوجوان، گھنگھریالے سنہرے بال (اسے ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا) کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سیلولنز کا لڑکا تھا۔ خالص اولڈ ورلڈ سدرن کرشی کے ساتھ تقریباً رکوع میں جا کر اُس نے مجھے سلام کیا تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی امریکن ساؤتھ میں موجود ہوں۔ جہاں آج 1979 عیسوی میں بھی امریکن خانہ جنگی۔ 1865 عیسوی سے قبل کی پرانی یورپین کلچر باقی ہے۔ لڑکا اپنی بچی سے کھیلتا رہا۔ بیوی سے بات نہیں کی۔ دوسری منزل پر اس کی بیوی کا موجودہ دوست رہتا تھا۔ طلاق حاصل کرنے کے بعد وہ اس سے بیاہ کرنے والی تھی۔ اس آدمی کا چھوٹا بھائی بھی پارٹی میں موجود تھا۔ دونوں بھائی SHOW BUSINESS میں تھے چھوٹا بھائی بچوں کو طرح طرح سے محظوظ کر رہا تھا۔

یہ دونوں بھائی نیو اورلینز کے اصل فرانسیسی نژاد باشندے ہیں۔"

کرسمس آنے والی تھی کچھ دیر بعد بہو کا منگیتر فادر کرسمس کے بھیس میں داخل ہوا۔

اس سال کمپیوٹرائیز کھلونے بازار میں آ چکے تھے۔ "فادر کرسمس" ہر بچے کو گود میں بٹھا کر بڑے اخلاق سے اس کی فرمائش پوچھتا۔

"سر۔ آپ کو کیا چاہیے؟"

"مادموزیل۔ آپ کو کیا چاہیے؟" اور ہر بچہ اور بچی کسی کمپیوٹرائزڈ کھلونے کا نام لے

دیتی (جن کی کئی ماہ قبل سے ٹیلی ویژن پر زبردست پبلسٹی کی جا رہی تھی)۔

شیری کا لڑکا شکیل اپنے رقیب "فادر کرسمس" سے باتیں کرتا رہا۔ جو عنقریب اس کی بچی کا سوتیلا باپ بننے والا تھا۔ سارا ماحول بے حد مہذب اور پُر تکلف تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ گھر ٹوٹ چکا ہے۔

لڑکے کی چار سالہ بچی اطمینان سے "فادر کرسمس" کی گود میں بیٹھی رہی۔

"تم سے ملوانے کے لیے ہم نے آج ہی نیو اورلینز کے ایک قدیم خاندان میں چند لوگوں کو جمع کیا ہے۔ کیونکہ ایڈون کنزر نے آیووا سٹی سے مجھے فون پر بتایا تھا کہ تم کو امریکن ساؤتھ کی تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔" شیری نے اپنی بہو کے گھر سے نکلتے ہوئے کہا۔

"انڈیا میں تم کون لوگ آباد ہو۔ بدھسٹ؟ موزلم؟" مسز سیلون نے دریافت کیا۔

میرا یہ قیاس کہ بہت معصوم لوگ ہوں گے صحیح نکلا۔

ان کے بہو بیٹے کے اس موڈرن مکان سے نکل کر ہم لوگ ایک روایتی سدرن محلے میں پہنچے۔ جہاں خیاباں کے دونوں جانب ایستادہ کولونیل مکانات بالکل ٹینسی ولیمز کے ڈرامے "جلتی ٹین کی چھت پر بلی" والے سیٹ معلوم ہوتے تھے۔

ایک مکان کے چوڑے برآمدے اور سفید جھلملیوں والے دروازوں کے عقب میں خنک ڈرائنگ رُوم کے اندر چند معمر لوگ ٹیلی ویژن پر "بال گیم" دیکھنے میں منہمک تھے کہ بیس بال امریکہ کا قومی کھیل ہے۔ جین سیلون نے طیارے کی پرواز منسوخ ہونے کا واقعہ بتایا۔ حاضرین نادم ہوئے۔ "ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ امید ہے آپ کو زیادہ زحمت نہ ہوئی ہوگی۔" وغیرہ وغیرہ۔

صاحبِ خانہ امریکن بحریے کے ریٹائرڈ کمانڈر تھے۔ (جین سیلون بھی امریکن بحریے کے شعبۂ انجینئرنگ کے ریٹائرڈ کمانڈر تھے اور اب انجینئرنگ کے سامان کا ذاتی کارخانہ چلاتے تھے)۔

صاحبِ خانہ کی بیوی نے اپنی خواب گاہ دکھائی جس میں اٹھارھویں صدی کا چھپر کھٹ

رکھا تھا۔ سرہانے میز پر نہایت ضخیم مصور بائبل جس کے اوّلین اوراق پر اس کنبے کے پچھلے ڈھائی سو سال کی نسلوں کی پیدائش، شادی اور اموات کی تاریخیں درج کی جاتی رہیں تھیں باورچی خانہ اور باقی گھر بے حد موڈرن۔

شام کے چھ بجے جب ہم لوگ سیلونز کے مکان واقع والمونٹ اسٹریٹ پہنچے میرا بیگ برآمدے میں موجود تھا۔ جوڈیلاس سے کسی فلائٹ پر منگوا کر حسب وعدہ چھ بجے شام سے قبل گھر پر پہنچایا جا چکا تھا۔

اس خیاباں میں بھی دو رویہ جارجین کولونیل دو منزلہ مکان چوڑے پتوں والے ٹروپکل درختوں میں گھرے کھڑے تھے سارے امریکہ کے مکانوں کی طرح ایک سے ایک خوش وضع سیلونز کے تینوں لڑکے الگ رہتے تھے۔ بڑی لڑکی کا نام بر جٹ آئرش نام ہے۔ چھوٹی بارہ سالہ فنن اسکول جاتی تھی۔ اس کا نام شیری کے انگریزی کے پس منظر کی یادگار تھا۔ اوقات فرصت میں شیری تانبے کی مجسمہ سازی کرتی تھیں۔ شوقیہ فن کار تھیں۔ اپنے پائیں باغ کے کاٹج میں اسٹوڈیو تھا۔

شام کے وقت شیری کے بیٹے اور بہوئیں آجاتیں۔ جولڑکا اپنی بیوی کو طلاق دے رہا تھا وہ موجودہ گرل فرینڈ کے ساتھ آتا۔ زرعی قدامت پرست ساؤتھ میں خصوصاً کیتھولک کنبوں میں احساسِ یگانگت شمال کے مقابلے میں زیادہ معلوم ہوا۔ صنعتی تمدن کی بے گانگی ابھی جنوب میں شاید اس حد تک نہیں پھیلی تھی۔ پچھلی لاؤنج میں میز پر کرسمس کے تحائف کے کیٹیلاگ رکھے تھے۔ ایک اشتہار اس قسم کے غبارے کا تھا جو میں نے ورمونٹ سے نیو یارک آتے ہوئے راستے میں اُڑتا دیکھا تھا۔ اشتہار کے نیچے لکھا تھا ''اس کرسمس پر اپنی بیوی یا محبوبہ کو یہ تحفہ دیجیے۔ قیمت صرف پچاس ہزار ڈالر'' شیری نے جین کو وہ تصویر دکھلائی اور ہنسنے لگیں۔

''اتنا قیمتی تحفہ کتنے لوگ خریدیں گے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بہت سے'' جین سیلون نے کہا۔ ''ٹیکسس کے کروڑ پتی اور بہت سے لوگ ہم البتہ خرید سکتے۔'' (یہ دو کاریں رکھنے والی اور ہر دوسرے سال یورپ سیر کے لیے جانے والی ایک

مڈل کلاس فیملی تھی)۔

ہمارا سب سے بڑا لڑکا اَعلِکچو ئکل ہے۔ ایک یونیورسٹی میں امریکن ہسٹری پڑھاتا ہے۔ اس نے ایک نصف الجیرین نصف فرانسیسی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ کیتھرین خود لامذہب لیکن کہتی ہے کہ اگر کبھی مذہب کی طرف راغب ہوئی تو اپنے باپ کا دین اسلام قبول کرے گی۔"
شیری نے کہا "کل شام اس نے تم کو ڈنر پر بلایا ہے۔ ذرا مذہب کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کرنا۔"

شیری غالباً خواہش مند تھیں کہ کیتھرین بھی اپنی فرانسیسی ماں کی طرح رومن کیتھولک مذہب اختیار کرے مگر تکلف اور فرد کی آزادی رائے کے احترام کی وجہ سے اس موضوع پر اس سے کچھ کہہ نہ سکتی تھیں۔

"میرے والد فرانس میں رہتے ہیں۔ میں کبھی الجیریا نہیں گئی۔ مگر میرے چچا فرانس آتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے اُن کی لڑکیاں الجیریا میں کس قدر پابند زندگیاں گذارتی ہیں۔ اپنی مرضی کی شادی بھی نہیں کرسکتیں۔ مسلم سوسائٹی میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟" ہر فرانسیسی ماں اپنی بیٹی کو بہترین ککری بک جہیز میں دیتی ہے۔ میں نیو اورلینز سیر کے لیے آئی تھی۔ یہاں اس نستعلیق مہذب سدرن لڑکے سے شادی کرلی۔ ماماں مجھے پیرس سے برابر کھانوں کی نت نئی ترکیبیں بھیجا کرتی ہیں۔"

دوسرے کمرے میں مہمان جمع تھے۔ ایک انگریز لڑکا اور اس کی فرنچ بیوی جو کیتھرین کی طرح ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ملازم تھے۔ فرانسیسی قونصل خانے کا ایک نوعمر ڈپلومیٹ اور ایک بارلیش امریکن نوجوان جو باتوں سے نہایت رجعت پسند جنوبی معلوم ہوتا تھا۔ سابق شاہ ایران کی تعریفوں میں مصروف تھا۔

"مگر میں جانتا ہوں شاہ نے کتنے مظالم کیے تھے۔ فرانس کے اخباروں میں تمام تفصیلات چھپتی تھیں۔" فرانسیسی ڈپلومیٹ نے کہنا شروع کیا۔ امریکن رجعت پسند نے اس کی بات کاٹی۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ گوری اقوام کی نسلی برتری کے نظریے کا حامی بھی تھا۔

شیری کالڑکا کیتھرین کا شوہر ٹیکنکل سو بریونیورسٹی کا استاد معلوم ہوتا تھا۔ موٹے سیاہ فریم کی عینک، مدھم پرسکون جنوبی DRAWL کا لہجہ (جس طرح دلیپ کمار اُردو بولتے ہیں امریکن ساؤتھ کے لوگ اس انداز سے انگریزی)۔

انگریز نو جوان کچھ دیر تک بارلیش رجعت پسند کی گفتگو سننے کے بعد مجھ سے آہستہ سے بولا "یہ آدمی بالکل بے وقوفی کی باتیں کر رہا ہے۔"

"تم کو امریکہ کیسا لگا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نا قابل یقین۔" انگریز نو جوان نے برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ دیا۔

جس قسم کا یہ آدمی ہے شاید اسی طرح کے لوگ KUKLUX KLAN کے سفید برقعے اوڑھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

ہندستان میں بھی تو اچھوتوں کو LYNCH کیا جا رہا ہے۔" انگریز نو جوان نے جواب دیا۔

"پرانے تعصبات جدید اقتصادیات سے خلط ملط ہو کر بڑی تباہی پھیلاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

امریکہ میں شمال کی آزاد خیالی اور جنوب کی قدامت پرستی اور کالوں سے تعصب کے جنوبی رویے امریکن خانہ جنگی کی یادگار ہیں۔

1793 عیسوی میں اسپننگ جینی ایجاد ہوئی۔ اس کی وجہ سے صنعتی انقلاب آیا۔ ادھر ہندستان مانچسٹر کو خام سپلائی کرنے والی نو آبادی بنا۔ اُدھر امریکن ساؤتھ میں کپاس کی مزید کاشت کے لیے افریقی غلاموں کی تجارت (جو سترھویں صدی سے جاری تھی) بڑھی۔ شمالی ریاستوں کے جمہوریت پسند لوگ جنوب کے سیاہ فام غلاموں کی آزادی کے حامی تھے۔ اہلِ جنوب اس کے مخالف تھے اُن کی دولت وراحت کا دارومدار غلاموں کی محنت پر تھا۔ جب ری پبلکن ابراہیم لنکن 1860 عیسوی میں صدر منتخب ہوئے جنوبی ریاستوں نے یونین سے علاحدہ ہو کر کون فیڈریٹ اسٹیٹس آف امریکہ کی تشکیل کی۔ شمال سے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ 65-1861 عیسوی میں لاکھوں مارے گئے۔ (یہ خانہ جنگی امریکن قومی اساطیر کا ایک اہم حصہ بنی) جنوب کے

شکستہ غلام آزاد۔ لیکن ابراہیم لنکن کو ایک جنوبی انتہا پسند نے قتل کردیا۔ شمال اور جنوب کے مابین تلخی باقی رہی۔ خانہ جنگی نے جنوب کو اقتصادی طور پر تباہ کردیا تھا۔ وہ بہت دیر میں سنبھلا۔ شمال نے تیزی سے ترقی کی۔ خانہ جنگی کے بعد ہی سرمایہ داری سرعت سے آگے بڑھی۔ فولاد اور مشین کی اس نئی دنیا میں اَن گنت عظیم الشان شہر آباد ہوئے۔ اس بے اندازہ انڈسٹریل طاقت کے ساتھ ساتھ جرائم اور کرپشن میں بھی اضافہ ہوا۔ شمال کی صنعتی ترقی کے مقابلے میں ساؤتھ پھسڈی رہ گیا۔ کپاس اور گنے کے زمین داروں کی فیوڈل روایات کو یاد کرتا رہا۔ آج تک ساؤتھ کے "غریب گورے" ایک مسئلہ ہیں۔ اور کالوں سے وہی سب سے زیادہ متنفر کوکلکس کلان ان کی اس نفرت کی علامت ہے۔ اپنے حقوق کے لیے کالوں کی عظیم جدوجہد امریکن اساطیر کا ایک ولولہ خیز اور تابناک حصہ ہے۔

باوجودیکہ شیری ایک نیک دل روشن خیال اور حساس خاتون تھی۔ لاشعوری طور پر کالوں کے خلاف تعصب اُن کے اندر بھی اسی طرح موجود تھا جس طرح مثال کے طور پر ایک آزاد خیال تعلیم یافتہ مدراسی برہمن غیر برہموں یا اچھوتوں کے لیے اچانک اپنا رویہ ظاہر کردیتا ہے۔

کالوں کے لیے شیری کا سرپرستانہ آقاؤں والا انداز ابھی باقی تھا۔ ٹیلی ویژن لاؤنج میں ایک کالی عورت کی بڑی پینٹنگ رکھی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اس کالی عورت کا برنجی سر۔ دونوں فن پارے شیری نے بنائے تھے۔ "یہ ورجینیا میں میری والدہ کی پرانی نیگرو خادمہ تھی۔ نہایت وفادار اور تمیز دار بے چاری مرگئی۔" شیری نے بالکل اس طرح کہا جیسے اودھ یا روہیلکھنڈ کی کوئی بیگم صاحبہ اپنی کسی خانہ زاد وفادار مرحومہ باندی کا ذکر کرتی ہوں۔

ایک روز ہم غریب کالوں کے محلے سے گزر کر ڈاؤن ٹاؤن جا رہے تھے۔ ہر کالج کے سامنے ایک ایک نئی کار کھڑی تھی۔ کچھ غریب کالے اپنی کاریں دھونے میں معروف تھے۔ سڑک پر کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ سامنے ایک عظیم الجثہ اشتہار میں ایک کالی موڈل لڑکی کوئی قیمتی چیز خریدنے کی دعوت دے رہی تھی

"ان لوگوں کو اب تمام مراعات حاصل ہوچکی ہیں پھر بھی شاکی رہتے ہیں۔" شیری نے

اظہار خیال کیا۔ (ہمارے ہاں کہا جاتا ہے۔ "ہر بجّو کو سب کچھ مل رہا ہے پھر بھی شاکی۔")

ہمارے اور مغرب کے SLUMS میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نہ ہم اپنے افلاس کا مقابلہ امریکن افلاس سے کر سکتے ہیں۔ محمد علی کلے اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہیں کہ "ہم لوگ اتنے غریب تھے کہ ہمارے باپ کے پاس ایک دس سالہ پرانی کار تھی اور وہ بھی کبھی نئے ٹائرز نہ خرید سکتا تھا۔ اور ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ ٹائروں سے کام چلاتا تھا۔"

یہاں محمد علی کلے کی "نیشن آف اسلام" کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے 1916 عیسوی میں بیرون امریکہ چرچ "کرسچن سائنس" سے متاثر ہو کر نوبل ڈریو نامی ایک نیگرو نے مورش سائنس ٹمپل قائم کیا۔ (قرون وسطیٰ سے مغرب میں مسلمان افریقیوں کو مُور یعنی مراکشی کہا گیا ہے۔ یوروپین ہسپانوی مسلمان بھی مُور کہلائے۔ یوروپین نشاۃ ثانیہ کی مصوری اور ادب میں BLACK MOOR موجود ہے)۔ تو مسلم نوبل ڈریو علی نے دعوے نبوت بھی کیا۔ ہر مہدویت یا نبوت کے دعوے دار کی تحریک کی طرح یہ بھی ایک نیم مذہبی نیم سیاسی تحریک تھی۔

ڈریو علی کا اسلام بھی ذرا انوکھا سا تھا۔ کالوں کی (MYSTICAL STREAK) اُن کے مصائب کی پیداوار ہے۔ اس نے امریکن مسیحی کالوں کے وہ لازوال روحانی نغمے NEGRO SPIRITYALS تخلیق کیے۔ (نیویارک مین ہیٹن میں برابر سے گزرتے ایک کالے بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر آپا حسن نے کہا تھا کیا بات ہے کہ ہر بوڑھے کالے کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انکل ٹام ایسے ہی رہے ہوں گے)۔ تو بہر حال پیغمبر) نوبل ڈریو علی نے "قرآن مقدس" (نعوذ باللہ) شائع کیا جو دراصل ایک مسیحی تصوف کی کتاب اور چینی تبتی عارفانہ اقوال کے مجموعے پر مبنی تھی۔

مورش سائنس ٹمپل دراصل امریکن کالوں کی سیاسی بیداری کا ایک مظہر تھا۔ مغرب میں جس طرح کالوں کی تحقیر کی جاتی رہی تھی جواباً اس "صحیفے" میں علی نے لکھا تھا کہ ایشیائی اقوام کی تخلیق الوہی تھی اور افریقہ برتر ڈریو علی امریکہ سے باہر ایک نیگرو ریاست قائم کرنا چاہتا تھا اور کالوں کی معاشی مسائل کا حل اس کے ٹمپل کے اغراض و مقاصد میں شامل تھا۔

دوسری زیادہ کامیاب "بلیک مسلم" کساد بازاری کے زمانے میں شروع ہوئی اس کا بانی ویلیس فرڈ تھا۔ چارلس ایرک لنکن نے بلیک مسلمانوں پر اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ چونکہ عربی میں "فرد" کے معنی واحد کے ہیں۔ FARD جو "اللہ" سے بھی مماثل کیا جانے لگا۔

ایلائی یاہ محمد فرڈ کے جانشین اور "پیغمبر" بنے۔ یہ بھی گوروں کی مخالف تحریک تھی۔ گو ایلائی یاہ محمد اپنی مدافعت کے وقت تشدد استعمال کرنے کے علاوہ اہنسا کے مبلغ تھے۔ ان کے لڑکے اکبر محمد نے جامعہ الازہر میں دو سال پڑھا۔ ان کا سب سے مقبول اور بے حد ذہین پیرو میلکم لٹل میلکم ایکس کے نام سے نیویارک ٹیمپل کا لیڈر بنا۔ وہ کالوں پر پولس کے مظالم کے جواب میں تشدد استعمال کرنے کا حامی تھا۔ گو اپنے پیشوا کے اہنسا کے اصول پر کاربند رہا۔ سیاہ فام امریکہ کے اس نہایت قابل پُر جوش لیڈر اور اعلیٰ درجہ کے مقرر الحاج میلکم کو نیویارک میں ایک تقریر کرتے ہوئے 21 فروری 1965 عیسوی کے روز شہید کر دیا گیا۔

محمد علی کلے نیشن آف اسلام کے ایک بے حد جوشیلے رکن ہیں۔ کالوں میں ایک بے حد کٹر قسم کا "حنفی مسلم" فرقہ بھی ظہور میں آ چکا ہے۔

جس سال امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہوئی یعنی 1861 عیسوی میں ایک امریکن مشنری خاتون مس ازابلا تھوبرن نے شہر لکھنؤ میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ (اس وقت جان عالم واجد علی شاہ اختر پیا کو مٹیا برج سدھارے صرف چار سال ہوئے تھے)۔ یہ جوشیلی امریکن باہمت خدا پرست خواتین دور دراز امریکہ سے ہندستان آئی تھی کہ عورتوں میں جدید تعلیم کی روشنی پھیلائیں۔ اس طرح کے امریکن پریسی ٹیرین اسکول دہرہ دون لاہور اور دوسری جگہوں پر کھلے اور اے پی مشن اسکول کہلائے۔ لیکن رفتہ رفتہ ازابلا تھوبرن کالج لکھنؤ نے اپنی خالص امریکن روایات، مکمل امریکن اسٹاف اور بے حد اعلیٰ معیار کی تعلیم کی وجہ سے اوپری طبقہ کے لیے ایک خاص SNOB VALUE بھی اختیار کر لیا۔ (یہی اسنوب ویلیو نینی تال اور مسوری کے امریکن اسکول کے لیے آج تک موجود ہے)۔

اس ازابلا تھوبرن کالج کی تقریبات میں جو کیمونٹی سونگ ہم لوگ گاتے تھے۔ اس کا اصل

پس منظر اب جا کر معلوم ہوا۔ کیلیفورنیا میں مجھے "مائی ڈارلنگ کلیمنٹائن یاد آئی تھی۔ جس کا گولڈ رش والا FORTY-NINER باپ تھا اور جو روز صبح 9 بجے ندی میں سے اپنی بطخیں ہنکا کر لے جاتی تھی اور ایک دن پانی میں ڈوب گئی تھی۔

ایک بشاش گیت جو ہم ہندوستانی لڑکیاں بڑی مسرت و شادمانی سے گاتے تھے یوں تھا:

"پولی ڈوڈل ڈوڈل گاتا میں اپنی سیلی سے ملنے ساؤتھ گیا اپنی سوزی اینا سے ملنے لوزیانہ جا رہا ہوں۔ راستے میں ایک ندی پڑی۔ گاتے ہوئے میں اسے پار نہ کر سکا۔ تو میں ایک مگر پر سوار ہو گیا کیونکہ میں اسے ایک گھوڑا سمجھا۔ ریل روڈ ٹریک پر ایک جھینگر بیٹھا تھا۔" وغیرہ۔

یہ کورس سفید جنوب کی نفسیات اور ایتھوس کا عکاس تھا۔ مگر جب ہم پیانو کے ساتھ اسے گاتے تو ہم کو مطلق ہوش نہ تھا کہ کیا گا رہے ہیں۔

لیکن کالوں کے متعلق چند المناک اور دل نشیں گیت بھی تھے۔ میرا پسندیدہ نغمہ MY OLD KENIUCKY HOME تھا جو میں پیانو پر بجاتی تھی۔ "کینٹکی کے اس پرانے مکان پر سورج تیزی سے چمک رہا ہے۔ ڈارکی لوگ مسرور ہیں گیہوں کی فصل پک گئی۔ مرغزار سرسبز۔ چڑیاں دن بھر گاتی ہیں۔ بچے جھونپڑے کے فرش پر لوٹ لگاتے ہیں، سب خوش ہیں۔

"رفتہ رفتہ بُرے وقت نے دروازے پر دستک دی۔ اب وہ لوگ جنگل اور پہاڑی اور ساحل پر شکار نہیں کھیلتے۔ کالج کے دروازے کے سامنے پرانی بنچ پر بیٹھ کر چاندنی رات میں گیت نہیں الاپتے۔ وقت آ گیا ہے کہ ڈارکی یہاں سے چلے جائیں۔ شب بخیر۔ میرے پرانے کنٹکی کے مکان شب بخیر۔ لیڈی! اور اب مت روؤ۔ آج اور مت روؤ۔ ہم کنٹکی کے پرانے گھر کی یاد میں ایک گیت گائیں۔ وہ گھر جو بہت دور رہ گیا۔

اور میرا بے حد پسندیدہ غیر فانی نیگرو گیت OLD FOLKS AT HOME سوانی دریا کے کنارے بہت دُور۔ بہت دُور میں وہیں واپس جانا چاہتا ہوں۔ جہاں میرے بوڑھے ماں باپ رہتے ہیں۔ میں ساری ساری دنیا میں اُداس گھومتا ہوں۔ مجھے میرے پلانٹیشن واپس لے چلو جہاں میرے بوڑھے ماں باپ رہتے ہیں۔"

یہ ایک ایسا جذباتی رقت خیز کورس تھا جسے گاتے گاتے لوگوں کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ ''میڈسن ڈکسن لائن'' کی سرحد کے نیچے کی ''غلام ریاستیں'' جو ڈکسی لینڈ کہلاتی تھیں ان کی نیگرو میوزک بے مثال ہے۔

اتوار کی صبح میں شیری جین سلیون کے ساتھ کیتھڈرل گئی۔ جس وقت ہم کلیسا کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک رولز رائس آ کر رکی۔ میک اَپ سے لیس ہیروں سے لدی سیاہ ویل پہنے ایک ضعیفہ اپنی پوتی کے سہارے کار سے برآمد ہوئیں۔ بہو نے ان کا ویل درست کیا۔ بیٹے کا بازو تھام کر وقار سے چلتی اندر گئیں۔ شاید کسی پرانے پلانٹر کا خاندان تھا اور گارڈن ڈسٹرکٹ سے آیا تھا۔

اندر کیتھڈرل میں ماس کے بعد (حاضرین میں کوئی کالا چہرہ نظر نہ آیا) لاٹ پادری نے منبر پر آ کر کہا ''ہمارے جو بھائی آئی رین میں محبوس ہیں آؤ ان کے لیے دعا کریں۔

1803 عیسوی میں ریاست لوزیانہ امریکہ نے فرانس سے خریدی تھی۔ نیو اورلینز فرنچ ہسپانوی کنکشن کی وجہ سے زیادہ تر رومن کیتھولک ہے۔ تین مشہور عالم کیتھولک یونیورسٹیاں اس شہر میں موجود ہیں۔ تولان، لایولا، زیویرز۔ ایک سینٹ چارلس اسٹریٹ جس پر اب تک اسٹریٹ کاریں چل رہی تھیں۔

''تم کو یقین نہیں آئے گا۔ ذرا جھانک کر غور سے دیکھو۔ وہ اسٹریٹ کار جو سامنے سے آ رہی ہے اس کا نام " DESIRE " ہے۔'' شیری نے کیتھڈرل سے لوٹ کر سینٹ چارلس اسٹریٹ واپس آتے ہوئے کہا۔ خیاباں کے دونوں طرف پر شکوہ کولونیل مکانات۔

چند ہوٹلوں نے انیسویں صدی کا یورپین ڈیکور باقی رکھا تھا۔ کرسمس کی وجہ سے ہوٹل پرستان بنے ہوئے تھے۔ باہر قدیم کائی آلود شاہ بلوط جن کے نیچے ایک زمانے میں ڈوئیل لڑے جاتے تھے۔ نوتر دام کا مذہبی مدرسہ۔ تاریخی فرنچ کوارٹر پر خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور اتوار کا سکون فرانسیسی ناموں والی سڑکوں پر سیاحوں کے لیے بگھیاں چل رہی تھی۔ ایک خاموش چوراہے پر جینز میں ملبوس ایک بارِیش نوجوان (جو ہپی نہیں تھا) گٹار پر جنوب کے نغمے سنا رہا تھا۔ قدموں

میں اس کے ساز کا کیس سکوں کے لیے کھلا رکھا تھا۔ ایک گیت ختم کر کے اس نے کہا۔ اب میں اپنا مذہبی گانا سناؤں گا۔" پھر اس نے ایک انگریزی بھجن شروع کیا۔ "کرشنا۔ کرشنا!"

لوتر ادام اور لا یولا اور سینٹ زیویرز کی اس کیتھولک دنیا سے وہ بھی روحانی طور پر ڈراپ آؤٹ کر چکا تھا۔

ایک معصوم صورت لڑکا سائڈ واک پر اسٹول بچھائے اکارڈین بجا رہا تھا۔ ایک تماشہ گھر کے باہر بے حد حسین نیم عریاں رقاصاؤں کی تصاویر چسپاں تھیں۔ دروازے کے اوپر لکھا تھا "دنیا کے خوب صورت ترین لڑکے" یہ رقاصائیں دراصل "تیسری جنس" والے DRAN SVESTITES تھے۔ فرنچ کوارٹر مع بوربون اسٹریٹ اپنے بے ہودہ تماشوں کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔

"سان فرانسسکو کے بعد نیواورلینز تیسری جنس والوں اور GAY لوگوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان کافی رابطہ رہتا ہے۔" شیری نے ہنس کر کہا۔

اس وقت میں نے ایک بات نوٹ کی۔ جب میں اور شیری اس تماشا گھر کے سامنے رک کر تعجب سے وہ تصاویر دیکھ رہے تھے۔ جین سیلوں ٹہلتے ہوئے دور چلے گئے اور جب تک ہم دونوں وہاں سے آگے نہیں بڑھے وہ وہیں ٹھٹکے رہے۔ یہ ایک قدامت پسند، مہذب، پرانی اخلاقیات کے پابند وضع دار سدرن جنٹلمین کا بے ساختہ رویہ تھا جو مجھے بھلا معلوم ہوا ایک قدامت پسند وضع دار ہندستانی بھی یہی کرتا۔

ایک چوک میں میڈیول یورپ کے بازی گر کی پوشاک پہنے ایک خوبرو نوجوان نٹ نے مجمع لگا رکھا تھا۔ لیکن سب تماشائی خاموش۔ شور وغل ناپید۔ ایک طرف بہت سارے آرٹسٹ تصویریں بنانے میں مشغول تھے یا اپنی تصاویر بیچ رہے تھے۔ ایک بنچ پر ایک بوڑھا کوچہ گرد مغنی ایک کاؤ بوائے گیت کی YOODLING میں مصروف تھا۔ ایک اور چوک میں ایک بوڑھا حبشی چھتری لگائے رقص کر رہا تھا۔ اس کے گرد بھی تماشائیوں کی بھیڑ تھی۔ نیواورلینز نیگرو جاز کی جائے پیدائش ہے۔

ایک جگہ وہ منڈی تھی جس میں امریکن خانہ جنگی سے قبل نیگرو غلام نیلام کیے جاتے تھے۔ ایک دوکان کے باہر T-SHIRTS آویزاں تھیں جن پر NUKE IRAN چھپا تھا (یعنی ایران پر نیوکلیئر بم گرادو)۔ بحری قزاقوں کی گلی کے قریب ایک اوپن ایئر ریستوران میں لوگ ہاگ اتوار منا رہے تھے جیکسن اسکوائر اور بندرگاہ کے سامنے ریل کی پٹڑیوں پر سے مال گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

مارک ٹوین کے دریا۔۔۔سس پی پر جہاز چل رہے تھے۔ فضا میں ڈکسی لینڈ کی رومینٹک موسیقی مرتعش تھی۔ ٹینسی ولیمز کے ڈرامے A STREET CAR NAMED DESIRE کی سیٹنگ والے ریچ کوارٹر میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔

صبح سویرے شاہ بلوط اور میگنولیا اور شمشاد اور پامیٹو اور بید مجنوں سے ڈھکے ساحلوں سے ہٹ کر اسٹرن وہیلر اسٹیم بوٹ " COTTON BOSSOM " تاریخی یادگار کے سامنے سے گزری جہاں 1814 عیسوی میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ عہد مارک ٹوئن کی وضع کے اس جہاز میں بھی پہیے لگے تھے۔ مگر وہ بطور آزمائش پانی گرا رہے تھے۔ میں اسی طرح کے جہاز پر ہزاروں میل دور شمالی ریاست الی نوا میں اسی دریا۔۔۔سس پی پر سفر کر چکی تھی۔

''کپاس کا شگوفہ'' اب اس جگہ کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ جہاں بدنام زمانہ ژاں لیفیت اور اس کے بحری قزاق رہا کرتے تھے۔ ژاں لیفیت ایک خوفناک اسمگلر تھا۔ 1808 عیسوی میں جب ریاست ہائے متحدہ نے نیگرو غلاموں کی درآمد پر پابندی لگائی۔ اس شخص نے اپنی آمدنی جاری رکھنے کے لیے اپنے جہاز کے کپتانوں کو حکم دیا کہ ڈشمن برطانیہ اور ڈشمن فرانس کے جہازوں پر چھاپہ مار کر قبضہ کرلیں۔ 1814 عیسوی میں جنگ کے دوران ایک برطانوی کپتان نے ژاں لیفیت کو رشوت دینا چاہی کہ وہ نیو اورلینز پر فوجی قبضہ کرنے میں اس کی مدد کرے۔ تب اچانک ژاں لیفیت کا جذبہ حب الوطنی بیدار ہوگیا۔ اس نے متوقع برطانوی حملے کی خبر امریکن گورنر کو دے دی۔ جنگ میں وہ خود اس کے قزاق انگریزوں کے خلاف خوب خوب لڑے۔ فتح بطور صلہ امریکن پریذیڈنٹ میڈیسن نے لیفیت اور اس کے ساتھیوں کے جرائم معاف کردیے۔

ڈاں لیفیت اسٹیشن امریکن ساحلی قزاقوں کے زمرے کی آخری کلرفل شخصیت تھا۔ ناولوں اور فلموں کا موضوع۔

امریکہ کی دوسری بڑی بندرگاہ نیو اورلینز کے دریا پر اقوام عالم کے جہاز اپنے اپنے پرچم لہراتے گزر رہے تھے۔ ہندستانی کارگو جہاز شوساگر قریب سے نکل گیا۔ سوویت روسی جہاز اُڑیسہ دُور جاتا نظر آیا۔ کاش کاش امریکن اور روسی ایک دوسرے سے دوستی کرلیں۔ دنیا چین کا سانس لے۔

پرانی شوبوٹ کی وضع کی چہار منزلہ کشتی فرنچ کوارٹر کے وسط میں جیکسن اسکوائر کے سامنے سینٹ پیٹر اسٹریٹ کی گود پر واپس آئی۔ اس نوع کے متعدد جہاز سیاحوں سے لدے مسسی پی پر رواں تھے۔ پچھلی صدی میں سدرن پلانٹر اپنی زمین داریوں سے اسی قسم کے جہازوں پر سوار ہوکر نیو اورلینز آتے تھے۔

ایک صبح رومان پرور RIVER ROAD PLANTATIONS کی طرف جاتے ہوئے "اوبزرویشن کوچ" مسسی پی دریا کے کنارے کنارے گزری۔ راستے میں جگہ جگہ پلانٹرز کے پرانے مکانات۔ اونچے شاہ بلوط! گنے کے کھیت۔ دریا پر تجارتی کشتیاں چل رہی تھیں۔ بالکل اسی وضع کے دو منزلہ جارجین کولونیل مکانات اسی عہد میں سارے بنگال اور بہار اور یوپی میں تعمیر ہوئے جس میں جوٹ اور نیل اور افیون کے انگریز پلانٹرز رہتے تھے۔ لارڈ کارنوالس کے استمراری بندوبست کے بعد فاقہ کش ہندستانی کسان ان پلانٹرز کے نیم غلام بنے۔ یہاں امریکن ساؤتھ میں کپاس اور گنے کے پلانٹرز کے زرخرید غلام افریقہ سے منگوائے گئے تھے۔ وہ اتنی مختلف دنیائیں تھیں۔ مگر ان کا سماجی معاشیاتی سانحہ یکساں۔ یہ سفید فام امریکن پلانٹرز امریکن خانہ جنگی میں کٹ مرے تھے۔ خانہ جنگی نے ہزاروں پرانے زمین دار خاندان تباہ کردیے۔ اُن کے عالی شان مکان اسی طرح سجے سجائے سیاحوں کے لیے رکھے گئے ہیں۔ بہت سے مکان اب تک آباد ہیں۔ ایک محل کی گائیڈ لڑکیاں پچھلی صدی کی SOUTHER BELLES کی پوشاک میں ملبوس تھیں۔ اس روایتی ساؤتھ کے متعلق اتنے ناول اور ڈرامے لکھے گئے اور فلم بنے۔ اس

خطے کی پولی مٹی میں کنکر مفقود ہیں لہٰذا ان مکانات کی سڑکوں پر دریائی سیپیوں کی بجری بچھی تھی۔

واپسی پر کوچ ان محلات اور ان کے تیگر و غلاسوں کی کاٹجوں کو شاہ بلوط کے جھرمٹوں میں چھپا چھوڑ کر نئی ایکسپریس وے پر آ گئی۔ یہ ایکسپریس وے ساٹھ ستر میل تک دلدلی جنگل میں سے گزری۔ پل کے دونوں جانب پانی میں استادہ اونچے درخت اور جھیل کے کنارے سر سراتے شمشاد کے جھرمٹوں کے بعد شہر میں داخل ہو کر اچانک ایک عمارت پر ایک مدراسی ڈاکٹر کے نام کا بورڈ بڑا عجیب لگا۔

"تمھاری آمد کی اطلاع ریڈیو نیو اورلینز کر دی گئی تھی۔ کل وہاں چلنا ہوگا۔"

رات کو والمونٹ اسٹریٹ میں شیری نے کہا۔ دوسرے روز مسٹر رابرٹ کار نے WORLD VOICES کے آدھ گھنٹے کے انٹرویو میں ہندستانی سیاست اور مسز اندرا گاندھی سے لے کر انڈین فلم انڈسٹری تک بے حد سوالات کیے گئے۔

"آپ کے ملک کی اتنی قدیم تہذیب ہے اور اتنی روحانی بلندی۔ پھر اتنا شدید افلاس کیوں؟"

"اتنے کم وقت میں برطانوی کولونیلزم کی اقتصادیات پر لیکچر تو نہیں دے سکتی۔ برطانیہ نے ڈیڑھ سو سال تک استحصال کیا اور اس کے بعد غلط اکونومک پلاننگ اور تیزی سے بڑھتی ہوئی بے تحاشا آبادی۔ لیکن مغربی میڈیا میں ہندستان کے افلاس ہی کا چرچا ہے۔ یہ ذکر کبھی نہیں کیا جاتا کہ ہندستان اپنے سوپر سونک جیٹ طیارے بھی بنا رہا ہے اور مصنوعی چاند بھی۔"

"آپ پہلی ہندستانی ہیں جنھوں نے اس پروگرام میں برطانیہ کی نکتہ چینی کی ہے۔ ورنہ عموماً جو خاص خاص ہندستانی ہم یہاں مدعو کرتے ہیں وہ برطانیہ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ پچھلے پروگرام میں یو این کے فلاں صاحب آئے تھے، انھوں نے کہا۔"

"لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟" میں نے بات کاٹی۔ "خود آپ لوگ برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کے استحصال کے خلاف کیوں لڑتے تھے؟"

رابرٹ کار بہت ہنس مکھ آدمی تھے۔ کہنے لگے۔ "آپ کے سوالات کے لیے کم از کم

ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہے۔ اچھا ایک آخری سوال اور۔ آیت اللہ خمینی۔"

آیووا سٹی میں پروفیسر پال اینگل نے بھی مجھے بتایا تھا کہ ہندستان میں بہت سے لوگوں نے اُن سے کہا "کاش انگریز نہ جاتے"۔

47 عیسوی سے پہلے اگر کسی کو معلوم ہوتا کہ آزادی کے برسہا برس بعد لوگ ایسی خواہش ظاہر کریں گے تو کسی کو یقین نہ آتا۔

جس روز صبح میں نیو اورلینز سے روانہ ہو رہی تھی شیرؔی نے کہا کہ ایئرپورٹ جانے سے پہلے تم کو گارڈن ڈسٹرکٹ اور سینٹ لوئی کا قبرستان دکھاتی چلوں۔ گارڈن ڈسٹرکٹ امیروں کا محلّہ ہے اور یہ قبرستان یہاں کی خاص چیز ہے۔

پر فضا گارڈن ڈسٹرکٹ سے نکل کر قبرستان کی طرف جاتے ہوئے شیری نے کہا "یہاں کی مٹی دلدلی ہے۔ مردے زمین کے اندر دفن نہیں کیے جاتے سنگی میزوں کے اوپر اُن کے مرمریں تابوت رکھ دیے جاتے ہیں۔"

برابر کی سڑک پر سے گزرتے ہوئے میں نے نظر دوڑائی۔ سفید خوب صورت مزار۔ سب زمین سے بہت اونچے ڈھائی سو سال سے اس نظر فریب شہر کے باسی مرنے کے بعد ان انوکھی قبروں میں بند کر دیے جاتے ہیں۔ زمین کے اندر نہ سہی۔ اوپر سہی مرزا غالب کہہ گئے تھے۔ جو یوں ہوا تو کیا اور یوں ہوا تو کیا۔ انجام وہی۔

الفا اور اومیگا

نیو اورلینز سے شکاگو ہوا تین گھنٹے کی اُڑان۔ پونے تین بجے سہ پہر شکاگو پہنچ کر چار بجے سیڈر ریپڈز کے لیے یونائیٹڈ ایئر لائنز کا ہوائی جہاز شام کے ساڑھے چار بجے سیڈر ریپڈز تاریک تھا۔ تیز ہوا اور برفباری۔

جس وقت آیوواسٹی سے فلاور اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر باورچی خانے کا دروازہ کھولا۔ نادیا میر ناضرت کو موجود پایا۔

''تمھاری غیر موجودگی میں۔'' میرؔی نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''انٹرنیشنل رائیٹنگ پروگرام میں ایک عدد ولادت ہوئی۔''

''ولادت؟ کس کے ہاں؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''بوجھو۔''

سوچا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ ''اونگا؟ لیلیٰ؟ ایکنس، یا تھیا تو ہو نہیں سکتیں۔ رہیں نادیا اور فاطمہ تو یہ دونوں غیر شادی شدہ ہیں۔''

''پھر سوچو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''فاطمہ!''

فاطمہ ڈیکے؟'' میں نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔ ''مگر اس کی شادی نہیں ہوئی اور نہ معلوم ہوتا تھا کہ......''

''نیور مائنڈ، چند روز ہوئے رات کے دو بجے اس نے مجھے فون کیا۔ فوراً ہسپتال لے گئے۔ صحت مند بچی پیدا ہوئی۔ اسے وہاں چھوڑ کر فاطمہ تیسرے دن نیو یارک چلی گئی۔ جہاں اس

کا آپ شروع ہونے والا تھا۔

"سخت جان، قوی، ریڈیکل باغی افریقی لڑکی۔" نادیا نے کہا۔

"اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ بچی کا باپ کون ہے۔ شاید وہ جنوبی افریقہ ہی میں موجود ہے اور اس کا ہم قوم ہے برٹ اور تھیا نے فاطمہ سے کہا ہے کہ اگر وہ چاہے تو وہ بچی کو متبنّیٰ کر کے ہالینڈ لے جائیں گے۔ مگر اس نے منظور نہیں کیا۔ بن بیاہی کالی عورتوں کے ہاں یہاں بھی عام طور پر بہت بچے پیدا ہوتے ہیں اور اب گوروں کے ہاں بھی بہت ہو رہے ہیں۔

"یہ نئی اخلاقیات کی دنیا ہے۔ مگر نجانے فاطمہ پر جنوبی افریقہ میں کیا اُفتاد پڑی ہو، کیا پتہ کسی نے اسے دھوکا دیا ہو۔ نہ معلوم اس کے ذاتی مسائل کیا ہیں ممکن ہے اسے ریپ ہی کیا گیا ہو۔ اسے جج کرنے یا اسے ہمدردی جتانے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔" نادیا نے کہا جو اپنے رویوں میں بہت مغربی تھی۔

یہی رویہ پروگرام کے باقی اراکین کا تھا اپنے کام سے کام رکھنے اور دوسروں کے معاملات میں ناک نہ ڈالنے کے زریں مغربی اصول کے تحت کسی نے اس واقعہ کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔

میں پروگرام کی مدت میں متعدد بار باہر جاتی رہی تھی اور بہت سے سیمیناروں میں شرکت نہ کر سکی تھی ("موڈرن انڈین فکشن" کے متعلق سیمینار بالکل شروع ہو چکا تھا) ویٹ بار اور عجز بک اسٹور کی ادبی محافل بھی جاری تھیں۔

ایک سرد شام ہم لوگ نامور جواں سال جاپانی شاعر گوزو یوشی ماسو کو سننے ویٹ بار گئے۔ اس نے جاپانی میں اپنا کلام بلاغت نظام اور بیک وقت اس کی برازیلین بیوی اور ایک کالی لڑکی اسٹیفلیا نے اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ ساتھ ساتھ ساز بجائے گئے۔ بے پناہ شور مچا۔ گوزو (اسے بھی جاپانی نظموں کا ہیرو ہونا چاہیے تھا)۔ اچھلا کودا فرش پر اکڑوں بیٹھ کر حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ سر کے بال نوچے۔ چھت کی طرف منہ اٹھا کر چلایا۔ تو وہ کئی قسم کی اداکاری کی۔ اس ہنگامے میں انگریزی تراجم کو نہ سمجھنا ہی مدعا تھا۔ یہ ذرا زیادہ ہی ڈرامائی HAPPENING تھی۔ سامعین مسحور ہوئے (امریکن جاپانیوں سے بھی بہت مسحور ہیں)

گوز داوک لینڈ یونیورسٹی میں پوئیٹ ان ریذیڈنس تھا۔ جہاں ترقی پسند اُردو شاعر خیب الرحمٰن پروفیسر ہیں۔

الوداعی دعوت کی رات پال اینگل کے ہاں صبح دو بجے تک شور و غوغا رہا۔ ہمیشہ کی طرح (سوائے میرے) سب ناچے ایکیس بھی ناچیں۔ اس طرف وہ پہلی بار مسرور نظر آئیں۔ ایسا لگا جیسے دکی بام کی ہیروئن کچھ دیر کے لیے اپنے خول سے باہر آ گئی۔

اب لوگوں نے واپس جانا شروع کر دیا۔ روز دریچے میں سے نظر آتا۔ مائکل کا اسباب لد رہا ہے۔ آج لیلیٰ گئیں۔ نیو بلغاریہ روانہ ہوا۔ رات کو میتو یو گوسلاویہ جا رہا ہے۔ کل آرتی ایتھنز جائے گا۔ پروگرام کی طرف سے سات سو ڈالر کے ایئر ٹکٹ ملک کے اندر سیر سپاٹے کے لیے ملتے تھے۔ لوگ ہاگ دور نزدیک کے چکر لگا کر واپس آ رہے تھے۔ نادیا اور لیلیٰ بھی گھوم آئی تھیں۔ میں چونکہ یونیورسٹیوں کی دعوت پر گئی تھی۔ سات سو ڈالر باقی تھے۔ لیکن اب برف باری شروع ہو چکی ہے اور کافی سیر کر لی ہے۔ واشنگٹن سے پرانی عزیز دوست جین اسٹیل کون (دیکھیے کار جہاں دراز ہے جلد دوم) کا فون آیا۔ یہاں کب پہنچ رہی ہو۔ میں نے کہا۔ جین آپا کچھ رشتے داروں نے آسٹریلیا بلایا ہے جو براعظم پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لہٰذا فی الحال وہاں جاتی ہوں۔ لہٰذا وہ باقی ماندہ ساڑھے چھ سو ڈالر کرائے میں ڈال کر سڈنی کا ٹکٹ بنوایا۔

اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں میں سے پارک کے اتنے موسم تیزی سے بدلتے دیکھے تھے۔ اگست کی روشن دھوپ۔ خزاں کے لہلہاتے آتشیں اور ارغوانی رنگ۔ شام کو جب آیووا ندی پر سورج ڈوبتا سامنے وسیع آسمان پر پھیلی ہوئی شفق طویل دریچوں میں سے ایک سینما اسکوپ نظام معلوم ہوتی۔ اب وہاں تاریکی تھی اور برف کے گالے آیووا ندی منجمد ہونے والی تھی۔ بہت جلد برف ہٹانے والے خودکار پل سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ نمک کے ذریعے برف پگھلائی جائے گی۔ لوگ باگ اسکیٹنگ کریں گے اور سیڈر ریپڈز میں پہیوں کی جگہ پھسلنے والے تختے طیاروں میں لگا دیے جائیں گے۔

لاس اینجلز روانگی کی صبح سورج نکل آیا۔ برٹ اور تھیا خدا حافظ کہنے کے لیے لوبی میں

موجود تھے۔ ایگنیس اور بالا زینگل لپکے ہوئے نیچے آئے اور اداسی سے مسکرائے۔ ہوانگ اور پال فرانٹے سے آکراسی پھرتی سے بریکفاسٹ کے لیے گھر لے گئے۔ اُن کا کھانے کا کمرہ تیز دھوپ سے روشن تھا۔ پال نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ وقت بھی اچھا گزرا اور بہت جلد ختم ہو گیا۔" ہوانگ چینی تحقیق کا ایک طلائی گڈ لک تعویذ نکال کر لائیں جو ہمارے امام ضامن کی طرح چین میں طویل سفر پر جانے سے پہلے مسافر کو پہنایا جاتا تھا۔

وہ بدھسٹ چین کی رسم تھی۔ مجھے یاد آیا۔ جب میں پہلی مرتبہ سوویت یونین جا رہی تھی۔ روسی قونصل۔ ان کی بیوی اور چند اور روسی بھی ہم راہ جانے والے تھے۔ روانگی سے قبل جب ہم لوگ اُن کے گھر سے چلنے لگے۔ روسی قونصل کی بیوی نے اچانک اشارہ کیا۔ سب پھر بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اٹھے۔ انھوں نے کہا یہ ہمارے ہاں کا پرانا ٹوٹکا ہے۔ نیک شگون طویل سفر پر جانے سے پہلے۔ (مادیت کے فلسفے میں اس کے شگون اور ٹوٹکے کا کہیں ذکر نہیں)۔

جرمن نژاد کالولنسٹ پال، چینی ہوانگ اور امام ضامن کی روایت والی راقم الحروف اینگلز کی پہاڑی سے اُترے سامنے آیو واندی بہہ رہی تھی جو روایات کے بننے اور بگڑنے سے بے نیاز اسی طرح بہتی رہے گی۔ (اگر دنیا باقی رہی)۔

شب گذشتہ سے فلاور کے نکڑ پر اپنے کوزی فلیٹ میں پیٹر ناضرت نے یوگنڈا کے متعلق اپنا سیاسی ناول IN A BROWN MANTLE دیتے ہوئے اس پر لکھا تھا۔

IN THE COLD DYING DAYS OF THE SEVENTIES A LAST SOUVEINIR OF THE LAND OF WAR - TO REMIND YOU THAT WE CAN NOT CHANGE OUR FUTURE WITHOUT KNOWING OUR PAST.

شکاگو۔ ڈینور۔ گرم خوش گوار، کیلی فورنیا نمبر 119 تا رتھ ریجمونٹ جلال عدنان منصور تینوں بچے اپنی پڑھائی میں مصروف تھے۔ بیورلی ہلٹن اور سارالاس انجلز رات کو لاکھوں روشنیوں سے جگمگاتا طیران گاہوں کے وسیع COMPLEX میں طویل متحرک برقی سڑکوں پر مشرق کی

سمت پرواز کرنے والوں کے ہجوم رواں تھے۔ کوریا۔ جاپان۔ تائیوان۔ جزائر بحرالکاہل و غرب الہند۔ جمِ غفیر میں ایک خفیف سی جھنجھناہٹ اور افراتفری۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اور ینٹ یہاں سے شروع ہو گیا۔

پین امریکن کا جمبو جمعرات کی صبح دو بجے لاس اینجلز سے اُڑا۔ چند گھنٹے بعد ڈیٹ لائن پر سے گزرا اور جمعہ کا دن غائب۔ نیوزی لینڈ کے شہر آک لینڈ کی پہاڑیوں پر وہ لطیف کہرہ تیر رہا تھا جس میں ماوری قبائل کو اپنے الوہی اسرار نظر آتے تھے۔ گوروں کے چہرے مُہرے اور انداز برطانوی۔ قطب جنوبی کے نزدیک ایک اور انگلستان۔

آسٹریلیا، شاداب و خوش منظر سڈنی سرخ چھتوں والے مکان اپنے COCKNEY اور اجداد سے آسٹریلین لوگوں نے بشاش دوستانہ انداز ورثے میں حاصل کیا۔

میرے رشتے داروں کے خوب صورت مکانوں کے احاطوں میں سرخ جرینیم کھلے ہوئے تھے اور خودکار متحرک فوارے سبزے کو پانی دے رہے تھے۔ کزن سلطان حیدر کی حسین گلوکار بیگم شہناز (سڈنی ریڈیو میں انگریزی پروگرام آفیسر) اور ایک اطالوی نژاد جرنلسٹ خاتون نے انگریزی میں آدھ گھنٹے کا اور بہاری نژاد صلاح الدین صاحب نے اُردو پروگرام کے لیے ایک گھنٹہ کا انٹرویو کیا۔ دوسرے کزن ڈاکٹر محمود زیدی بحیثیت امریکن وزیٹنگ پروفیسر یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز میں سال بھر کے لیے اقتصادیات پڑھانے میں مصروف تھے اور ایک آسٹریلین پروفیسر کے مکان میں (جو مع خاندان برائے تحقیق جزائر بہودا گیا ہوا تھا) مقیم تھا۔ اس مکان میں کال بیل کے بجائے۔ ACOUSTICS اس قسم کے تھے کہ نیچے صدر دروازے پر کوئی دستک دیتا تھا تو وہ بالائی منزل کے کواڑوں پر سنائی دیتی تھی۔

آسٹریلیا میں یہ موسم گرما تھا اور شام کو درختوں میں کوئل کاتی تھی اور رات کے آسمان پر وہ ستارہ جگمگاتا تھا جس کا نام کرہ جنوبی دریافت کرنے والے عیسائی "جنوبی صلیب" رکھ گئے تھے۔

انجیل مقدس کے عہد نامہ جدید یعنی مسیحی بائبل کا آخری حصہ بعنوان "یوحنا عارف کے مکاشفے" ایک قابل ذکر کتاب ہے۔ یہ JOHN EHT BAPTIST کا ہم نام ایک یہودی شاعر

تھا جو عیسائی ہو گیا تھا۔ عبرانی میں سوچتا تھا اور یونانی میں لکھتا تھا۔ بائبل اسکالرز کا خیال ہے کہ یہ یوحنان رومن حاکموں کے خلاف اہل فلسطین کی بغاوت اور ان کے پرسیکیوشن کے زمانے میں گلیلی سے ہجرت کر کے اناطولیہ کے شہر افی سس چلا گیا تھا۔ اس سیاسی اضطراب اور زبوں حالی کے زمانے میں اس نے قدما حضرت دانیال وغیرہ کی طرح بہ طور پیشین گوئی موثر اور گرج دار اور تقریباً ایکس پریشنسٹک EXPRESSIONISTIC انداز میں اپنے مکاشفے "قلم بند" کیے تھے۔ اس وقت کے اور آج کے فلسطین میں اعجاز و بے انصافی میں زیادہ فرق نہیں۔ صوفیوں اور عارفوں کی پیشن گوئیاں اور سکھوں کی جنم ساکھیاں بھی مضطرب زبانوں میں لکھی گئیں۔ "مریم دی اسٹوری آف دی میوٹنی"۔ پردادا سید احمد علی کی وہ اَدھ جلی کتاب جس میں میں نے شاہ نعمت اللہ ولی کی نظم کا انگریزی ترجمہ دیکھا۔ کتنی کتابیں کتنی شورشوں میں اور جلیں گی۔ کتنی ادھ جلی باقی رہیں گی (میں اس وقت ایادان اور خرم شہر کے کتب خانوں میں کیا کیا جل رہا ہوگا)۔ ملبورن سے آدھی رات کو ایک معمر انگریز عورت نے ابھی اپنا ایمان نہ کھویا تھا اور نہ (بائبل کی زبان میں) انوکھے خداؤں کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ جب وہ تلاوت ختم کر چکی میں نے کتاب مقدس اس سے لی اور یوحنا کا مکاشفہ کھولا۔

"خداوند خدا جو ہے اور جو تھا اور جو آنے والا ہے۔ یعنی قادر مطلق فرماتا ہے کہ میں الفا اور اومیگا ہوں اور اپنے پیچھے نرسنگے کی سی آواز سنی کہ جو کچھ تو دیکھتا ہے۔ اسے کتاب میں لکھ۔

"اور تخت پر جو بیٹھا تھا میں نے اس کے داہنے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھی جو اندر سے اور باہر سے لکھی ہوئی تھی اور سات مہریں لگا کر بند کیا گیا پھر میں نے زور آور فرشتے کو بلند آواز سے یہ منادی کرتے دیکھا کہ کون اس کتاب کو کھولنے اور اس کی مہریں توڑنے کے لائق ہے اور میں اس بات پر زار زار رویا کہ کوئی اس کتاب کو کھولنے یا اس پر نظر کرنے کے لائق نہ نکلا۔ پھر میں نے دیکھا کہ برے نے ان سات مہروں میں سے ایک کو کھولا۔ اور ان چار جان داروں میں سے ایک کی گرج سنی کہ آہ! اور میں نے نگاہ کی تو دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے۔ اور اس کا سوار کمان لیے ہوئے ہے اور اسے ایک تاج دیا گیا۔ اور وہ فتح کرتا ہوا نکلا کہ اور بھی فتح کرے۔

"WASP"؟ اور جب اس نے دوسری مہر کھولی۔ پھر ایک اور گھوڑا نکلا جس کا رنگ لال تھا۔ اسے ایک بڑی تلوار دی گئی۔"

لال!

"اور تیسری مہر اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کالا گھوڑا ہے۔ اس کے سوار کے ہاتھ میں ایک ترازو ہے۔"

کالی دنیا۔ یا عبا پوش مُلا خمینی اور اُن کا "اسلامی انصاف؟"

"اور چوتھی مہر۔ زرد گھوڑا۔"

چین؟

"اور جب اس نے اتھاہ گڑھے کو کھولا تو گڑھے میں سے ایک بڑی بھٹی کا سا دھواں اُٹھا اور سورج اور ہوا تاریک ہو گئی۔"

ایٹم بم؟ فضا کی آلودگی؟

"اور ان میں سے ہر ایک کو سفید جامہ دیا گیا اور اُن سے کہا گیا کہ اور تھوڑی مدت آرام کرو۔ جب تک تمھارے ہم خدمت بھائیوں کا بھی شمار پورا نہ ہولے جو تمھاری طرح قتل ہونے والے ہیں۔"

"ایران میں مزید دو سو آدمی فائرنگ اسکواڈ سے ہلاک۔" ملبورن کے ایک شام کے اخبار کی ایک سرخی متبسم لمبا تڑنگا آسٹریلین اسٹورڈ صبح کی چائے کے ساتھ اخبار سامنے رکھ گیا۔

نہیں یوحنا کے مکاشفے کی یہ عصری تاویلیں کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں۔ میں نے کنگ جیمز بائبل بند کر کے انگریز خاتون کو واپس کر دی۔

آسٹریلین اُڑن ہاتھی سانتا کروز پر اُترا۔ ہوائی جہاز کی مغربی تنظیم اور اخلاق کے ماحول سے باہر آ کر اچانک مشرق ایک مراٹھی خاتون نے جو سڈنی میں سیٹل ہو چکی تھیں اور گھر والوں سے ملنے آئی تھیں۔ ایک کاؤنٹر پر بیٹھے کلرک سے کسٹم والوں کا راستہ دریافت کیا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ خاتون نے دوبارہ پوچھا۔ اس نے جمائی لی اور بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ہوا پیا سے اُترنے والے مغربی جو شاید پہلی بار مشرق آئے تھے بدنظمی شور و غل اور افرا تفری سے بھونچکے ہو کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

ادھر کسٹم کاؤنٹر پر ایک ساری پوش خاتون کے سوٹ کیس میں سے بیرونی COSMETICS اس طرح نکلے چلے آ رہے تھے جس طرح گویا پاشا کے طلسمی صندوقچے سے کبوتر برآمد ہوتے تھے۔

باہر ایک بٹے کٹے ہمہ پوش مسلمان نوجوان فقیر نے میرے سامنے آ کر نعرہ لگایا۔ "دے حاجی ملنگ بابا کے نام پر۔"

پیارے پڑھنے والو۔ یاد رکھو اور پہچان لو۔ کہ جہد البقا میں بچھڑنے اور ہارنے والی قوموں کی یہی نشانیاں ہیں۔

ائیرپورٹ پر خریدے ہوئے اخبار پر نظر ڈالی: ایران و عراق کے مابین جنگ کے آثار۔ (پیارے پڑھنے والو۔ پند و نصیحت میرا منصب نہیں) مگر ایک بات یاد آتی ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں مسلمانوں کی ایک سو اٹھائیس سلطنتیں تباہ ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر خود مسلمانوں ہی نے ایک دوسرے کے خلاف بھیانک لڑائیاں لڑ لڑ کر نیست و نابود کی ہیں۔

اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا قول یاد آتا ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ جب اللہ ہمارا اور صرف ہمارا تھا تو اس نے خلافتِ عباسیہ کا وارث ہلاکو اور اندلس کا مالک ازابیلا اور فرڈی ننڈ کو کیوں بنایا اور مغلوں کا تاج کوئن وکٹوریہ کے سر پر کیوں رکھ دیا۔ مشرقی یورپ سے ہمارے آثار کیوں مٹا دیے۔ روس میں اسلام پر پہلے زار اور پھر کمیونسٹوں کو کیوں غالب کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت طویل فہرست ہے۔

ٹیکسی نے ساؤتھ بمبئی کا رُخ کیا۔

میں نے سوچا وہی مثل ہے کہ

کہاں گئے تھے؟ کہیں نہیں۔ کیا لائے کچھ نہیں۔

(مکتبہ اردو ادب، 1980)

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے

وہ آہنی الماریوں میں دراز تھے۔ تلے اوپر۔ جس طرح اخبارات کے دفتروں کے اندرونی نیم تاریک سیلے ہوئے کمروں اور گوداموں کی کھلی آہنی الماریوں میں OBITS کے گرد آلود فائل۔ اوپر تلے کولڈ پرنٹ کے سرداب بیرونی وفاتر زندگی کی چہل پہل اور روشنی سے معمور۔ دریچوں سے جھانکتا سورج۔ ٹیلی پرنٹر سے متواتر نکلتا ربن بے تحاشا سزائے موت کی خبروں سے پُر۔ کولڈ پرنٹ کی چند سطروں میں منتقل ہو کر چھپنے والے وہ نیوز آئٹم الماریوں میں مردہ رکھی فرش پر قطار اندر قطار پھول ہیں صحرا میں یا پریاں۔۔۔یا مُردے قطار اندر قطار۔ جرنیلی یونیفارموں پیرس کے سلے سوٹوں میں بوٹوں سمیت سرد۔ چند ماہ قبل جب 1400 ہجری کا چاند طلوع ہوا تھا۔ سان فرانسسکو میں سہ تاز اپنے ساتھیوں کے ساتھ صبح صبح JOGGING کر کے لوٹتی اور بریکفاسٹ کے ساتھ ساتھ وہ ٹیپ عقیدت سے سنتی جاتی جو وہ پیرس سے لائی تھی۔ وہ سر پہ اسکارف باندھنے لگی تھی اور ڈسکو کے بجائے شام کو اب نمازیں پڑھتی تھی۔

"تو و عزّ و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری"

کیسٹ بدلتے ہوئے وہ زور سے للکارتی۔

تخت سے تختۂ دار تک۔ مردِ مومن۔

نیویارک میں بار بار اوالٹرز سے سوالات کا جواب دیتا نیا جواں سال وزیر ٹیلی ویژن اسکرین پر متبسم نازاں۔

بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ مقدمے کے فوراً بعد ایک سپاہی آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر —— جو کوئے یار سے آئے تو ——

مقدمہ چلائے جانے سے لے کر فیصلہ سنائے جانے سے لے کر آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھنے سے لے کر زیرِ دیوار کھڑا کر کے گولی کا نشانہ بنائے جانے کے لمحے تک کے چند گھنٹوں یا چند دنوں کی کیفیت کا بیان مختصر الفاظ میں کرو۔ رواں تبصرہ مختصر الفاظ میں۔ دس نمبر کا سوال۔

خود اعتمادی سے بار بر اوالٹرز کے سوالوں کا جواب دیتا۔ نازاں۔ متبسم۔ بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ چار دن سے شیو نہیں کیا۔ "عدالت" کے سامنے بھونچکا۔ سرنگوں۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی کا خنجر ان نینوں کے بیچ پر کیوں وہ بھی دیکھا۔ یہ بھی دیکھ۔

باربر اوالٹرز خندہ زن خندہ زن۔ زیرِ دیوار۔ گولیوں کی باڑھ۔ سرداب میں سرد۔ سرد خاک۔ سرد پچھاڑے اپنی قبریں کھودتے مرد و زن مرد و زن (بروزن خندہ زن خندہ زن)

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو
نشانہ باندھے بندوقچی
آہ کرنے کا سبب پوچھا تو

کاؤنٹ ڈاون۔ دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات۔ چھ۔

السلام علیکم یا اہل القبور۔ کھود لیں قبریں؟ تو آیئے قطار میں لگ جایئے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ لائن سے۔ لائن سے۔ کیوسمت توڑیے جناب۔

یہاں اس میز سے ایک ایک سیاہ پٹی لیتے جایئے اور اپنی آنکھوں پر باندھتے جایئے۔ ان نینوں کے بیچ پر کیوں لائن سے "زمین پر فساد پھیلانے والے" اور "منافقین" اور "ترمیدے" اور

"زندیق" سب ایک طرف۔ عورتیں اور لڑکیاں دوسری طرف۔

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو شرمانے لگے۔ تازیانوں کے نشاں۔ سب اس قطار میں آ جائیں جلدی جلدی۔ افراتفری نہیں۔ سستی نہیں۔ ڈسپلن۔ سب پوچھا تو۔ تازیانوں کے نشاں پشت پہ دکھلانے لگے۔ بولی وہ کون سے عصیاں پہ ملی یہ تعزیر۔ رو کے فرمایا گناہ کچھ بھی نہیں بے تقصیر سلیقے سے پھاوڑے قرینے سے سے رکھ دیجیے۔ دوسرے آ رہے ہیں۔ کچھ کفن کے لیے ہمراہ نہیں لایا ہوں۔ باپ کو چھوڑ کر بے گور و کفن آیا ہوں۔ فکر مت۔ کفن سرکاری ملتے ہیں۔ تشریف لائیے۔ یہ بوتراہیوں کی خاک ہے۔ اس میں آپ کی کھودی ہوئی قبریں آپ کی منتظر ہیں۔ منہ پھاڑے۔ گولیوں کی باڑھ۔ گرم خاک۔ سُرخ خاک۔ سرد خاک۔ برف پوش گورستان۔ ان تودہ ہائے خاک کے گرد لالہ کے پھول کھلیں گے۔

جناب تودہ کا کیا ذکر تھا؟

بہار آمد نگار، آمد نگار آمد ——

شروع شروع میں ان تصاویر کو دیکھ کر دھکا سا لگا تھا۔ وہ جو انصاف کرنے آئے تھے وہ بھی۔

——El-hu

جواباً۔ نازغضب ناک ہوئی۔ تم مخالفوں میں سے ہو ایجنٹ۔

دنیا میں صرف دو گروہ ہیں۔ موافق اور مخالف۔

مخالفین واجب القتل ہیں۔

اب عادت سی ہو گئی ہے ان تصویروں اور خبروں کی عادت ہو گئی ہے۔ فسادات اور قتل عام اور اجتماعی سزائے موت کی خبروں کی عادت ہو گئی ہے۔ قحط زدہ بچوں، بمباری اور فسادوں اور جنگوں میں کٹے پھٹے، اعضا سے محروم ماندے بچوں کی تصویروں کی عادت ہو گئی ہے۔ "یہ بچہ کس کا بچہ ہے" اور "فلسطینی بچے کی لوری" جیسی دلدوز نظمیں بے اثر ہو چکیں۔ بندہ بشر عادت کا پتلا ہے۔

پھانسی سے لٹکتی لاشوں کی تصویروں کی بھی عادت۔

وہ تصاویر جن کا آپ نے ذکر کیا مندرجہ بالا سطور میں۔ وہ سچی ہیں لیکن موخرالذکر تصاویر اور خبریں سفید جھوٹ۔ جعلی۔ فرضی۔ بہتان۔ مغرب کا جھوٹا پروپگنڈہ آپ شیطان کی ایجنٹ ہیں۔

اس مشہور سائنس داں نے ایک بار بڑے چاؤ سے اپنے پوتوں پوتیوں کی تصاویر دکھلائی تھیں وہ بھی آہنی الماریوں میں دراز ہے۔ اور وہ مادام۔

ان مادام کی ولا میں پھول ہی پھول تھے۔ اندر نفیس الماریوں میں فلسفۂ تعلیم کی فرنچ کتابیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی رپورٹیں۔ نماز پڑھ کر سالون میں آئیں۔ میں نے اپنی ساری عمر تعلیم نسواں کے فروغ کی جدوجہد میں گزاری ہے۔ ہماری پائنیر خواتین نے رجعت پسندوں کا مقابلہ کیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں تاکہ ہماری لڑکیاں پڑھ لکھ سکیں۔ یہ ان کی دھندلی تصاویر دیکھیے۔ آج سے ساٹھ ستر سال قبل انھوں نے۔

دریچے کے باہر سیب سے لدا درخت سرسرایا۔ سالون کی دیوار پر اس کی ٹہنیوں کا سایہ لرزاں تھا۔ ایک ٹہنی پر ایک بلبل آبیٹھی۔ آگست رینوئر کی ایک بڑی پینٹنگ کے عین مقابل جنگل کی کھلی فضا میں دوڑتی بچیوں کی اس تصویر پر سیب کی شاخوں کا سایہ متحرک وہ خوب صورت دیوار اچانک صحن زنداں کا کھردرا خون آلود پشتہ۔ اب مادام اس سے لگی کھڑی ہیں۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی۔ گولیوں کی باڑھ۔ پل کی پل میں یک صراط۔

مادام کی ولا سے کچھ فاصلے پر دہ فن کاروں کا قہوہ خانہ تھا۔ اس قہوہ خانہ میں ایک شام اس نامور ڈرامہ نگار نے اپنی نئی تمثیل کا پلاٹ سنایا تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ٹیلی ویژن پر جدید PASSION PLAY دکھلایا جارہا تھا۔

"ہمارے ہاں دو زبردست ڈرامہ نگار تھے۔ ابسن و دیبر۔ اگر ان کے مراثی کو اسٹیج

کیا جاتا۔ ایک اور پرانے شاعر کا نوحہ سنیے۔" اس ڈرامہ نگار سے کہا۔

کیا جانیے کیا کیا ابھی دُکھ پائے گی زینبؑ۔
گھبرائے گی زینب۔ کیسا یہ بھرا گھر ہوا برباد الٰہی۔ کیا آئی تباہی۔"

ناسور ڈرامہ نگار مبہوت ہو کر سنتا رہا۔

"پوچھیں گے جو سب لوگ کہ بازو کو ہوا کیا۔ یہ نیل ہے کیسا ——— کس کس کو نشاں رسّی کے دکھلائے گی زینب۔ گھبرائے گی زینب۔ لیکن آپ کی زبان میں اس کا ترجمہ مشکل ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ ضرور ہو سکتا ہے۔ ان دونوں زبانوں میں زیادہ فرق نہیں۔ اس کو اسٹیج پر میں پیش کروں گا۔"

جو PASSION PLAY ہم نے جرمنی میں دیکھے پچھلے سال۔ اسی میڈیول سیٹنگ میں ——— "ایک اداکار نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن انسان کے کرب کو آخری وقت کے کرب کو موت کا سامنا کرنے والے کے کرب کو اسٹیج پر پیش کرنا مشکل کام ہے۔ اس کرب کو وہی جانتا ہے کیونی کیٹ نہیں کر سکتا کیونکہ مر جاتا ہے ——— "ڈرامہ نگار جوشیلی آواز میں بولا ——— "سنیے میری اس تمثیل کا ایک مکالمہ ہے ——— "

ساری دنیا کے جدید تھیٹر کے قہوہ خانوں کی طرح یہاں بھی جوشیلی بحثیں جاری تھیں۔

"ایک اور بند سنیے" ڈرامہ نگار سے کہا" جناب قاسم شہید ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔ ان کی دلہن کہتی ہے۔ رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو۔ تم چھوٹتے ہو عالم تنہائی ہے اس پر تم چھوٹتے ہو۔"

ناسور ڈرامہ نگار بڑے دھیان سے سُنا کیا۔

ناظرین و سامعین یہ ایک ایسا PASSION PLAY چار سال سے جاری ہے جس

پھانسی سے لٹکتی لاشوں کی تصویروں کی بھی عادت۔

وہ تصاویر جن کا آپ نے ذکر کیا مندرجہ بالا سطور میں۔ وہ بھی ہیں لیکن موخرالذکر تصاویر اور خبریں سفید جھوٹ۔ جعلی۔ فرضی۔ بہتان۔ مغرب کا جھوٹا پروپگنڈہ آپ شیطان کی ایجنٹ ہیں۔

اس مشہور سائنس داں نے ایک بار بڑے چاؤ سے اپنے پوتوں پوتیوں کی تصاویر دکھلائی تھیں وہ بھی آہنی الماریوں میں دراز ہے۔ اور وہ مادام۔

ان مادام کی ولا میں پھول ہی پھول تھے۔ اندر نفیس الماریوں میں فلسفہ، تعلیم کی فرنچ کتابیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی رپورٹیں۔ نماز پڑھ کر سالوںؔ میں آ ئیں۔ میں نے اپنی ساری عمر تعلیم نسواں کے فروغ کی جدوجہد میں گزاری ہے۔ ہماری پائنیر خواتین نے رجعت پسندوں کا مقابلہ کیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں تاکہ ہماری لڑکیاں پڑھ لکھ سکیں۔ یہ ان کی دھندلی تصاویر دیکھیے۔ آج سے ساٹھ ستر سال قبل انھوں نے۔

دریچے کے باہر سیب سے لدا درخت سرسرایا۔ سالوںؔ کی دیوار پر اس کی ٹہنیوں کا سایہ لرزاں تھا۔ ایک ٹہنی پر ایک بلبل آ بیٹھی۔ آگست رینوئر کی ایک بڑی پینٹنگ کے عین مقابل جنگل کی کھلی فضا میں دوڑتی بچیوں کی اس تصویر پر سیب کی شاخوں کا سایہ متحرک وہ خوب صورت دیوار اچانک صحن زنداں کا کھردرا نیچا خون آلود پشتہ۔ اب مادام اس سے لگی کھڑی ہیں۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی۔ گولیوں کی باڑھ۔ پل کی پل میں بجلی صراط۔

مادام کی ولا سے کچھ فاصلے پر وہ فن کاروں کا قہوہ خانہ تھا۔ اس قہوہ خانہ میں ایک شام اس نامور ڈرامہ نگار نے اپنی نئی تمثیل کا پلاٹ سنایا تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ٹیلی ویژن پر جدید PASSION PLAY دکھلایا جارہا تھا۔

"ہمارے ہاں دو زبردست ڈرامہ نگار تھے۔ اینسؔ و دبیرؔ۔ اگر ان کے مراثی کو اسٹیج

کیا جاتا۔ ایک اور پرانے شاعر کا نوحہ سنیے۔" اس ڈرامہ نگار سے کہا۔

کیا جانیے کیا کیا ابھی دُکھ پائے گی زینبؑ۔
گھبرائے گی زینب۔ کیسا یہ بھرا گھر ہوا برباد الٰہی۔ کیا آئی تباہی۔"

نامور ڈرامہ نگار مبہوت ہو کر سنتا رہا۔

"پوچھیں گے جو سب لوگ کہ بازو کو ہُوا کیا۔ یہ نیل ہے کیسا — کس کس کو نشاں رسّی کے دکھلائے گی زینب۔ گھبرائے گی زینب۔ لیکن آپ کی زبان میں اس کا ترجمہ مشکل ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ ضرور ہو سکتا ہے۔ ان دونوں زبانوں میں زیادہ فرق نہیں۔ اس کو اسٹیج پر میں پیش کروں گا۔"

جو PASSION PLAY ہم نے جرمنی میں دیکھے پچھلے سال۔ اسی میڈیول سیٹنگ میں — "ایک اداکار نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن انسان کے کرب کو آخری وقت کے کرب کو موت کا سامنا کرنے والے کے کرب کو اسٹیج پر پیش کرنا مشکل کام ہے۔ اس کرب کو وہی جانتا ہے کیونی کیٹ نہیں کرسکتا کیونکہ مرجاتا ہے — "ڈرامہ نگار جوشیلی آواز میں بولا — "سنیے میری اس تمثیل کا ایک مکالمہ ہے —"

ساری دنیا کے جدید تھیٹر کے قہوہ خانوں کی طرح یہاں بھی جوشیلی بحثیں جاری تھیں۔

"ایک اور بند سنیے" ڈرامہ نگار سے کہا" جناب قاسم شہید ہونے کے لیے جارہے ہیں۔ ان کی دلہن کہتی ہے۔ رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو۔ تم چھوٹتے ہو عالم تنہائی ہے اس پر تم چھوٹتے ہو۔"

نامور ڈرامہ نگار بڑے دھیان سے سُنا کیا۔

ناظرین و سامعین یہ ایک ایسا PASSION PLAY چار سال سے جاری ہے جس

میں اُن گنت بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے عیسیٰ کے اور حسینؓ کے PASSION یہ PASSION کیا بلا ہے؟ جنونِ عشق ہے؟

جی ایسا ہے کہ عیسیٰ کی صلیب پر جانکنی کے کرب کو PASSION کہا جاتا ہے۔

اوہ۔ آئی سی۔ مگر آپ اتنی مغربی اصطلاحات کیوں استعمال کرتی ہیں۔

اس نامور ڈرامہ نگار کی شادی ہو رہی ہے۔ کمرے میں رشتہ دار۔ مہمان۔ مولوی۔ گواہ۔ سفید عروسی لباس میں دلہن۔

دروازے پر دستک۔

رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے۔

آنکھوں پر سیاہ پٹی سدھارو۔ ایک ایک گھٹنا زمین پر ٹیکے بندوقچیوں کی قطار گولیوں کی باڑھ۔ سدھارو۔ تم چھوٹتے ہو عالمِ تنہائی۔ خون میں غلطاں تڑپتی ہوئی لاش کھڑنجی دیوار کے نیچے۔ واجب القتل تھا۔

دیوار کے نیچے PASSION PLAY

سفید جھوٹ ــــــ سراسر غلط ــــــ مغرب کا جھوٹا پروپگنڈہ، بہتان، اخوان الشیاطین کا افترا۔

نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کی قطاریں گردنوں سے جھولتی۔ مہ ناز بھی گردن سے جھولتی۔ مہ ناز؟ وہ تو سان فرانسسکو سے جوش و خروش کے ساتھ واپس گئی تھی۔ بے غرض تعمیرنو۔

صبح منہ اندھیرے JOGGING کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ سر جھکا۔ آنکھیں اُبلی زبان باہر، پاؤں بندھے۔ ہاتھ پشت پر رسی سے جکڑے حرے سے لٹک رہے ہیں۔

ایک صبح دو کھلاڑی لڑکیوں کے مُردہ چہروں پر سے سفید ٹوپ اُتارتے ہوئے جلاد انہیں پہچان گیا۔ وہ ایک حاملہ عورت کے ساتھ ایک قطار میں آویزاں تھیں۔ چند سال قبل ہزار ہا کھلاڑی لڑکیوں لڑکوں کے ساتھ انھوں نے بھی اسٹیڈیم میں اتھلیٹکس کے کرتب دکھلائے تھے۔ ROMAN RINGS پر نوجوانوں نے اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ سب ایک لائن سے آویزاں۔ اس رات پھانسی گھر کے اس انچارج کو عظیم الجثہ کابوس نظر آئے۔ جیسے مقتل میں مُردوں کے اولمپکس ہو رہے ہوں۔ پھانسیوں کے پھندے وہ ROMAN RINGS کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ قلابازیاں کھاتے، قلانچیں بھرتے، جنگلے پھلانگتے سرپٹ دوڑتے مُردہ لڑکے لڑکیاں۔ انواع واقسام کے کابوس۔ دراز قد سیاہ پوش جنات، سفید فام جنات۔ جو کبھی اپنی پلکیں نہیں جھپکاتے۔ کابوس۔

شام کا وقت جھٹ پٹے کا بڑا ہی ڈپریسنگ ہوتا ہے گھر کے اندر اور باہر بھی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے لوگوں کا دم گھبراتا ہے اس کی وجہ ایک اللہ والی بی بی نے یوں بتلائی تھی۔ فرمایا مرنے والے کو چاہے وہ صبح صادق کے وقت دنیا چھوڑ رہا ہو، بھری دوپہر کی تیز دھوپ میں، عالمِ نزع میں اسے لگتا ہے جیسے دن رات مل رہے ہیں۔ جھٹ پٹے کا وقت ہے۔ فانی زندگی میں روزانہ جب دن رات ملتے ہیں آدمی کو ڈپریشن ہوتا ہے۔ ہلکا سا نامعلوم خوف اور اُداسی اور دہشت، خفیف سی۔ کیونکہ اس کی روح پہچان جاتی ہے وہ آنے والا عالمِ نزع یاد کرتی ہے۔ آخری لمحات کا جھٹ پٹا جب زندگی کی روشنی موت کی تاریکی میں ڈوبے گی۔

وہ اس جھٹ پٹے کو پار کر کے لٹک رہے ہیں یا کنکریٹ دیواروں تلے اوندھے پڑے ہیں۔ ڈھیریوں کی شکل میں سرد زمین پر۔

سرسوتی زیرِ زمین بہنے والی جو پہلے محض تیسری آنکھ رکھنے والوں کو نظر آتی تھی۔ سیاہ دھاروالی سرسوتی اوپر نکل آئی۔ بڑے بڑے چنگھاڑ دکھلانے والی سیاہ ندی۔ اس کی موٹی گدلی سیاہ

دھارائیں زیرِ زمین بہہ کر کہیں سے کہیں جاری ہیں۔ اندر ہی اندر کہیں سے کہیں —— بہہ کر پہنچنے والی بڑے بڑے چمتکار دکھلانے والی سرسوتی۔

اس کے کنارے کنارے کہیں پر تخت کہیں پر تختہ۔

بے پناہ دولت بہ طور مالِ غنیمت آئی تھی۔ اسے دیکھ کر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا تھا زر و جواہر اور سونے اور چاندی کے اس انبارِ کثیر میں مجھے امّت کی تباہی نظر آرہی ہے۔

حرے سے لگ رہے ہیں، غمِ دوراں سے آزاد۔ قطعی شاعری نہیں بالکل LITERAL واقعہ یہ ہے کہ جہاں وہ ہیں وہاں دار و رسن کی ——

اپنے اپنے ملک کی رسم ہے کہیں رستہ کہیں خنجر، کہیں چھرہ، کہیں تلوار۔ پہلے گیس کا دستور تھا۔

ہزاروں مرتبہ کے اذکار میں سے ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ صنوبروں کے اس گھنے جنگل میں آدھی رات کو ایک بند ٹرین آن کرزکی۔ اس کے مہیب سیاہ انجن کی آتشیں روشنی سے جنگل زرد پڑ گیا۔ انجن شائیں شائیں کر رہا تھا۔ سنیے۔ وہ ٹرین ہوتی ہے نا جس میں مویشی لے جائے جاتے ہیں۔ وہ اسی قسم کی ٹرین تھی۔ لیکن جب وہ اس سنسان چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر آن کرزکی تو ایک گارڈ نے سُرخ لالٹین کی روشنی میں اس کے پٹ کھولے اور اس میں سے انسان نمودار ہوئے۔ ان کو اُتار کر باہر کھڑے بند ٹرکوں میں سوار کرایا گیا۔ ان سب کے ساتھ ہولڈال سوٹ کیس، اٹیچی کیس، ٹوکریاں، کتابوں کے بنڈل اور وائلن کے کیس تھے۔ جن کو انھوں نے بڑی دقت سے خود اٹھا رکھا تھا۔ عورتوں کی گودوں میں اور کندھوں پر ننھے بچے۔ کچھ بچے اپنی ماؤں یا دادیوں نانیوں کی انگلیاں تھامے چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چل رہے تھے۔ شدید سردی کی وجہ

سے قافلے والوں نے کنٹوپ اور مفلر اور اوورکوٹ پہن رکھے تھے اور ان کے منہ سے جو بھاپ نکل رہی تھی وہ ریلوے اسٹیشن کی مدھم روشنیوں میں صاف نظر آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک پورے محلے کی آبادی ہجرت کر کے کہیں جا رہی ہے۔ وہ سب آپس میں فس بول بھی رہے تھے۔ چند ایک نے سردی فراموش کرنے کے لیے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ پیشہ ور موسیقار معلوم ہوتے تھے۔

بڑی برفیلی رات تھی۔ کہرہ پڑ رہا تھا۔ جنگلوں میں تیز ہوائیں سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ ان میں دور سے آتے ہوئے شوپاں کے سُر بھی مل گئے تھے۔ جو بہت فاصلے پر کسی تفریح گاہ میں بجائے جا رہے تھے۔

یہ وہی گھنے خوب صورت پُر فضا رومینٹک جنگل تھے جہاں پچھلی صدی میں گرِم برادران نے پریوں کی کہانیاں ڈھونڈی تھیں اور جہاں سب سے پہلے "خاموش رات مقدس رات" کے سُر گونجے تھے۔ جب ننھے منے جرمن بچے لالٹین سنبھالے گھر گھر جا کے دروازوں کے باہر برف باری میں کھڑے ہو کر یہ نغمہ الاپتے تھے۔ یہیں سے ولادت مسیح کا وہ گیت مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر ساری دنیا میں گایا گیا تھا۔ SILENT NIGHT HOLY NIGHT جو آج تک گایا جاتا ہے۔

اس خاموش رات میں ٹرک ایک میدان میں پہنچ کر ایک بڑی عمارت کے سامنے جا رکے۔ مردوں نے عورتوں لڑکیوں اور بچوں کو اُترنے میں مدد دی۔ سپاہیوں کی قیادت میں برف پر چلتے وہ عمارت کے بیرونی ہال میں داخل ہوئے۔ اپنے شہر سے روانہ ہوتے وقت ان سے کہا گیا تھا کہ ان کو ایک حفاظتی کیمپ میں چند روزہ قیام کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ جہاں سے کچھ عرصے بعد ان کو واپس ان کے گھروں کو بھیج دیا جائے گا۔ وہ سب یونیورسٹیوں کے پروفیسر، قانون دان، فلسفی، ماہرین لسانیات، سائنس دان، موسیقار اور ادیب تھے اور ان کی بیویاں اور بچے اور ماں باپ دادا نانا پورے کنبے۔

ہال میں ان سے کہا گیا کہ آپ سب غسل کر لیجیے اس کے بعد آپ کو آپ کے کمروں میں

پہنچا دیا جائے گا اور قہوہ اور ڈنر پیش کیا جائے گا۔ بوڑھے پروفیسروں نے فوراً وہیں ایک میٹنگ بلائی اور اپنے تین بزرگ ترین نمائندے چنے وہ تینوں اولڈ ورلڈ کرٹسی کے ساتھ کیمپ کے انچارج کے پاس گئے اور اس سے مودبانہ درخواست کی "ہم سب کو ایک ایک پیالی گرم کافی پہلے پلوا دیجیے اس کے بعد ہم لوگ غسل کریں گے بڑی سردی ہے"۔ ایک معمر ماہر لسانیات جسے زکام ہو رہا تھا زور سے چھینکا اور فوراً معذرت چاہی۔

متبسم اور خلیق کمانڈنٹ نے اسی اخلاق سے جھک کر جواب دیا "جی نہیں! پہلے غسل بعد میں کافی۔"

وہ سب دو بڑے بڑے کمرے میں لے جائے گئے۔ مرد ایک طرف۔ عورتیں دوسری طرف۔ جہاں انھوں نے اپنے کپڑے اُتارے۔ بچوں نے گیلری میں اپنے ننھے ننھے جوتے اُتار کر سلیقے سے ایک قطار میں رکھے۔ کنٹوپ اور دستانے، کوٹ اور کپڑے اُتار کر کھونٹیوں پر قرینے سے ٹانگے، جس طرح ان کو ان کے گھروں پر اور اسکولوں میں سکھلایا گیا تھا۔ کپڑے اور جوتے اتارتے وقت بچے آپس میں ہنستے اور لڑتے بھی جاتے تھے۔ ایک بچے نے اپنی ننھی بہن کی چٹیاں کھینچیں۔ ایک بڑی لڑکی نے اسے ڈانٹا۔ نرسوں کی سفید پوشاک میں ملبوس چند فربہ عورتیں اندر آئیں اور ان سب کو ہنکال کر ایک بڑے ہال میں لے گئیں۔ مرد اور عورتیں دوسرے دروازوں سے اس ہال میں داخل کیے گئے۔ پھر سارے دروازے بند کر کے گیس کے سلنڈر کھول دیے گئے۔

چالیس سال بعد ان مظلوم دانش ور بوڑھوں اور فن کار نوجوانوں اور معصوم بچوں کے رشتے دار جو اور جگہوں پر زندہ بچ گئے تھے انھوں نے ——————

وہ پہاڑیاں بے حد حسین ہیں جن پر سیدارا گئے ہیں۔ وہاں خلیل اپنے المصطفیٰ کے لیے گیت لکھتا تھا۔ نیلا سمندر اور سرسبز کوہسار۔ اور افسانوی قلعے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے کے اور جدید ترین جھل جھلاتی عمارتیں۔

کوفے سے ایک ناقہ سوار۔

گیس میں نہانے والوں کی باقی ماندہ اولاد اور ان کے باقی ماندہ رشتہ داروں کی اولاد اور پوتے پوتیاں نواسیاں نواسے طیاروں کے پرے بنا کر آئے۔

ناقہ سوار آیا نا گہاں

مرجی بمبار، ھنتری بکتر بند دستے۔ آئیے۔ ان لشکروں کے نام رکھیں۔ ابوالحوق، ازرق، نوفل، ابن زیاد، سنان بن انس، حنظلہ، خولی۔ انھوں نے خوشنما بم گرائے جنھیں معصوم بچوں نے کھلونے سمجھ کر اٹھایا اور بھسم ہوئے رافع، مرہ۔ معراج ابن غالب۔ بکتر بند دستے۔ بمبار طیارے۔ مشین گنیں۔ صرصر کا ادھر طور ادھر راکھ کا عالم۔

1980 عیسوی میں دجلہ کے کنارے ہارون الرشید کے شہر میں ایک فلم بنائی گئی تھی۔ جنگ قادسیہ کی فتح کے متعلق نہایت جوشیلی فلم قوم پرستی کے غرور میں شرابور ساتویں صدی عیسوی کی اس قومی فتح کے متعلق جس میں انھوں نے آل ساسان کو شکست فاش۔

دجلہ کے کنارے نوجوان لڑکیاں اپنے مرحوم باپوں، شوہروں، بھائیوں، بھتیجوں کے سوگ میں سیاہ ماتمی پٹیاں بازوؤں پر باندھے۔ راہ گیروں کے ہجوم میں جابجا نظر آرہی ہیں۔ ان سوگواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ محاذ جنگ سے لائے ہوئے فوجیوں کے تابوتوں کا جلوس روضۂ حسینؓ میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ قومی پرچموں میں ملفوف ان جنازوں کا مزارِ امامؑ کے گرد طواف کرایا جاتا ہے۔ قبرستان قبروں سے بھر گئے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی۔ ننھے بچے اسکول کے کمسن لڑکے بندوقیں دے کر محاذ پر بھیجے جارہے ہیں۔ دونوں طرف سے واجب القتل ہیں۔

قرطبہ ہند میں مسجد کے پھاٹک پر ایک پوسٹر چسپاں ہے۔ ایک پیاری بھولی ننھی بچی ردا میں لپٹی۔ ہاتھ میں مشین گن سنبھالے کھڑی ہے۔

اس جگہ پر سورج ڈوبنے کا سماں بے حد سہانا معلوم ہوتا ہے (لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب) مسجد کو جانے والا ایونیو گھنے سایہ دار درخت سرسبز میدان۔ کرکٹ پویلین، محرابوں

والی ایک پرانی عمارت جس کے کمروں میں ان بزرگوں کی دھندلی تصاویر آویزاں ہیں جنھوں نے عالم اسلام کی تجدید و اتحاد کے خواب دیکھے۔ حسین مسجد (تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل) کے صحن میں اس مرد خدا کا مزار۔ مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ۔ عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام (اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب، عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل)

وہ ساری دھندلی تصاویر کن لوگوں کی ہیں؟

ابھی تھے مر مرا گئے کب کے۔

مسجد کے پھاٹک کے پوسٹر پر وہ ننھی بچی مشین گن سنبھالے۔

فلسطینی بچی ہے؟

جی نہیں غور سے پڑھئے۔ نیچے عبارت عربی میں نہیں۔

ایک بارلش ہندی نوجوان پوسٹر پر فخریہ نظر ڈالتا نماز کے لیے مسجد کے اندر چلا جاتا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی۔ واجب القتل ہیں۔

قرطبۂ ہندفی الوقت مشرق کی بہترین اور برصغیر کی متمول ترین درسگاہوں میں سے ایک ہے۔ سرسبز و شاداب نئے لو بلیے ترو تازہ اُپ بنوں اور چمن زاروں سے معمور۔ اس کے ایونیواب یوکلپٹس کی خوشبو سے مہکتے ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب ستارہ سحری اور گل اشرفی کے تختے لہلہا رہے ہیں۔ گل مہر اور املتاس اور ساگوان اور کیثر درنا اور اکیشیا اور شیشم اور چینی چمپا کی فراوانی سے یہ درسگاہ رشک فردوس ہے (تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز۔ اس کے دلوں کی تپش اس کے دلوں کا گداز) اس کا کتب خانہ مشرق کے عظیم ترین کتب خانوں میں شامل نئی عالی شان عمارات اور افسانوں اور روایات سے معمور اس کی سرخ پرانی عمارتیں۔ اور اس کے ان گنت نئے بنگلے۔ اور اگر کیمپس کے باہر کے ڈھابوں اور شکستہ سڑکوں اور مدقوق بوڑھے اور کمسن رکشہ

والوں کو (ان کی امیدیں قلیل) جھاڑ دے سمیٹ کر قالین کے نیچے سرکا دیا جائے تو بے شک۔ بے شک ہر صبح ہے صبح مصر یہاں ہر شب ہے شب شیراز یہاں۔ سینکڑوں بیرونی لڑکی لڑکا جوق در جوق یہاں پہنچ کر یہاں کے اٹھارہ ہزار لڑکی لڑکے کے انبوہ کثیر میں شامل ہو جاتا ہے اور وہ جو ایک دور افتادہ سطح مرتفع کے دامن سے آئے تھے اور مخالفین میں سے ہیں۔ ان میں سے چند ایک ریفیوجی اسٹیٹس مل گیا ہے۔ ان کو پانچ سو روپیہ مہینہ یو این او سے ملتا ہے اور وہ نہیں جانتے کہ یہاں سے کہاں جائیں گے۔ واجب القتل ہیں۔

بہت سے اپنے گرم کوٹ اور دوسرا سامان فروخت کر کے گزر کرتے ہیں اور وہ فلسطینی جو مرجئی اور معتزی حملے کی اطلاع ملتے ہی اپنی کتابیں اور اسباب فروخت کر کے دفاعی جنگ میں شامل ہوئے۔ دوسرے روز یہاں سے روانہ ہوئے اور وہاں نہ پہنچ سکے یا پہنچ گئے تو مارے گئے۔ وہ خوب صورت اور ذہین فلسطینی نوجوان بڑی مصیبتوں سے پیسہ حاصل کر کے یہاں پڑھنے آئے تھے۔ اور وہ جوشیلے طاقت ور جو کٹر در واجب القتل مخالفین کو مار ڈالتے ہیں دونوں اپنے اپنے نوجوان شہیدوں کی تصاویر کے پوسٹر لگاتے ہیں اور —— دیواروں پر لکھتے پھرتے ہیں۔ مرگ برفلاں۔ مرگ برفلاں —— مرگ بر ——

آج کی نسل اس 'مرگ' سے مسحور ہے۔ ان سب کو مرگ پسند اور BRUTALISE کس نے کیا۔ آپ نے۔ اور آپ نے۔ اور آپ نے۔ آپ سب مجرم ہیں۔ راحت کے گلوں کو بلا پو چھ رہی ہے۔ واجب القتل ہیں۔ بستی کے مکانوں کو فنا پو چھ رہی ہے۔ سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ تقدیر اپنی عمر قضا پو چھ رہی ہے۔ قتل کر دیے گئے۔ ان نوجوانوں کی مرگ طرح طرح کے بھیسوں میں آ رہی ہے۔ بندوقچیوں کی باڑھ۔ شہری فساد کا ہنگامہ۔ پولیس کا "اِین کاؤنٹر" اور خانہ ساز پستول (مجھ کو تو خانہ ساز دے) اور کیسری وردیوں میں ملبوس پریڈ کرتے نوجوان ان سب کو اور ان مرجیوں اور معتزیوں کو جن کے باپ دادا خود مظلوم شہید ہوئے ان سب کو کس نے

BRUTALISE کیا۔ آپ نے اور آپ نے اور آپ نے۔ آپ سب مجرم ہیں۔

کون سب ——؟

خلفائے اندلس کا آیات قرآنی سے منقش قصر الحمرا اب ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ اس کے ایک کمرے میں دیوار پر کندہ قرآنی آیات کے عین نیچے بار ہے۔ نہ صرف یہ کہ آج تک کسی مسلم حکومت نے یا کسی مسلم ملک کی مذہبی اسلامی جماعت نے اسپینش گورنمنٹ سے اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا کہ کم از کم وہ شرابخانہ اس جگہ سے منتقل کر دیا جائے بلکہ نئے ارب پتی کلمہ گو جوق در جوق وہاں جاتے ہیں۔

ریاست مہاراشٹر کے شہر اکولہ میں مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم نے حکم دیا ہے کہ مسلمان عورتیں سنیما نہ دیکھیں۔ خلاف شرع ہے (مردوں کے لیے خلاف شرع نہیں) تو اکولہ میں ایک بے چارے میاں بیوی سنیما دیکھنے گئے۔ ان غیور اور خداترس نوجوانوں نے بیوی کی ناک کاٹ لی۔ میاں کی زبان کاٹی اور آنکھیں پھوڑ دیں۔ جزاک اللہ۔

آنکھیں تو خیر بہار میں بھی پچھلے دنوں کافی پھوڑی گئی تھیں۔ شعلے سے استفادہ کر کے ڈاکو صاحبان پورے پورے کنبے کو بھونے ڈال رہے ہیں۔ اچھا بتایئے آپ کس قسم کی اعضا تراشی اور اذیت اپنے لیے پسند فرمائیں گے آپ کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں؟ یا ناک کاٹی جائے؟

اعضا تراشی بھی اچھا لفظ ہے۔

پہلے کیا بادشاہ لوگ آنکھوں میں نیل کی سلائیاں نہیں پھرواتے تھے۔

ع سیر ے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔

تو یہ بے چارے جو مر جاتے ہیں (ہم تو کبھی مریں گے ہی نہیں) ان کی روحیں یا جو کچھ وہ

ہے یا نہیں ہے وہ آس پاس منڈلاتی ہیں یا خلا میں تالہ کناں رہتی ہیں۔ اتنا بڑا خلا۔ اوفوہ۔ "بلیک ہول"۔ کروڑوں اربوں نظام شمسی۔ ایک بے چاری چھوٹی سی ننھی روح کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ کہیں راستے ہی میں تحلیل ہو جاتی ہو گی۔

شہید ہوئے تو جنت ورنہ چاہ ہب ہب۔ ہم تو سیدھی بات جانتے ہیں۔

آپ کو ایک حیرت انگیز واقعہ سناؤں؟ وہ پارٹی ورکر تھی نا ایک زمانے میں کیلاش رانا۔

کیلاش اور اشیش رانا دونوں پارٹی ورکر تھے۔

بالکل وہی۔

اشیش تو مر مرا گیا کب کا۔

ہاں۔ وہ تو مر مرا گیا کب کا۔ وہی تو قصہ ہے۔ بڑا کامیاب ڈاکٹر تھا۔ ہارٹ اسپیشلسٹ وہ سوئیڈن گیا ہوا تھا۔ وہیں اچانک ہارٹ فیل۔ ان کے گھر میں بڑے نایاب مجسمے تھے۔ کاٹھیا واڑی دوار پال۔ ساؤتھ کے برونز اور زبردست لائبریری۔ اس بے چارے کی راکھ لا کر کیلاش نے ایک مرا کو لیدر کے کتاب نما صندوقچے میں اس کی عالی شان رائیٹنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ قلم دان اور گل دان کے پاس۔ اور خود پوجا پاٹ میں لگ گئی۔ اشیش کی موت سے قبل تک ملحد تھی۔ اب ایک کمرے میں ایک بڑا سا گن پتی اور انواع واقسام کی مورتیاں سجالیں۔ صبح شام پوجا۔ کسی نے بتایا کہ گڑگاؤں میں ایک بائی رہتی تھی۔ مینا کشی بائی پانڈورنگ۔ شاید اب بھی موجود ہو۔ میڈیم تھی۔

میڈیم؟

جی نہیں۔ میڈم۔ MEDIUM عامل۔ کیلاش فوراً اس کے پاس جانے کو تیار۔ کہا تم بھی ساتھ چلو۔ پتہ لے کر گنجان گڑگاؤں کی ایک جھال پال چال کا بوسیدہ چوبی زینہ طے کرتے چھٹے مالے پر اس کی کھولی میں پہنچے۔ وہ ایک معمر سیدھی سادی مراٹھی ہاؤس وائف نکلی۔ یہ بے چاری جس طرح ترکاری مچھلی بیچنے والیوں کو بلاتی ہو گی اس طرح کیا روحیں بلائے گی۔ چلو واپس۔ میڈیم تو وہ ہوتی ہیں تصویروں میں دیکھا ہے روسی ناموں والی پُراسرار نازک اندام حسینائیں۔ پیشانی پر ریشمی فیتہ۔ کانوں میں بالے۔ لمبی مخروطی انگلیاں دبیز قالینوں اطلسی پردوں سے آراستہ

نیم روشن کمرہ۔

چاروں طرف نظر ڈالی۔ میلی دیواروں پر گن پتی اور دتا تریہ کے پرنٹ۔ ایک پرانی آرام کرسی۔ ایک الماری۔ مکمل نچلے متوسط طبقے کے مرہٹوں کا گھر۔

لیکن وسط میں پلانچیٹ کی میز جو زندگی میں پہلی بار دیکھی۔ کیلاش رانا نے مینا کشی بائی کو بتایا کون ہے اور کیوں آئی ہے۔

مینا کشی بائی نے بتایا اس کا شوہر بڑا نامی میڈیم عامل روحانیت وغیرہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ یورپ بھی گھوم آئی تھی۔ عرصہ چالیس کا ہوا وہ مر گیا تب سے تنہا اس کمرے میں رہتی ہے۔ لاولد ہے تھوڑی سی آمدنی ہے۔ اسی میں گزر کرتی ہے۔ قانع اور پُرسکون۔ اس نے ایک گروپ فوٹو دکھایا۔ پیرس 1937ء۔ میڈیم لوگوں کی کانفرنس کا گروپ۔ وہ بھی ایک جوان لڑکی ریشمی کاشٹے میں ملبوس بیٹھی تھی۔ ساتھ مسٹر گوپال راؤ پانڈورنگ آنجہانی۔ دونوں میاں بیوی اسکول ٹیچر سے معلوم ہو رہے تھے۔ کیلاش مایوس نظر آئی۔ شاید ہم لوگ غلط خاتون کے پاس آ گئے تھے۔ یہ بے چاری کیا اشیش رانا جیسے دبنگ آدمی کی سرکش روح بلا پائے گی اور پہلی بات تو یہ کہ روح کا کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ پوجا پاٹ تو میں من کی شانتی کی خاطر کر لیتی ہوں۔

تب دیوار پہ ایک اور گروپ فوٹو گراف دکھلائی پڑا جس میں دھندلی دھندلی شکلوں کے بہت سے گورے فوجی وردیوں میں ملبوس ایک ہجوم کی صورت میں جمع کیمرے کو دیکھ رہے تھے۔ دھندلے، ہیولے سے۔ چند کی صورتیں ذرا نمایاں تھیں۔

مینا کشی بائی نے سادگی سے کہا فرسٹ ورلڈ وار جو ہوئی تھی نا بائی اس میں ایک برٹش پلٹن کے سارے فوجی فرانس کی ایک خندق میں ایک ساتھ ہلاک ہو گئے تھے۔ ایک یورپین میڈیم نے ایک کیمرہ ایسا ایجاد کیا تھا جو روحوں کے فوٹو کھینچ لیتا تھا۔ اس نے اس رجمنٹ کو خاص عملیات کے ذریعہ اکٹھا کر کے ان کا فوٹو لیا تھا۔

کیلاش چہرہ دوسری طرف کر کے مسکرائی۔ مینا کشی بائی نے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش نہیں کی اور آ کر پلانچیٹ کے گرد رکھی تین کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ میز پر انگریزی

حروف تہجی چھپے ہوئے تھے۔ ایک سے دس تک اعداد۔ اس نے کیلاش سے اس کا اور اس کے شوہر کا نام پوچھا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ کیلاش کو جس شناسا نے اس کا پتہ بتایا تھا وہ بھی اس سے نہیں ملی تھی۔ بائی کے پاس ٹیلی فون بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے کوئی منتر وتنتر نہیں پڑھا۔ آنکھیں بند کر کے چند سکنڈ چپ رہی اور پھر جس طرح بچے کو پیار سے اپنے پاس بلاتے ہیں اس نے کہا آ جاؤ۔ بیٹا اشیش رانا آ جاؤ۔ آ گئے؟ آ جاؤ۔ رانا جی اگر آ گئے ہو تو میز ہلاؤ۔ آ گئے نا؟ ایک دم ہوا کا تیز جھونکا سا آیا اور میز زور سے ہلی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے غور سے میز کے نیچے دیکھا۔ مینا کشی بائی نے کوئی برقی پنکھا ٹیپ ریکارڈر چھپا رکھا ہو۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ اب اس نے کہا۔ تم سوال کرو ٹھاکر صاحب جواب دیتے جائیں گے۔ کیلاش بولی "از اٹ ٹرو اشیش از اٹ یو؟" پنسل انگریزی حروف کی طرف سرکی۔ مینا کشی بائی اور کیلاش نے اس پر انگلیاں ٹکا رکھی تھیں۔ اس نے جو پیغام دیا وہ میں لکھتی گئی۔ اشیش انگریزی کے وہی الفاظ اور ایکسپریشن استعمال کر رہا تھا جو اس کی عادت تھی۔ (کیلاش وتی رانا کے تحت الشعور کی طاقت) نیچے گرگام کی سڑک کے ٹریفک کا بے پناہ شور وغل اور اشیش مہی پت رانا جس نے اسٹاک ہوم کے ایک اسپتال میں پران تجے تھے وہ "پران" گرگام کی اس چال میں موجود۔ اور اس طرح نارمل باتیں کرنے میں مصروف اور اس کی باتیں میں کاغذ پر جلدی جلدی اس طرح لکھتی جا رہی تھی جیسے ٹیلی فون پر کسی کا پیغام نوٹ بک میں لکھا جاتا ہے۔ نا قابل یقین۔ اچانک پنسل نے لکھا "KALLO " ARE A FOOL "YOU" اور جائداد کے کسی معاملے کے متعلق ہدایت۔ کیلاش نے بعد میں کہا اشیش کبھی کبھار اسے غصے میں پکارتا تھا۔ گو عرصے سے اس نے کلو نہیں پکارا تھا۔ (کیلاش رانا کے تحت الشعور کی زبردست طاقت)۔

کیلاش اس سے متواتر سوالات کر رہی تھی۔ وہ انگریزی میں زبانی "اس" سے کچھ پوچھتی اور پنسل رواں ہو جاتی۔ چند منٹ بعد اشیش نے حسب عادت ذرا ڈانٹ کر لکھا "مجھ سے زیادہ سوال نہ کرو میں اپنی اچانک موت کی وجہ سے اب تک بھونچکا ہوں۔ کیلاش نے پوچھا "تم وہاں کیا کرتے رہتے ہو" لکھا "ہم لوگ یہاں ARAYERS کرتے رہتے ہیں۔

بچارہ ہر یہ اشیش اور عبادت کر رہا ہے۔ العجب اور وہاں بھی کیا مختلف مذاہب کے الگ الگ عبادت خانے ہوں گے؟ کیا پتہ کنفیوژن میں آ کر اشیش کسی آسمانی چرچ میں جا کے عبادت میں جٹ گیا ہو۔ اس کو فرصت ہی فرصت ہے۔ اس نے چند گھریلو مسائل کے بارے میں کیلاش کو ہدایات دیں اور گڈ بائی لکھا۔ پھر ہوا کا جھونکا سا آیا۔ میز ہلی۔ مینا کشی بائی نے اس سادگی سے کہا "رانا صاحب گئے۔"

جائداد کے متعلق کچھ قانونی دستاویزیں اشیش جہاں رکھ گیا تھا وہ کیلاش کو نہیں مل رہی تھیں۔ پندرہ روز بعد وہ پھر گرگام پہنچی۔ اشیش نے لکھا "فلاں کاغذات فلاں الماری میں رکھے ہیں۔ فلاں وکیل کو بلا لینا"۔ وغیرہ۔ وہ سب صحیح نکلا۔ تیسری بار جب گئے اشیش نے اطلاع دی۔ "اب میں چوتھے لوک پر پہنچ چکا ہوں۔"

یعنی چرخ چہارم؟

مگر اشیش بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ وفات کے دو ماہ کے اندر اندر چوتھے لوک پر جا پہنچا۔ کہنے لگا کیلاش تمہارا ایہاتی گیانند بھی یہیں پر ہے۔ اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

"اب یہ بات ذرا عجیب سی ہے"۔ وہ خطرناک چوبی زینہ اُترتے ہوئے کیلاش نے اظہار خیال کیا۔

(گویا باقی باتیں عجیب نہیں تھیں) کہنے لگی کروڑوں اربوں تو آتمائیں پرلوک میں FLOAT کر رہی ہوں گی۔ بھیا اس بھیڑ بھڑکے میں اور اتنا بڑا تارامنڈل جس کا نہ اور نہ چھور۔ اسے کہاں مل گئے؟ گپ ہانک رہا تھا۔ پرلوک میں بھی اس کی گپ ہانکنے کی عادت نہیں چھوٹی۔"

چند روز بعد کیلاش کا لڑکا امریکہ سے واپس آیا۔ اس نے کہا "موم کن خرافات میں پڑی ہو۔ اپنا دماغ مت خراب کرو"۔ چنانچہ اس کے بعد وہ گرگام نہیں گئی۔

مینا کشی بائی پانڈورنگ فیس نہیں لیتی تھی اور کوئی اس کے ہاں جاتا بھی نہیں تھا۔ جانے کیا چکر تھا۔

مگر سوال جوں کا توں موجود ہے کہ سویڈن کے اس ہسپتال میں مرتے وقت بے چارہ

اشیش رانا کیا سوچتا ہوگا۔ اور وہ سب سولی چڑھنے والے اور گولی سے اُڑائے جانے والے اور جنگوں میں ہلاک ہونے والے ان کے آخری لمحات۔

فریق مخالف کی جو سب مرین 71 عیسوی کی جنگ میں ڈبودی گئی۔ ایک مرہٹی شاعرہ نے بحرِ عرب کے کنارے والی تفریحی سڑک پر سے گزرتے ہوئے کہا تھا" آج صبح یہ خبر پڑھ کر میرا حلق خشک ہوگیا جیسے میرے منہ میں ریت بھر گئی ہو——"

ٹھیک ہے لیکن وہ روحانی کیمرے کا قصہ بالکل فراڈ ہے۔

جو بات میں کہہ رہی ہوں وہ آپ لوگ سمجھے ہی نہیں۔

یعنی ذہن شوئی کے قائل——اچھا آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو عنقریب مارا جانے والا ہو۔ دہشت سے دماغ ماؤف ہوجاتا ہے۔ بعض ہسٹریکل ہوتے ہیں۔ ان کو انجکشن دیا جاتا ہے۔ بعض زار و قطار روتے ہیں اور دوزانو بٹھلا کر تلوار سے جن کی گردن اُڑائی جاتی ہے۔ بچوں اور بچیوں کا کیا حال ہوتا ہے؟ این فرینک تھی۔

ابھی وہ تو مر مرا گئی کب کی

بچے سامنے صحن میں کھیل رہے ہیں کچھ درختوں پر چڑھے اور امرود توڑ رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ گارجین کے بین الاقوامی ایڈیشن میں شاید ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے ایک اشتہار چھپا کرتا ہے۔ جنوبی امریکہ کی کسی فسطائی ریاست کے ایک ننھے مظلوم بچے کی تصویر اور کچھ اس طرح کا مضمون "انھوں نے میرے اماں اور ابا کو مار دیا باقی سب کو پکڑ کر لے گئے گھر میں میں اور بے بی اکیلے باقی بچے۔ میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا کیونکہ میں پانچ سال کا ہوں۔"

ایمنسٹی انٹرنیشنل سامراجیوں کی کمپنی ہے۔

تو آپ اس طرح کی ایک کمپنی خود بنائیے۔ اللہ نے چھپر پھاڑ کے آپ کو بہت دولت عطا کی ہے۔

ہم تو فلم بنانے والے ہیں۔ ولیپ کمار کو لے کر۔ وہ چڑے کے کروڑ پتی کاروباری دو

بھائی ہیں نا بشیر و ایاز۔ کیا دھانسو فلمیں بنا رہے ہیں دلیپ کمار کو لے کر۔

ململجی سیاہ سوتی ساڑی پہنے ایک برقعہ پوش خاتون، سُرخ جارجٹ کی کڑھی ہوئی ساری میں ایک نوجوان لڑکی برقعہ پوش، ایک منحنی سا آدمی، پلاسٹک کے بیگ میں زادِ راہ۔ باہر بچھلے بڑے پھاٹک پر رکشا سے اُترے۔ قصبے کی اس اٹھارھویں صدی کی محل سرا کے بائیں باغ سے گزرتے اندر آئے۔ سیاہ ساری والی خاتون نے سراسیمگی سے چاروں طرف دیکھا۔

بھائی راشد ہیں؟

وہ تو کینیڈا گئے ہیں مشاعرہ پڑھنے۔

اور بھائی انور؟

تشریف رکھیے۔ بھائی انور شہروں کے BEAUTIFICATION کے سلسلے میں آرکی ٹیکٹس کی ایک کانفرنس ہو رہی ہے —— کہاں ہو رہی ہے بھئی —— ؟ لاس انجلز میں۔

اچھا ایل اے میں؟ MY FAVOURITE CITY تو وہ تو صاحب وہاں گئے ہوئے ہیں۔ کہیے سب خیریت؟ آپ کے ہاں تو بڑی گڑبڑ رہی۔

سیاہ ساڑی والی خاتون نے بہت مایوسی سے چاروں طرف نظر ڈالی "سب کاروبار بند ہے۔ قینچی۔ کپڑا۔ ہر چیز کا کاروبار ٹھپ"۔ ساتھ والے منحنی شخص نے کہا "صبح دس بجے کرفیو کھلا تو بس پر بیٹھ کر آئے۔ ہمارا کارچوبی ساڑیوں کا کارخانہ ہے۔ سوچا دو ساڑیاں یہاں بک جائیں تو شام سے پہلے واپس چلے جائیں۔ چار بجے سے کرفیو پھر لگ جائے گا۔ دولہن وہ ساڑیاں تو نکالو۔"

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو بیچے مول۔

لڑکی نے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر پلاسٹک کا بیگ اُلٹا پلٹا۔

"ارے وہ تو گھر ہی رہ گئیں۔"

مایوس پریشان۔ سراسیمہ وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"واپس جاتے ہیں۔" آدمی نے کہا "خیال تھا یہاں سے اجمیر نکل جاؤں۔ یہاں نہ

بکیں تو وہاں بیچ لوں۔ اب چلو واپس۔"

"کھانا تو کھاتے جائیے"

"جی نہیں۔ وہاں کرفیو لگ جائے گا۔ چھ گھنٹے کا سفر ہے۔"

سنہری آیات قرآنی سے منقش شادی کا ایک سنہرا دعوت نامہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ لڑکی نے اسے آنکھوں سے لگا کر میز پر رکھا۔ پلاسٹک بیگ کی چیزیں سیٹ کر اٹھی۔ دونوں ماں بیٹیوں نے بُرقعے اوڑھے۔ وہ مایوس دل شکستہ پریشان حال قافلہ آہستہ آہستہ چلتا پھاٹک سے نکل گیا۔

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو بیچے سول۔

پڑوس میں پرسوں بڑی دھوم دھام کی شادی تھی۔ دوسرے شہر سے زبردست بارات آئی تھی۔ دولہا باقاعدہ جڑاؤ کلغی والا صافہ باندھے ہاتھی پر سوار دولہن کی کوٹھی پر پہنچا۔ بعد نکاح مقامی بینڈ نے "رمبا ہو ہو سمبا ہو ہو"۔ بجایا۔ دعوت ولیمہ تو نئی دہلی اشوکا میں کریں گے۔ دولہا کی بہن نے اطلاع دی۔

آپ کیا ایکسپورٹ کرتے ہیں۔

چند آئٹم سکرٹ ہیں ورنہ دوسرے تاجران کی نقل کر لیں گے۔ مگر زیادہ تر مغل اعظم اور الف لیلیٰ، علی بابا چالیس چور ٹائپ صراحیاں اور طشت۔ وہ زینت امان کی فلم تھی نا۔ علی بابا۔ یہ سامان باہر شیخ لوگوں کے لیے جاتا ہے۔ میرے بہنوئی کا کارخانہ فیروزآباد میں ہے۔ جھاڑ فانوس اور بلور کا دوسرا سامان وہ بھی زیادہ تر مڈل ایسٹ اور یورپ والوں کے آرڈر پر بنتا ہے۔

کوٹھی کے باہر چند نوعمر براتی سو سو کے نوٹ لیے جوا کھیل رہے تھے جو کاریں پھاٹک میں داخل ہوئیں ان کی نمبر پلیٹ پر آخری عدد جفت نکلا تو 100 میرے طاق نکلا تو 100 تمھارے۔ اپنے شہر میں بھی ان سب کا یہی مشغلہ ہے۔

ماشاءاللہ ان اضلاع میں مسلمانوں کے نئے تمول کے ساتھ تشدد بڑھ گیا ہے۔ سیاسی اور ذاتی منافشوں کی بنا پر بات بے بات ٹھنیں۔ قتل خون۔ نئی پکچروں کے نام نئے خون خرابہ، لوٹ مار،

خون کا بدلہ، انتقام، بدلے کی آگ۔

کیسری وردی والے لڑکے بھی صبح کو پریڈ شام کو یہ فلمیں۔ ان سب کو کس نے BRUT ALISE کیا ہے۔

آپ نے اور آپ نے اور آپ نے۔

فرمائیے آپ کس قسم کی اذیت اور موت اپنے لیے پسند فرمائیں گے؟ بڑی ورائٹی ہے۔ آج کل چند آئٹم سکرٹ ہیں۔

محل سرا کے پچھلے پھاٹک کے باہر بقرعید کی قربانی کے بکرے بندھے ہوئے تھے۔ اندر ایک شہ نشین میں فلمی گیت بج رہے تھے۔ ادھر کے کھیتوں کے پرے ایک عمارت میں تعزیہ بنایا جارہا تھا۔

دنیا کا بلند ترین تعزیہ۔ سو سال سے یہ ہر سال بنتا ہے۔ سنیوں کا تعزیہ ہے۔ اس کی تصویر کسی نے اخباروں میں کبھی نہ چھپوائی۔ صبح صبح ایک غریب کاشت کار عمارت میں موجود تعزیے کے بانسوں میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ غریب لوگ ہیں۔ سنی۔ ان کھیتوں کے وقف کی آمدنی سے ایک لاکھ روپے کے صرفے سے سال بھر تک یہ تعزیہ بنتا رہتا ہے۔ اس کے لیے انگریز کے زمانے میں ہیرسٹر صاحب مرحوم نے خاص طور پر اجازت لی تھی۔ عشرے کے روز بجلی کے تار اس کے لیے کھول دیے جاتے ہیں۔ آج تک۔ میرا ایک پہلوان دوست تھا پچھلے سال یہاں بھی آیا تھا مجھ سے ملنے۔ میں اسے تعزیہ دکھانے لے گیا۔ وہ یہاں آیا تھا دنگل میں اپنے وطن کی نمائندگی کرنے۔ واپس جاتے ہی پکڑا گیا اور گولی مار دی گئی۔

کیوں ــــــ؟

وہاں ہر کام رضائے الٰہی سے کیا جارہا ہے۔

خدا خود میر مجلس ــــــ؟

کیوں نہیں اور تو اور بفضل خدا سی پی آئی بھی سو فیصدی کی طرف دار ہے اور سی پی ایم خاموش۔

لینن گراڈ میں لینن کے دفتر کی دیوار پر ان لوگوں کی تصاویر ہیں جو انقلاب میں مارے گئے۔ گول گول عینکیں لگائے سنجیدہ شکلوں والے انٹیلکچوئل عورتیں۔ جھکی ہوئی مونچھوں والے فوجی۔۔ سویلین سب۔

تو۔۔۔؟

تو کیا کچھ نہیں۔ اچھا سوچئے آپ خود اگر زنداں میں ہوں۔ سب اجنبیں مستر د۔ صبح چار بجے دروازہ کھلا۔ فرض کیجیے آپ محض شدید مذاح اور ہمدرد ہونے کی بجائے اس مومن ملک کے شہری ہوتے اور کچھ ایسا اتفاق ہوتا کہ آپ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی۔۔ یا آپ کی بیوی بیٹی بھائی بہن۔۔ اس کی آنکھوں پر۔۔ مگر آپ ایک اور ملک کے شہری ہیں اور آرام سے دھوپ میں بیٹھے قہوہ پی رہے ہیں اور آپ کے کھیتوں میں ٹریکٹر چل رہے ہیں اور آپ کی زمینوں میں پتا کی کانیں نکل آئی ہیں۔

درست مگر اس دور سے پہلے جو ہزاروں کو مارا گیا۔ آپ نے اس وقت احتجاج نہیں کیا۔

آپ کو کیا معلوم کہ نہیں کیا۔

کسی نے نہیں کیا۔ رہی ایمنسٹی انٹرنیشنل تو وہ سامراجیوں کی جماعت ہے۔ معاف کیجیے گا کیا آپ بھی شیطان عظیم کی ایجنٹ ہیں؟

رمبا ہو ہو سمبا ہو ہو۔

آدھی رات کو ریڈیو پر عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ خلائے بسیط کے نقار خانے میں ہر

ایک اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ کوہستان چلتان کے پرے سرحد کے اس پار سے مغربی آرکسٹرا مغربی فوجی دھن پر رجز۔ جوشیلی تقاریر۔ ایک مرتبہ اسی زبان کی ایک گم نام نشرگاہ پر سوئی لگ گئی۔ فریاد فریاد فریاد۔ ہم مارے جارہے ہیں۔ سوئی لگنے ہی کی تو بات ہے۔ طاقت ور آواز پر سوئی لگ جاتی ہے۔ کمزور آواز پر نہیں لگتی۔ فریاد فریاد۔

استخوانوں کے لرزنے کی صدا آتی ہے قید خانے میں تلاطم ہے— کہ ہند آتی ہے۔ بالکل نہیں آتی۔ اب تک تو آتی نہیں۔ بدلی نگاہ بانوں نے چوکی، بجا پہر۔

تاریک خلا میں یہ آوازیں ایک دوسرے سے ٹکراتی نہیں یا JAM کردی جاتی ہیں۔ سب بلیک ہول ہے۔ سب ہوگئے خاموش اسیران نوحہ گر۔

وہ ہولناک شب وہ اندھیرا کہ الحذر۔ سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ استخوانوں کے لرزنے کی صدا۔

سزا دے دی گئی۔ واجب القتل تھے۔

جنگل جنگل صحرا صحرا رات کے اندھیرے اور دن کی چلچلاتی دھوپ میں جنگلی شہد کھاتا بھیڑ کی اون کا لبادہ پہنے یحییٰؑ جلتی ریت پر چلتا پھرتا۔ خبردار وہ آرہا ہے وہ آرہا ہے،

لکھا ہے حسینؓ نے دشت کربلا جاتے ہوئے چار ماہ کے کٹھن سفر کے دوران یحییٰؑ کو اکثر یاد کیا۔

نہایت سادہ و رنگین ہے داستان حرم۔

نجرانیوں کا ساتواں بیڑا نیلے پانیوں پر ہوتا ہے پھر رواں۔

وہ بڑا ہی حسین دیس ہے۔ ہرے بھرے کوہستان۔ سیدار کے جھرمٹ۔ خوب صورت مسجدیں۔ قدیم خانقاہوں کی راہداریوں میں سایوں کی مانند چلتے راہب رات کے آسمان پر پورا چاند باغوں میں صنوبر۔

صنوبر چاند کنول بارش پھوار گلاب مور چاندنی قمری بہار شمشاد۔

دیکھیے ان چیزوں کے نام بھی اردو میں لکھے ہوئے کتنے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔

گنگا جمنا سنگم۔

سنگم کے شہر میں پچھلے دنوں صنوبروں کے اس کوہ الم و وادیٔ محن کے محصور مظلوموں کی امداد کے لیے ایک جلسہ تھا۔ کچھ لوگ اس شہر کے بااثر مقتدر اہل ایمان کے پاس گئے۔ انھوں نے جواب دیا آپ لوگ افغان مجاہدین کے لیے کیوں نہیں جلسہ کرتے۔

گزشتہ سال لب آب گنگ بیچ جل ترنگ۔ پاٹلی پتر کے نکٹ۔ آستانہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے جوار میں سربریں بلند و بالا راج بھون کی چھت پر وہ مرد خود آگاہ دھوپ میں نیم دراز تھا۔ (سنیں گے میری صدا خان زادگان کبیر؟ گلیم پوش ہوں میں صاحب کلاہ نہیں) پوچھا۔ لالہ و گل سے تہی نغمۂ بلبل سے پاک اس منزل شاہین و چرغ اس کوہستان عظیم کی جہاں آپ مقیم ہیں۔ اصل صورت حال کیا ہے؟

فرمایا "بیٹی بے شمار مارے جا رہے ہیں جب وہ زندہ ہی نہ بچیں گے تو اس سے کیا غرض کہ — کہ زاغ رہے یا شمار ہے؟

دُکھ سے فرمایا "جوان مارے جا رہے ہیں۔ میں تو پوچھتا ہوں ان بے خانماں عورتوں کا کیا ہوگا وہ کہاں جائیں گی جن کے مرد بے دریغ مارے جا رہے ہیں۔"

رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو
گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو

فاقہ کش تشنہ دہن کشتۂ غم لٹتے ہیں
شور برپا ہے یہ رانڈوں میں کہ ہم لٹتے ہیں

دیکھو خونخوار عدو برچھیاں دکھلاتے ہیں
تیغ کھینچو کہ لعین گھر میں گھسے آتے ہیں

ننھے بچوں کا یہ عالم ہے کہ گھبراتے ہیں
گود میں ماؤں کی دہشت سے چھپے جاتے ہیں

گولیاں جو جسم میں سوراخ بناتی ہیں، روحیں اس میں سے یا قبر کے غار سے نکلتی ہوں گی یا راکھدان سے (معاف کیجیے بلیک جوک ہوگیا) کہاں جاتی ہیں۔ اگر وہ ہیں ماہرین مابعد الطبیعات جزویٹ فادرز۔ علما و صوفیا و یدانتیوں گیان مارگی جوگیوں JETSET رشیوں سے ایک مودبانہ سوال۔ کہاں جاتی ہیں جلدی بتایئے۔ گنہگاروں کے لیے چاہ ہب ہب۔ شہدا کی روحیں جا کر سدرہ و طوبیٰ کی شاخوں پر بیٹھ گئیں۔

قرطبۂ ہند کا ایک بوڑھا مونگ پھلی بیچنے والا تہجد گزار فصیح و بلیغ اردو بولنے والا ایک روز وثوق سے بتا رہا تھا۔ حوض کوثر کے کنارے جو جنتی پرندے بیٹھے رہتے ہیں جب ایک مومن کی دعا آسمان پر پہنچتی ہے وہ حوض میں غوطہ لگاتے ہیں۔ ان کے پروں سے جو بوندیں گرتی ہیں وہی دعائیں ہیں جو موتی بن گئیں۔

سامنے سے ایک بس آرہی ہے۔ گرد اڑاتی۔ ڈبائی کی سمت رواں۔ اس نے گھبرا کر اپنا ٹھیلہ ایک طرف کو کیا۔ دوسری بس گزرتی ہے لدی پھندی سجی سجائی۔ اس پر پوسٹر چسپاں ہیں RASHID WEDS JAMILA چھت پر جہیز کا بے تحاشا قیمتی سامان۔ یہ بسیں اور پوسٹر مسلمان کاروباریوں کے نئے تمول کے متعلق ہیں۔ سہالگ کا موسم گزر گیا لیکن ایک اور بس نکلتی ہے پوسٹر MOHAN WEDS KAMLA چھت پر جہیز کا بے تحاشا سامان۔ دلہن واجب القتل ہے۔

مجھ مفلوک الحال آدمی کو بھی یتیم نواسی کے جہیز میں ریڈیو سائیکل برقی پنکھا سب چیز دینی پڑی۔ لڑکا تو ہیرو موپیڈ مانگ رہا تھا۔ میں کتنا قرض لیتا؟ ٹھیلے والے نے کہا۔

درگاہوں پر بھیڑ۔ بس ایک کلر ٹی وی سیٹ۔ ایک وی سی آر، ایک پریمیر پدمنی کار کا سوال ہے بابا۔

پچھلے دنوں ہم پدمنی کے دیس گئے تھے کھچا کھچ بھری عوامی بس پر راستے میں پہاڑیوں کے قریب بس رکی۔ چند غریب ہندو عورتیں اتر کر تانگے میں بیٹھیں۔ تانگہ طویل سڑک پر پہاڑیوں کی سمت کھٹ کھٹ کرتا چل دیا۔ بس کے اندر ایک غریب ہندو عورت نے کہا "وہاں پہاڑیوں کی بیچ طرف بالاجی کا مندر ہے۔ کسی نے کچھ کیا ہو دھرا ہو سب وہاں اتر جائے ہے۔"

برابر کی سیٹ پر ایک بکر و قصاب رونق افروز۔ کلائی پر رنگین الیکٹرونک گھڑی۔ ہاتھ میں کیسٹ پلیئر۔ "یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے۔" بڑے انہماک سے آنکھیں بند کیے سُن رہا تھا۔ دوسری طرف ایک نوجوان فربہ لالہ جی۔ ایک برقعہ پوش عورت اور اس کا شوہر۔ رہبر کولر اور چمکیلی الیکٹرونک گھڑیوں سمیت۔ وہ سب گانا سننے میں مشغول تھے۔ بالاجی کے نام پر لالہ جی متوجہ ہوئے بولے "ایک یہ بالاجی کا مندر جب حکم ہوتا ہے تبھی کوئی ان کے دوار پہنچ

سکتا ہے۔ اور ایک"

"دشمنوں نے ہزاروں مَن گھی جلوا ڈالا پر بائی ٹس سے مس نہ ہوئی۔" سفید مونچھوں اور بھاری پگڑ والے ایک بوڑھے نے کہا۔ اس نے کانوں میں سونے کی مندریاں پہن رکھی تھیں۔

"دیوی کا پردان ہے۔ مہارانی سے چکی پسوادی۔" لالہ نے کہا۔

قصائی نے جانکاری سے سر ہلایا۔ "خواجہ صاحب کے دربار میں حاضری دیویں ہیں بہنّہ۔"

"نیم والے بابا کے دھورے منتریوں کی موٹریں پہنچ گئیں۔ الیکشن آنے والا ہے۔"

"بادشاہی کھیل ہیں۔ ذرا راجپوت فلم کا گانا لگیو ماسٹر۔ تیری گلی سے جب میں نکلا۔"

"نیم والے بابا بڑے غصیلے آدمی ہیں ڈانٹ دیں تو سمجھو بیڑا پار۔"

"آدمی — ؟ ذرا زبان سنبھال کر بات کرو لالہ۔ اتنے بڑے اولیا اللہ کو آدمی کہو ہو، جلالی بزرگ کہو۔" بکر صاحب نے طیش سے جواب دیا اور دوسرا کیسٹ لگایا۔ آنکھیں بند کر لیں۔

"تیری گلی سے جب میں نکلا سب کچھ دیکھا بدلا بدلا میرے سنگ سنگ آیا تیری یادوں کا میلہ — تیری یادوں کا میلہ۔"

پنک سٹی کے ایک بازار میں مغلیہ پوشاک میں ملبوس چند طویل القامت مسلمان عورتیں بے پردہ۔ سرخ نیم جامہ۔ نیلی پشواز مغل راجستھانی تصاویر میں سے گویا کود کر باہر آ گئیں۔ سڑک پر چلی جارہی ہیں۔ مزید اسی حلیے کی عورتیں جگہ جگہ۔ اے لو وہ تو سینما گھر میں گھس گئیں نہ ان کو ناک کان کٹوائے جانے کا ڈر نہ خوف خدا۔ یہ کون لوگ ہیں دوستو یہ کون سا دیار ہے — ؟"

"نیل گر قوم۔ سابق میں۔" دوکان دار نے لاکھ کے مینا کاری کڑوں کا بنڈل بناتے ہوئے جواب دیا۔ "راجگان مغل دار السلطنت سے ان کے اجداد کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہاں کی ساری مشہور صنعتیں بندنی، چھپائی، مینا کاری، سب ہم اہل اسلام کاری گروں کے آبائی پیشے ہیں — وہ دیکھیے راج ماتا تشریف لے جارہی ہیں۔ آپ نے مینا کاری کے تعزیے دیکھے ہیں؟ اب کے محرم پر تشریف لائیے۔ یہاں کا محرم بہت شاندار۔ راج ماتا گائتری دیوی کی طویل کار سامنے سے زن سے۔

گیبرئیل اور نورما کوہن شاہان مغلیہ کے راجپوت جرنیلوں کے بنوائے ہوئے قلعہ آمیر کے دلآرام باغ کی ایک بارہ دری میں بیٹھے تھے۔

"کریم خاں پنڈاری۔" ڈاکٹر نورما کوہن نے کہنا شروع کیا۔ "برکلے میں مجھے کسی نے بتایا کہ کریم خاں پنڈاری کی اولاد اس شہر میں موجود ہے۔ ان کے پاس بڑے نایاب مخطوطے ہیں۔ میں ان لوگوں سے ملنے یہاں آئی تھی۔" اچانک اس نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے سرمد یہودی نژاد تھا؟"

"واجب القتل تھا قتل ہوا۔"

"میں مڈل ایسٹ کے وار تھیٹر سے سیدھا یہاں آرہا ہوں۔ میں جرنلسٹ ہوں۔ موجودہ قتل و غارت کا مطالعہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی کہ ماضی کے قتل و غارت کا مطالعہ کروں یہ کام نورما کا ہے۔" گیبرئیل نے کہا۔

لکوری کوچ آمیر سے چل کر گلابی شہر اور اکبرآباد کے آدھوں آدھ فاصلے پر ایرکنڈیشنڈ "مڈوے ہاؤس" کے سامنے رُکی۔

"میں مِرٹ بھی گیا تھا۔ دن بھر کے لیے۔ سیڈ ویری سیڈ۔" گیبرئیل کوہن نے خنک نیم تاریک ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہوئے اطلاع دی۔

گیبرئیل کوہن یعنی جبرئیل کاہن یعنی موسیٰ کے بھائی کاہن اعظم ہارونؑ کی اولاد یا نام لیوا۔ نصف دنیا کے میڈیا پر قابض۔ سدرہ کی شاخ پر تو یہ جبرئیل چڑھا بیٹھا ہے۔

نچلے متوسط طبقے کے MOHAN WEDS KAMLA قسم کے دولھا دولھن مع دو براتیوں کے قریب کے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ دولھن نے کارچوبی نائیلون کی سُرخ ساری پہن رکھی تھی۔ دولھا کے ماتھے پر تلک، گلے میں ٹائی کے اوپر موتیوں کا ہار۔ باہر ان کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ یہ دونوں اس ورگ سے تعلق رکھتے تھے جو عوامی بس میں سفر کرتا ہے اور ایرکنڈیشنڈ روڈ ہاؤس میں تازہ دم ہونے کے بجائے راستے کے گندے ڈھابوں میں کڑک چائے پیتا اور مونگ پھلی کھاتا ہے مگر یہ ان کی شادی کا دن تھا اور وہ ٹیکسی میں سفر کر رہے تھے۔ دلہن حیرت اور مسرت سے

چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ نورِ ما کو بن کو اپنی طرف متوجہ پا کر شرمائی۔ یقیناً وہ ایم اے یا ایم ایس سی پاس تھی اور خود ملازمت کر کے اور اس کے باپ نے پیسہ جوڑ کر یا قرض لے کر بہ عوض بھاری جہیز یہ لڑکا حاصل کیا تھا۔ اچھا بہورانی۔ تم بتاؤ تم کس طرح کی موت پسند کرو گی۔ اسٹوو کا دھماکہ، مٹی کے تیل کا چھڑکاؤ، یا معمولی طریقے سے گلا گھونٹ کر مارے جانے کو ترجیح دو گی۔ یہ معصوم لڑکی عین ممکن ہے کہ بہت جلد قتل کر دی جائے۔ اس کے ممکن قتل کا ذمہ دار کون ہے۔

آپ اور آپ اور آپ اور آپ۔

"گرم ہوا" کے شہر میں ڈسکو میوزک کی ایک دوکان کے آگے ایک برقعہ پوش لڑکی۔ اس کے کچھ فاصلے پر ایک لفنگا سا گورا غیر ملکی ایک رکشا والے سے مصروف گفت و شنید۔

نا قابل یقین بات ہے مگر اس لڑکی نے منتو کی سلطانہ کی طرح کالی شلوار پہن رکھی تھی۔ ماہ محرم شروع ہو چکا۔

پہلے انھوں نے بجلی گھروں پر قبضہ کیا پھر دوا و غذا کی ناکہ بندی۔ پھر پانی بند کیا۔ بے کس ہیں مسافر ہیں وطن دور ہے گھر دور۔ ہفتم سے ہمیں گھیرے ہے یہ لشکر مقہور۔ تھا شور پیاسوں کو نہ پانی کا ملے جام۔ دم لینے کی مہلت نہ ملے بے وطنوں کو۔ مرتے ہیں زبانوں کو نکالے ہوئے بچے۔ ہے ہے مری آغوش کے پالے ہوئے بچے۔

مرحب نے اس گھڑی کیا سامان رزم گاہ۔ شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں۔ دہشت سے تھرتھرا گیا مرغ آسماں۔ کشتوں کو اپنے فوج عدو روندنے لگی۔ جنگل میں برق خوف خدا کوندنے لگی۔

اب دشت و دریا پر 1403 ہجری کا نیا چاند طلوع ہو رہا ہے۔ ہجرت کا نیا چاند۔ شہر بنارس میں استاد بسم اللہ خاں نے اپنے آبائی امام باڑے کے تعزیوں کے سامنے بیٹھ کر شہنائی پر غمگین راگ چھیڑ دیے۔ امام باڑہ حسین آباد لکھنؤ کے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے۔ ہندستان و پاکستان

کے جگمگاتے آراستہ۔ انگلستان وکینیڈا اور امریکہ کے سنٹرلی ہیٹڈ نفیس امزاخانوں میں مرثیہ خوانی شروع ہوچکی ہے۔ جاتا تھا یوں غضب میں صف اہل کید پر شیر زیاں جھپٹتا ہے جس طرح صید پر نکلا ادھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا۔ پیدل ہو یا سوار وہ دو تھا یا چار تھا۔ کوسوں لہو سے دشت ستم لالہ زار تھا۔ ایک شور تھا کہ موت کا عرصہ تنگ ہے یا سوچو کہ تیغ کا پانی سبیل ہے۔

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک ناتواں کے پاؤں۔ اٹھ اٹھ گئے سپاہ ضلالت نشاں کے پاؤں۔ اک جھلکا سا بچ گیا کون و مکان میں۔ کس طرح وہ آسکے شجاعت بیان میں۔ ایسا لڑا نہیں کوئی پیاسا جہان میں۔ گوشوں میں جا چھپے تھے کماں دار دس ہزار۔ چادر ہلا رہے تھے شجاعان نامدار۔ خود صاحب کمند اسیر کمند تھے۔ دم خنجروں کی تیغ کی دہشت سے بند تھے۔

لیکن وامحمدا! واحسینا! کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ اب وہ سب بندوقیں سنبھالے دشت غربت میں منتشر کیے جانے کے لیے ٹرکوں پر سوار کیے جارہے ہیں۔ وہ بندرگاہ لے جائے گئے۔ ایک اور ہجرت پر مجبور۔ پینتیس (35) سال بعد ایک اور ہجرت۔

جگمگاتی مرادآبادی صراحیوں اور فیروزآبادی جھاڑ فانوس سے آراستہ طلائی محلوں میں کشمیری قالینوں پر نیم دراز شیوخ الف لیلٰی جدیدہ نے ہاتھ بڑھا کر رنگین ٹی وی پر دوسری چینل لگائی۔ محاصرے قتل و غارت قید و بند اور ہجرت کے مناظر غائب۔ اب وہ نامور بیلی ڈانسر نبیلہ کا نیم عریاں رقص ملاحظہ کر رہے ہیں۔ ان کے ذاتی طیارے باہر موجود ہیں جو کل سویرے ان کو مونٹ کارلو اور پیرس لے جائیں گے جہاں کے قحبہ خانے ان کے منتظر ہیں۔

ہے کوئی مائی کا لال جو انہیں سنگسار کر سکے؟

جہازوں نے لنگر اٹھائے۔ کشتی نوح چھوڑ کر طوفان ہوا رواں۔ ماہی نے الحفیظ کہا۔ مہ نے الاماں۔ پرواز شاخ سدرہ سے کی جبرئیل نے، محراب سے بلند کیا سر خلیل نے۔ وہ سرفروش جانباز حقیقی مجاہد، اپنی بندوقیں ہوا میں سر کرتے ایک اور ہجرت پر مجبور ہوئے۔ شکستہ دروازوں میں ان کے بوڑھے ماں باپ بیوی اور بچے سرنگوں۔ رہنے کا ٹھکانہ کہیں بٹھا کے سند ھار و۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو۔ تم چھوٹتے ہو عالم تنہائی ہے اس پہ تم چھوٹتے ہو واجب القتل ہیں۔

حیا کے مارے کیے گردنوں کو خم آئے۔ قدم قدم پہ اٹھاتے غم والم آئے۔ بلاکشوں نے مکان رہنے کو نہ پایا تھا بجز فلک نہ شجر۔

پڑھنے لگا رجز کے ہوں حیدؔ کا پہلوان۔ نوکوں سے برچھیوں کی کلیجہ نکال لوں— نوکوں سے۔

استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے۔

واجب القتل ہیں۔

جلاد آستینیں چڑھاتا ہوا چلا۔ خنجر پر انگلیوں کو پھراتا ہوا چلا۔ مجمع کو راس و چپ سے ہٹاتا ہوا چلا۔ ''آسمان سے یہاں مسلسل چار ماہ تک آگ برسی ہے۔ آسمان کی آگ اور زمین کی آگ۔'' گبریئل کوہن اسٹوری فائل کرتا ہے۔ عمر میں پہلی بار دیانت داری سے۔

فاقہ کش تشنہ دہن کشتۂ غم لٹتے ہیں۔ دشت غربت میں گرفتار ستم لٹتے ہیں— قتل وارث ہوئے سامان گرفتاری ہے یا علی آیئے سامان۔

ہے یہ فریاد کسی کی کہ برادر دوڑو، کوئی چلاتا ہے عباس دلاور دوڑو، دیکھو خونخوار عدو برچھیاں دکھلاتے ہیں۔ تیغ کھینچو کہ لعین گھر میں گھسے آتے ہیں۔

اس مصیبت میں نہ آئے تو کب آؤ گے۔ سر سے چادر مری چھین جائے گی تب آؤ گے۔

کوئی نہیں آیا مدد کے لیے کوئی نہیں آیا۔

گبریئل کوہن اسٹوری فائل۔

پرمیاہ نبی نے تین ہزار سال قبل نوحہ کیا تھا۔ کرنل ڈوبر پر میا ہوا آج نوحہ گر۔

ان گنت یتیم و اسیر معذور اور زخمی بچے— ہندؔ نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری رو کے پوچھا کہ دوا کیا ہے کہا نوحہ گری۔

انھوں نے میرے ابا اور اماں کو مار دیا۔ باقی سب کو پکڑ کر لے گئے۔ گھر لوٹ لیا۔ گھر میں میں اور بے بی اکیلے بچے ہیں۔ میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا کیونکہ میں پانچ سال کا ہوں۔

دہشت زدہ مجبر بے خانماں بے سہارا بچے۔ ہنؔد نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری۔ گھر جو دریافت کیا کہنے لگے در بدری۔ بولی لیتا ہے خبر کون کہا بے خبری۔

مکانوں پر بُل ڈوزر چل گئے۔ مکانوں پر بل ڈوزر چل رہے ہیں۔ گبرئیل کوہن آج ان کے متعلق اسٹوری۔

ملبے کے ڈھیر لاشوں کے انبار۔ جلے ہوئے گھر۔ غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں جہاں میں ہیں۔ ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکان میں ہیں۔

وہ شب کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں۔

ہر دم زمیں سے واں کی نکلتا تھا یوں بخار جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار۔

ننھے بچوں کا یہ عالم ہے کہ گھبراتے ہیں گود میں ماؤں کے دہشت سے چھپے جاتے ہیں۔

ننگی تلواریں جو ظالم انہیں دکھلاتے ہیں۔ بس تو چلتا نہیں اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں۔

نہ تو کر سکتے ہیں فریاد نہ تو رو سکتے ہیں۔ چپکے سہمے ہوئے اک ایک کا منہ تکتے ہیں۔ ملبے میں ہر طرف کھلونے اور ننھے منے جوتے اور ننھے منے کپڑے۔

کل مجھے لوٹ کا اسباب جو دکھلایا تھا۔ اک پھٹے کپڑے پہ حاکم کو بھی غش آیا تھا۔ ایک علَم تھا اسی اسباب میں خورشید نشاں۔ مشک پنجے میں بندھی۔ خوں میں بھریرا افشاں۔ ایک گہوارے کی خوشبو سے یہ ہوتا ہے عیاں کہ ابھی اٹھ کے سدھارا ہے کوئی غنچہ دہاں۔

بیچ میں تکیوں کے ننھا سا شلوکہ دیکھا۔ دودھ اگلا ہوا اور داغ لہو کا دیکھا۔

ایک سات سالہ بچی دہشت زدہ اپنے کھنڈر مکان میں لاشوں میں گھری ایک خالی ٹین

کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ بلک بلک کر رو رہی ہے۔

اچھی نہیں یہ عادت نہ رویا کرو بی بی۔ پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی۔ کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں۔ مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں۔

جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی۔ برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی۔

ہزاروں ہزار یتیم بے خانماں بچے۔
بچی کے سوا آپ کا کوئی نہیں بابا۔ شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا۔
میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں صرف پانچ سال کا ہوں۔
بچوں کے سراب کٹ کے نشانوں پہ چڑھیں گے۔
استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے۔
ٹیلی ویژن کے چینل بدلیے۔
مگر اس چینل پر کوئی تصویر نہیں سناٹا ہے۔

سناٹا؟ جی نہیں۔ یہاں سب خیریت ہے۔ بہ رضائے الٰہی۔ منافقین اور زمین پر فساد پھیلانے والوں کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ واجب القتل تھے۔ جو باقی ہیں انشاءاللہ ان کو بھی۔

قید خانوں میں اسیر منتظر اجل بیٹھے ہیں۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی اور بندوقچیوں کی گولیوں کی باڑھ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندوں کو آنے کی اجازت نہیں۔ وہ شیطان عظیم کے کارندے۔

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔

ہند ہرگز نہیں آئے گی۔ کاہے کو آنے لگی۔ سب کو اپنے اپنے قومی مفاد کا خیال ہے صاحب لائن سے اپنی قبریں کھود کر سب اس قطار میں آ جائیں۔ جلدی جلدی۔ افراتفری نہیں سستی نہیں۔ ڈسپلن آخر دم تک ضروری ہے۔ کچھ کفن کے لیے ہم راہ نہیں لایا ہوں۔ باپ کو چھوڑ

کے بے گور و کفن آیا ہوں—

فکر مت۔ کفن سرکاری ملیں گے۔ پھاوڑے قرینے سے رکھ دیجیے۔ دوسرے آ رہے ہیں۔

کاؤنٹ ڈاؤن دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات۔ چھ۔ پانچ۔ چار۔ تین۔

قید خانے میں کمسن لڑکے لڑکیاں منتظر اجل بیٹھے ہیں۔ دنیا کے ایوانوں میں اقتدار کی راہداریوں میں ان کی آواز نہیں پہنچی کوئی ان کو چھڑانے نہیں آیا۔

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر۔ دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در۔ پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر۔ دربانو جاگتے ہو کہ سوئے ہو بے خبر۔ بے کس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں۔ کچھ تجھ سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں۔

چھوٹے سے سن میں قیدی زندان شام ہوں۔ میں دختر حسین علیہ السلام ہوں۔ کبھی نہیں میں یہ کہ کرد قید سے رہا۔ چھٹ جائیں گے کبھی کہ اسیروں کا ہے خدا۔ کھانے کو کچھ طلب ہے نہ پانی کی التجا۔ ہاں قفل کھول دو گے تو دوں گی تمھیں دعا۔

جائیں گے ہم کہاں کہ تمھارے حوالے ہیں۔ بابا حسین آج کی شب آنے والے ہیں۔ اصغرؑ ہیں ان کے ساتھ۔ یقیں ہے کہ جلد آئیں۔ ایسے نہیں ہیں وہ کہ مجھے رات بھر رلائیں۔ چوکی کے لوگ سوئے ہیں در پر مجھے بٹھائیں۔ دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کہیں آ کے پھر نہ جائیں۔

نیند آئے گی نہ مجھ کو بہت بے قرار ہوں۔ بھاگے کوئی اسیر تو میں ذمہ دار ہوں۔

موقوف ان پر میری حیات و ممات ہے۔ آنے کا ہے یہ دن یہی وعدے کی رات ہے۔ بولے نگاہباں کہ تیرا دھیان ہے کدھر۔ جاناں کے پاس بیٹھ کہاں تو کہاں پدر۔

دن کو بھی روتی رہتی ہے شب کو بھی روتی ہے۔ نہ ہم کو سونے دیتی ہے نہ آپ سوتی ہے۔ بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لیے۔ رونا نہ کم کرے گی تو شمرؒ کے لیے۔ ماں سے چھٹے تو اور صدمہ دو چند ہو۔ ایسا نہ ہو جدا کسی حجرے میں بند ہو۔

یہ بات سن کے سہم گئی وہ جگر فگار۔ دروازے سے سرک کے گئی رونے زار زار۔ والان سے پکاریں۔ یہ بانوئے نام دار۔ بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار۔ کھولے گا کون در کے چلاتی پھرتی ہو۔ واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو۔

زنجیر ورنہ رات کو کھولیں گے یہ لعین۔ ماں صدقے گئی گھڑیاں کھانے کو کیوں گئیں۔

پست و بلند خانہ زنداں کی ہے زمیں۔ گھبرا کے گر پڑو نہ اندھیرے میں تم کہیں۔

روتی ہوئی یہ کہہ کے اٹھیں بانوئے حزیں۔ بیٹی کو ڈھونڈتی ہوئی دروازے تک گئیں۔

روتی تھی منہ کو کر تے سے ڈھانپ وہ مہ جبیں۔ پاس آ کے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں۔

سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئیں
پھر ننھے ہاتھ اٹھا کے گلے سے لپٹ گئی
جبرئیل لرزتے ہیں سمٹتے ہوئے پر کو

(ادب لطیف، 83)

خضر سوچتا ہے وولر کے کنارے

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب سے خضر سوچتا ہے

تو جیولوجسٹ نے جواب دیا ڈیڑھ ملین برس پہلے آئس ایج تھی۔ ہمالہ کے پہاڑ رفتہ رفتہ اتنے اونچے ہوئے کہ ان پر برف پڑنے لگی اور گیارہ ہزار سال سے یہ برف بتدریج گھٹ رہی (ایک وقت تھا کہ دکن پلیٹو اور سائبیریا ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے) مگر درمیان میں سمندر رولین کی طرح حائل تھا۔ نہ جانے یہ جیولوجسٹ لوگ یہ سب کس طرح معلوم کر لیتے ہیں۔

برف گھٹی انسان کی عقل بڑھی تو اس نے سوچنا شروع کیا۔ ابر کیا چیز ہے۔ ہَوا کیا ہے۔ برف اور سناٹا اور پانی اور بلندی اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو برف کی چوٹی پر رہتا ہے (بحرانی انبیا کو صحرائی بگولوں میں خدا کی آواز سنائی دیتی تھی) تو امرناتھ کی یاترا آج تک جاری ہے اور ''ستی پاروتی'' گویا پانی کے روپ میں ظاہر ہوئی کہ یہ وادی پہلے پانی سے لبریز جھیل تھی۔ ستی سر اور پھر کشپ منی نے دکھن سے سفر شروع کیا۔ جالن دھارا (آج کا جالندھر) پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ سارا اتر سنسان پڑا ہے وہاں ایک راکشش جل اودبھو نے آفت جوت رکھی تھی۔ گلیشیر پگھل رہے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔ اور خاموشی اور اس میں پانی کی گرج اور ٹوٹتے پھسلتے

پہاڑوں اور برفانی چٹانوں کی ہیبت ناک آواز۔ گویا جل اودبھو کی تباہ کاریاں۔ جل اودبھو اور اس کے چیلے چانٹے دیو اودھم مچا کر ستی سر جھیل میں چھپ جاتے تھے (شاید وہ برفانی نیم انسان یتی رہے ہوں) تب کشپ منی نے تپسیا شروع کی اور وشنو نے جنگلی سور کا اوتار لے کر اپنی دم کے ایک جھٹکے سے پہاڑ کاٹ ڈالا۔ ستی سر کا پانی بہہ گیا اور دیو ہلاک۔ وشنو نے ورَہ اوتار لیا تھا جسے انگریزی میں BOAR کہتے ہیں۔ قدیم ترین انڈو یورپین زبان کی مختلف شاخوں کی مماثلت وشنو جہاں بہ شکل ورہ ظاہر ہوئے وہ جگہ رفتہ رفتہ بارَہ مولا کہلانے لگی۔ ورَہ سے بارہ۔ ستی سر کا پانی بہا اور ایک حسین وادی اور پہاڑیاں نمودار ہوئیں۔ ماہرین ارضیات نے کہا کہ جہلم پہلے بانہال کے قریب سے نکلتا تھا۔ جب پہاڑ اوراونچے ہوئے تو جہلم کا رخ بدل گیا اور بارہ مولا کے پاس ایک آبشار اور جھیل بن گئی (بہت ممکن ہے کہ کشمیر کے قدیم باشندوں کے نسلی حافظے میں یہ واقعہ موجود ہو جس کی بنا پر انھوں نے وشنو کے ورہ اوتار لے کر پہاڑ کاٹنے اور ستی سر جھیل کا پانی بہہ نکلنے کی روایت تیار کی)۔

کشپ منی کا کشپ پیر کشمیر۔ بھائی جَل اودبھو گویا جہاں پکڑے گئے تھے وہ جگہ اب سری نگر ہے ہو سکتا ہے یہ 'دیو' اور 'راکشش' برفانی آری واسی اسکیمو کی قسم کے رہے ہوں جن کو جنوب سے آ کر زیادہ متمدن آریوں نے زیر کیا۔ کشپ منی ان آریوں کے کلچر ہیرو رہے ہوں گے۔ عالمی اساطیر میں۔ SAINT GEORGE THE DRAGON KILLER کی طرح متعدد کہانیاں موجود ہیں۔

وادیِ کشمیر کے ان قدیم پانیوں کی ایک یادگار جھیل ولر ایک سو پچیس مربع میل کے رقبے پر پھیلی ہے۔ یہ اساطیر نیلہ مت پُرآن میں لکھی گئیں جو کشمیر کی قدیم ترین کتاب ہے۔ نیلہ منی نے لکھی۔

باغِ سلیمان

نیلمت پُران پڑھنے والے پنڈتوں کی کلمہ گو اولاد نے سینکڑوں برس بعد اپنی اساطیر تیار کیں یوں کہ حضرت سلیمانؑ بھی کشمیر آئے تھے۔ بہ طور نورسٹ محمد امین پنڈت ''مختصر تاریخ کشمیر'' میں راوی ہیں۔ ''کوہ جیت الارک'' پر قیام کیا جس کی وجہ سے یہ پہاڑی کوہ سلیمان کہلائی۔ ایک ہفتہ تک سیر کی۔ فارغ ہو کر واپس تشریف لے گئے۔۔۔۔ ترکستان کے شہزادے ساتھ لائے تھے ہشک کنشک اور رشک۔ حضرت سلیمان نے کشمیر ان کو جاگیر میں دیا اور ملک کا نام باغ سلیمان رکھا۔

کشمیر جیسے پرستان کا نام یقیناً ''باغ سلیمان'' ہونا چاہیے۔ لیکن بادشاہ سلیمان بن داؤدؑ کا دورِ حکومت 972ق م سے 932ق م اور ترکستانی کنشک تقریباً ایک ہزار سال بعد 125 عیسوی میں کشمیر کا حکمراں تھا۔ روایات کے خلط ملط ہونے کی چند وجوہ ہو سکتی ہیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں فلسطین سے عبرانیوں کی جلاوطنی کے بعد ان کے چند گروہ ایران آ گئے تھے۔ وہاں سے براہ خیبر کوئی عبرانی بزرگ کشمیر آئے ہوں گے۔ 70 عیسوی میں رومنوں کے ہاتھوں یہودیوں کے دوسرے دیس نکالنے کے بعد یہ قوم ساری رومن ایمپائر میں تتر بتر ہو گئی۔ کریمیا، جنوبی روس اور ماورا النہر میں بھی انھوں نے سکونت اختیار کی۔ بخارا میں یہودیوں کے قدیم ترین محلے آج تک آباد ہیں۔ وسط ایشیا پر عرب تسلط کے بعد مزید یہودی وہاں آئے کیونکہ عرب یہودیوں کے ساتھ سب سے اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ یہودی چینی ترکستان میں بہت زمانے سے موجود رہے ہوں گے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے جو سفیر فغفور چین کو بھیجا تھا اس کا ترجمان ایک یہودی تھا۔ چنانچہ ممکن ہے ان زمانوں میں یہودی کاشغر کے راستے کشمیر آئے ہوں۔ یا کیا پتہ ان سب سے پہلے حضرت سلیمان ہی آئے ہوں۔ (یہ کوہ سلیمان سری نگر میں ہے اس کی چوٹی پر اب ٹیلی ویژن ٹاور

ہےاور جنات فضائی تصاویر پاکستان بھیجتے ہیں اور وہاں سے عملیات کے ذریعے فضائی تصاویر سری نگر پہنچتی ہیں اور دونوں طرف سے عکسی موکلوں کے ذریعے نفسیاتی معر کے جاری رہتے ہیں)۔

وادی کشمیر کی عبرانی روایات واقعی قابل غور ہیں۔ گہرے کنوئیں کو وہاں بابل کہا جاتا ہے (گہرے کنوئیں کو ہمارے ہاں وادی گنگ وجمن میں باولی کہا جاتا ہے۔ کیا یہ لفظ بھی بابل کی بگڑی ہوئی شکل ہے؟) شہر سری نگر کے اندر ایک چھوٹی سی عمارت ہے اندر ایک نہایت طویل تابوت جو قبلہ رو نہیں (فیض آباد اودھ میں برگد تلے ایک بے حد طویل قبر حضرت شیثؑ کی بتائی جاتی ہے۔ کیا انبیا اتنے دراز قد ہوتے تھے اور حضرت شیثؑ کی اودھ پہنچنے کی روایت کس طرح تیار ہوئی؟ تو اس انوکھے مقبرے واقع سری نگر میں لوح مزار کی صرف اتنی عبارت پڑھی جا سکی۔

''وز جوار ایشاں سنگ قبر واقع شد۔ نزد عوام مشہور است آنجا پیغمبراں در زمان سابقہ در کشمیر مبعوث شدہ بود۔ ایں مقام پیغمبراں معلوم......ودروں کتاب نام پیغمبر یوز آصف نوشتہ۔''

رسول کریمؐ خاتم الانبیا تھے۔ ان سے قبل کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ستر ہزار پیغمبر گذرے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کا نام یُوز آصف رہا ہو۔ بہر حال یہ مزار اسلام سے قبل کے کسی عبرانی بزرگ کا ہے کیونکہ قبلہ رو نہیں۔ حضرت سلیمان کے وزیر کا نام بھی آصف تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی مشہور تھیوری کے مطابق یہ حضرت عیسیٰؑ کا مزار ہے۔ مع حضرت مریمؑ تشریف لائے تھے۔ راہ میں ایک پہاڑ پر قیام کیا جو مریمؑ کی وجہ سے کوہ مریم اور پھر کوہ مری کہلایا۔

راج ترنگی

کلہن پنڈت کا باپ چمپک کشمیر کے مہاراجہ ہرش (1089 عیسوی-1011 عیسوی) کا عہد یدار تھا۔ وہی ہرش صاحب ہیں جنھوں نے مندروں کو تاراج کیا اور سونے چاندی کی مورتیاں پگھلوا کر ان کے سکّے ڈھلوائے۔ بقول پروفیسر کتھ موصوف ہندوستان کے نیرو کہلائے جا سکتے ہیں۔

راجہ کے قتل کے بعد چمپک سیاست سے ریٹائر ہو گیا۔ کلہن غالباً ۱۱۰۰ عیسوی میں پیدا ہوا۔ اس کے زمانے میں کشمیر کے سیاسی حالات ناگفتہ بہ تھے۔ راجگان آئے دن ہلاک کیے جا رہے تھے۔ بغاوتیں اور شورشیں اور درباری سازشیں جاری تھیں۔ تب ہی کلہن نے بعہد مہاراجہ جئے سنگھ 1149 عیسوی میں منظوم تاریخ کشمیر بزبان سنسکرت رقم کی۔ گویا کشمیر کا شاہنامہ کشمیری زبان میں اس کا نام 'راز ہ ترنگ' ہے۔

کلہن نے دگرگوں عصری حالات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اس سے قبل کی صدیوں کے متعلق بعض تانبہ پتر، سرکاری دستاویزات مندروں اور عمارتوں پر کندہ تحریریں اور سکے کلہن کے ماخذ تھے لیکن قدیم الایام کے بارے میں گھپلا کر گیا اور عوامی روایات اور نیلہ مت پُران وغیرہ پر بھروسہ کیا۔ کیونکہ بہرحال اہل ہند بنیادی طور پر A HISTORIC تھے اور میڈیول مسلمان عربوں کے برعکس ان کے ہاں تاریخ نویسی یا فلسفۂ تاریخ کی کوئی سائنٹفک روایت موجود نہیں تھی۔

ڈاکٹر بیری ڈیل، کتھ ریجیس پروفیسر آف سنسکرت، ایڈنبرا یونیورسٹی مصنف "اے ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس لندن 1928ء) کے خیال میں راجہ گونند قطعی فرضی ہے جو بقول کلہن پنڈت سری کرشن پر متھرا میں حملہ کرتا ہے۔ بل بھدرا کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اس کا لڑکا دامودر اوّل بھی ہلاک ہوتا ہے۔ سری کرشن سا کی بیوی کو تخت پر بٹھاتے ہیں اس کا لڑکا

گونند ثانی اپنی صغرسنی کی وجہ سے مہابھارت میں حصّہ نہ لے سکا۔ یہ سب وطن پرست کلہن کی افسانہ طرازی ہے تاکہ تاریخ کشمیر کی قدامت ثابت کر سکے اور اس طرح کشمیر بھی ہند قدیم کی سورمائی داستان میں شامل ہو جائے۔

تیسری صدی قبل مسیح کے اشوک اعظم کو وہ تقریباً دو ڈھائی ہزار برس قبل کھینچ لے جاتا ہے۔ وہ اشوک کا ایک لڑکا جالوک بتاتا ہے جس نے کشمیر میں بدھ مت پھیلائی لیکن جالوک کا تذکرہ اور کہیں نہیں ملتا۔ وہ ہشک، زشک اور کنشک کا ذکر ضرور کرتا ہے جو کشان نام ہیں (یاد کیجیے کشمیری مسلمانوں کی عوامی روایت کے مطابق حضرت سلیمان بھی تین ترکستانی شہزادے ہشک، کنشک اور زشک ہمراہ لائے تھے) لیکن سعید بن بادشاہ مہر قل کو اس کے عہد کے سات سو سال قبل ہی پیش کر دیتا ہے اور رانا دتیہ اوّل کا دور حکومت کلہن کے مطابق تین سو سال تھا پھر وہ ایسی دیو مالائی باتیں بھی رقم کرتا ہے کہ ایک برہمن نے دیوتا نیل ناگ کی مدد سے کشمیر کو بدھ مت اور برف کے تودوں سے نجات دلائی۔ وہ سعید بن حکمراں تورامن کو فرضی راجہ گونند کی اولاد بتاتا ہے لیکن درلابھ وردھن کشمیر کا پہلا تاریخی بادشاہ ہے جس کا کلہن نے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کے حالات تاریخی ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے آس پاس شرقی ترکستان کے یوچی قبیلے کی ایک شاخ کشان نے شاکا قبائل کو زیر کیا۔ یوچی قبیلے کی دوسری شاخوں کے نام توخاری اور ردوغرہ (ڈوگرہ) تھے۔

کشان لوگوں نے مغرب کی طرف پہنچ کر وسط ایشیا کی باختری یونانی سلطنت کو تاراج کیا۔ کابل، باختر، (بلخ) پشاور اور کشمیر پر قابض ہو کر اپنی مملکت بنارس تک پھیلا دی۔ کنشک اوّل ان کا نامور بادشاہ تھا۔ اس نے بدھ مت اختیار کی۔ سری نگر کے نزدیک ہاروان کی کھدائی میں ٹائل برآمد ہوئے ہیں جن پر وسط ایشیائی شہسواروں کی تصاویر ہیں۔ ایک خاتون شلوار اور لمبا کرتا پہنے دوپٹہ لہراتی ڈھول بجا رہی ہے۔ بالکل آج کی پنجابی خاتون معلوم ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ شلوار قدیم وسط ایشیائی پہناوا ہے جو ترکی مشرقی یورپ، دیہی ایران، پنجاب اور سندھ پہنچا۔ کاٹھیاواڑ کے کسان جو شاکا سیتھین حملہ آوروں کی اولاد ہیں۔ وہ بھی وسط ایشیائی وضع کی کرتی پہنتے ہیں اور

دھوتی پیچ دار اس طرح باندھتے ہیں کہ شلوار معلوم ہوتی ہے۔

توہارواں کے ان ٹائیلوں پر خروشتی میں اعداد پڑے ہیں اور ٹوپیاں اوڑھے عورتوں کی تصاویر۔ کشمیر کے اکثر دیہات میں ازبکستان تاجکستان کی طرح عورتیں آج بھی ٹوپیاں اوڑھے رہتی ہیں۔

پانچویں صدی عیسوی میں کشان کو ماوراالنہر کی نئی طاقت ور اقوام سفید ہن اور گوجروں نے مار بھگایا۔ ہن صاحبان نے ادھر گپتا سلطنت، اس طرف رومن ایمپائر کا تختہ الٹ دیا تورامن اور اس کا بیٹا مہرگل سفید ہن کے قہرناک مشہور بادشاہ تھے ان دونوں کے سکے بھی ہاروان میں برآمد ہوئے ہیں۔ یہ اقوام وسط ایشیا میں سکندر کے جانشینوں کے پھیلائی باختری یونانی تہذیب کے پروردہ تھیں۔ ان کی وجہ سے اس تہذیب کے موتیف کشمیر پہنچے۔

ساتویں صدی عیسوی کا درلابھ وردھن پہلا کشمیری الاصل طاقت ور راجا ہے اس وقت فغفور چین ایشیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ چین اس وقت بھی ایک پرابلم تھا۔ درلابھ وردھن کا پوتا للت دتیہ چین کے حلقۂ اثر میں رہا۔ للت دتیہ (725ء-756ء) دمشق کے آخری خلفائے بنوامیہ ہشام، ولید ثانی، مروان ثانی اور بغداد کے خلفائے عباس سفاح اور منصور کا ہم عصر تھا۔ فاتح عرب افواج وسط ایشیا اور سندھ پہنچ چکی تھیں۔ کشمیر پر متوقع عرب حملے کے خلاف للت دتیہ نے چین سے ملٹری ایڈ بھی مانگی اور سلطنت کی توسیع کرتا گیا۔ للت دتیہ ہندستان کے زبردست بادشاہوں میں سے ہے۔ اس نے گپتا سلطنت کے زوال کے بعد کشمیر کو ایک اہم سیاسی طاقت بنادیا۔ بنگال کے راجا کو مار ڈالا۔ قنوج کے راجا یشوورمن کو زبردست شکست دی اور قنوجیوں کی پوری فوج ختم کردی۔ کشت و خون اور خوفناک جنگیں اور قتل عام محض بعد کی صدیوں کی خصوصیات نہیں۔ 850 عیسوی کی کشمیر کی خانہ جنگی کے متعلق کلہن پنڈت لکھتا ہے کہ دریائے جہلم کا پانی لاشوں سے پٹ گیا تھا۔

للت دتیہ نے اپنی سلطنت بنگال اڑیسہ سے لے کر افغانستان اور کاشغر تک پھیلادی تھی۔ مارتنڈ کے وشنو سوریہ مندر میں عہد للت دتیہ کے مختلف النوع تہذیبی عناصر اور اثرات نظر آتے ہیں۔ سورج دیوتا کی مورتی نے اس مندر میں ساسانی وضع کا لباس اور فل بوٹ پہن رکھے

ہیں۔ سورج انڈو ایرانی قدیم دیومالا میں شامل تھا۔ ایران میں مہر کی پرستش کی جاتی تھی۔ وسط ایشیائی کشان بادشاہوں نے ہندستان آکر یہاں کے مذاہب اختیار کرلیے تھے۔ واسودیو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ وشنومت کا پیروتھا۔ رومن وضع کے کشان سکوں پر پارتھین باختری یونانی، ایرانی، زرتشی اور ہندستانی موٹیف ملتے ہیں اور یونانی ایرانی ہندستانی دیوی دیوتاؤں کی تصاویر مثلاً ہندستانی شیو ایرانی مہرمتر (سورج) ماؤ (ماہ) آتشو (آتش) تو ایرانی اسٹائل کے سورج دیوتا شاید عہد کنشک ہی میں کشمیر آگئے ہوں گے۔ للت دتیہ کے زمانے میں ساسانی تہذیب باقی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ کشمیر کے علاوہ سارے ہندستان میں بھی سوریہ دیوتا اپنے مندروں میں ہمیشہ فل بوٹ پہنے پائے جاتے ہیں۔

ہیون سانگ اور البیرونی ان دو صاحبان نے بہت عاجز کر رکھا ہے ہر جگہ ہر موقع پر دونوں مع اپنی رپورٹ چھلاوے کی طرح موجود۔ چنانچہ چچا ابوریحان فرماتے ہیں "ہندستان میں سورج کے معبدوں کے پروہت ایرانی مجوسی ہیں۔" (ان کو ہند میں سوریہ اور اگنی کی پوجا کرنے والے مگ برہمن کہا جاتا تھا)۔ بات سمجھ میں آتی ہے اس مخصوص صورت میں مہرمتر کی پرستش مع اس کے لوازمات کے ایران سے آئی تو ساتھ ہی اس کے پروہت بھی دہیں کے چاہئیں۔ خصوصاً البیرونی کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ پارسی، ہندستان آرہا تھا۔ ان کے کچھ دستور سوریہ مندروں میں ملازمت کرلیتے ہوں گے۔ مبچنگ برہمن بن گئے۔

مارتنڈ کے وشنو سوریہ مندر (آفتاب خدائے تخلیق وشنو کا ایک مظہر سمجھا جاتا تھا) کے ستون اور محرابیں رومن کی طرز ہیں۔ بت تراشی، ہم عصر گپتا اسکول سے تعلق رکھتی ہے۔ دیواروں پر گنگا اور جمنا کی مورتیاں بھی موجود ہیں۔

اور عین ممکن ہے اقبال کے لاتی ومناتی آباد "گائتری منتر" پڑھتے اس رفیع الشان مندر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوں۔

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو!
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو!

للت دتیہ کے بنوائے اس حیرت انگیز مارتنڈ مندر کے آثار آج ایک لرزہ خیز رومن کھنڈر معلوم ہوتے ہیں۔

للت دتیہ ہمارے کلہن پنڈت کا ہیرو ہے۔ مورخ اس کے منہ سے راج نیتی کی باتیں کہلواتا ہے جن میں قابل ذکر یہ ہیں کہ سرحدی قبائل کو کبھی چین سے بیٹھنے نہ دو۔ مبادا وہ خوش حال ہو کر ملک پر حملہ کر دیں۔ کسانوں کو سال بھر کے استعمال سے زیادہ غلہ نہ رکھنے دو۔ اور حکومت کے اعلیٰ عہدے چند مخصوص اونچے خاندانوں کے افراد ہی کو ملتے رہنے چاہئیں (موخر الذکر اصول پر برصغیر میں آج تک عمل جاری ہے)۔

مزید یہ کہ نا قابل اعتبار عوام کی وفاداری پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔ (ہمارے سیاستدانوں پر یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے)۔

کشمیر سنسکرت زبان و ادب و فلسفہ کا ایک اہم مرکز تھا (کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنڈتانِ کشمیر اپنی اعلیٰ تعلیم اور علم دوستی کے لیے آج تک مشہور ہیں۔ خواہ وہ دلّی اور یو پی میں سکونت اختیار کر چکے ہوں خواہ وادی کشمیر میں رہتے ہوں)۔

للت دتیہ کے پوتے دِتے دتیہ کے دربار سے مصنف دامودر گپت بھی منسلک تھا جس کی کتاب "کٹنی ماتا" (گویا طوائفوں کی ہینڈ بک) کا اردو ترجمہ پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔

دِتے دتیہ علم دوست تھا لیکن رعایا کی لوٹ کھسوٹ بہت کرتا تھا۔ کشمیری حکمرانوں کے مظالم کی روایت بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ دتیہ خاندان سے 855 عیسوی میں ورما خاندان نے تخت چھین لیا۔ راجہ اونتی ورما بے حد عیاش تھا اور شنکر ورما ظالم تھا اس کا بنایا ہوا ریونیو سسٹم بہت عمدہ تھا۔

کشمیر میں بہت سی خود مختار حکمراں رانیاں بھی گزری ہیں۔ امرت پربھا، چندرواتی، دیدہ رانی، کوٹہ رانی، یہ بہت ظالم مشہور تھیں۔

سازش بدامنی اور قتل و خون ایک ملک و قوم کے زوال کی علامتیں ہیں۔ آخر میں راجگانِ کشمیر اتنے نالائق ثابت ہوئے کہ ان کی جگہ باہمت اور سمجھ دار رانیوں نے ملک پر حکومت کی۔

800 عیسوی میں دیدہ رانی تخت نشین ہوئی اور 23 برس فرماں روا رہی۔ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرے ہونے کے سبب سے وادی کے باشندے ہمیشہ سے علاحدگی پسند رہے ہیں۔ بقول محمد امین پنڈت ابوریحان البیرونی نے لکھا تھا کہ اہل کشمیر اپنے ملک کی حفاظت کے خواہاں اور اس کی سرحدوں اور دروں کی حفاظت کرتے ہیں اس وجہ سے ان سے لین دین مشکل ہے گزشتہ زمانوں میں وہ اکادکا غیر ملکی خصوصاً یہودیوں کو وادی میں داخل ہونے کی اجازت دیتے تھے مگر اب وہ کسی ہندو کو بھی نہیں آنے دیتے ہیں جس سے وہ ذاتی طور پر واقف نہ ہوں (اس تحریر سے بھی کشمیر قدیم میں یہودیوں کی آمد و رفت کا سراغ ملتا ہے جس کا ذکر باب (۲) میں کیا جاچکا ہے)۔ کلہن پنڈت اس فوجی امداد کا ذکر کرتا ہے جو کشمیر سے راجہ تری لوچن پال کو محمود غزنوی کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ لیکن کشمیر پر محمود کے ناکام حملے کا تذکرہ نہیں کرتا وہ بھی بیرونی دنیا کے عصری حالات سے بے نیاز تھا اور بے خبر کہ وسط ایشیائی ترک ایک نئی سیاسی طاقت بن کر ابھر رہے ہیں۔ مارکو پولو نے کشمیر کو جادو سحر کا دیس لکھا تھا۔ وہاں تانترک جوگیوں کا بہت عمل دخل تھا۔ کلہن بھی جادو کا قائل تھا۔ بہت جلد اس کوہستان کی گپھاؤں میں شیومت کے سادھوؤں اور بدھسٹ راہبوں کے علاوہ اور قسم کے عابد سکونت اختیار کرنے والے تھے۔

رنچن شاہ، بڈ شاہ، یوسف شاہ

رنچن شاہ ایک لداخی شہزادہ تھا جس کا پورا تبتی نام لہاچین گیالبو رنچن تھا اس نے کشمیر کے راجہ رام چندر کو قتل کر کے اس کی بیوہ کوٹہ رانی سے بیاہ کر لیا اور خود راجہ بن گیا۔ وہ ہندو مذہب اختیار کرنا چاہتا تھا مگر بقول پنڈت رام چندر کک کشمیری برہمن ایک بھوٹیا کو اپنانے پر تیار نہ تھے۔ اس کی ضد میں اس نے اسلام قبول کر لیا اور رنچن سے رنچن شاہ کہلایا۔ مع اپنے خاندان، امرائے دربار شیخ شرف الدین عبدالرحمٰنؒ ترکستانی عرف بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔

رنچن شاہ کی مسجد اور بلبل شاہ کی خانقاہ! (بلبل شاہ پہلے صوفی کہے جاتے ہیں جو کشمیر تشریف لائے) رنچن اب سلطان صدر الدین والئ کشمیر کہلانے لگا۔

شاہ میر جو غالباً ایک تورانی مہم جو تھا 313 عیسوی میں کشمیر آیا۔ رنچن شاہ کی وفات کے چند سال بعد سلطان شمس الدین کے نام سے 1337 عیسوی میں تخت نشین ہوا۔ اس کی نسل میں سلطان زین العابدین جیسے بادشاہ پیدا ہوئے۔ کشمیر پر 20 سلاطین نے حکومت کی ان میں سے سلطان شہاب الدین اقبال کا ہیرو ہے۔

ع۔ خاک دیگر شہاب الدین نژاد

(تعجب کی بات ہے کہ پروفیسر آربری نے جاوید نامہ کے انگریزی ترجمے میں سلطان شہاب الدین کو شہاب الدین غوری بتایا!) کشور کشائی کا شوقین تھا۔ بلتستان، لداخ، کاشغر، پنجاب، سندھ، کابل، سلطان فیروز شاہ تغلق کو اس سے صلح کرنی پڑی۔ اس کی ہندو رانی کا نام لکشمی تھا۔ وسیع المشرب تھا۔ ہندو وزیر نے رائے دی کہ مہاتما بدھ کی مورتیاں پگھلا کر ان کے سکے ڈھلوائے جائیں (اس تجویز میں غالباً کشمیر برہمن بد مست آویزش بھی پنہاں ہوگی۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کی پالیسی کا تعلق مذہب سے زیادہ سیاست سے ہے۔

آٹھویں صدی کیرالہ کے مجدد شنکراچاریہ کی تبلیغ اور برہمن تجدیدیت کے بعد سے کشمیر میں بدھ مت ختم ہوچکی تھی محض لداخ میں باقی رہ گئی) تو سلطان نے جواب دیا ماضی میں بت اس لیے بنے کہ شہرت دوام حاصل ہو اور صلہ ملے اور تم کہتے ہو میں ان کو توڑ ڈالوں۔ ان بتوں کا تقدس کتنا گہرا ہے۔ لوگ کہیں گے سلطان شہاب الدین نے اپنی ناموری کے لیے دیوتا کا بُت توڑا۔

1272 عیسوی میں یہ عہد سلطان شہاب الدین سید السادات امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر میں وارد ہوئے۔

مرشد آں کشور مینو نظیر میر و درویش و سلاطین را مشیر (اقبال)

سید علی ہمدانی 1314 عیسوی میں پیدا ہوئے تھے۔ ایران کے کبروی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے جو سہروردی سلسلے کی ایک شاخ تھی۔

شیخ نجم الدین کبریٰؒ (وفات 1221ء) ایرانی تصوف کی ایک اہم شخصیت ہیں۔

HA AAENLY GUIDE کا نظریہ بہت مقبول تھا۔

(امیر تیمور کے مظالم سے بچنے کے لیے امیر تیمور ان کا رسوخ اور مقبولیت ختم کرنا چاہتا تھا) حضرت علی ہمدانیؒ اپنے ہم راہ سات سو سادات (سر طامس آرنلڈ نے "دی پریچنگ آف اسلام" میں بھی یہی تعداد لکھی ہے) اور ایرانی ہنرمندوں صناعوں، فن کاروں اور قالین بافوں کا ایک بڑا گروہ ہم راہ لے کر کشمیر تشریف لائے۔

وہ ایک تاریخ ساز کارواں تھا جو ایران، افغانستان اور کشمیر کے درّوں، پہاڑوں اور گھاٹیوں کو عبور کرکے وادیِ جنت نظیر میں پہنچا۔ شاہ ہمدانؒ نے وادی میں اسلام پھیلایا اور ان کے ساتھیوں نے ایرانی صنعتیں۔

اقبال جاوید نامہ میں فرماتے ہیں

سید السادات سالارِ عجم دست او معمارِ تقدیرِ اُمم

خطہ را آں شاہ دریا آستیں داد علم و صنعت و دودیں

آفرید آں مردِ ایراں صغیر باہنر ہائے غریب و دلپذیر

اس شاہ دریا آستیں نے سرینگر جہلم کے کنارے ایک حجرہ میں تبلیغ شروع کی زیادہ تر اہل کشمیر نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ کشمیر میں تصوف کے فروغ اور وسیع پیمانے پر قبول اسلام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کشمیری شیومت کے بنیادی نظریات تصوف سے بہت قریب تھے۔ پوجا پاٹ کی رسوم سے علاحدہ یہ MONISTIC شیو فلسفہ اوائل نویں صدی میں رائج ہوا۔ جب واسو گپتا نے 825 عیسوی میں شیوسترلکھا۔ انسانی مساوات اور وحدت الوجود اس شیومت کے اصول تھے اور اس کے مطابق خدا نے دنیا اپنی مرضی سے مادے کی مدد کے بغیر بنائی اور انسان بھی خدا سے قربت حاصل کر سکتا ہے، اگر اسے یہ محسوس ہو جائے کہ صفات و نور الٰہی اس کے اندر موجود ہیں۔ ویشنومت میں پوجا پاٹ برہمن پروہت کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ شیومت میں انسان بغیر پروہت کے ہی شیو سے لو لگا سکتا تھا۔ ابھینو گپتا (دسویں صدی) کشمیری شیومت کا دوسرا بڑا فلسفی تھا۔

کشمیر میں مسلمان رشیوں کا سلسلہ بھی بہت مقبول ہوا۔ بابا نور الدین عرف نندہ رشی اور ان کے خلفاء۔ بابا بام الدین، زین العابدین، لطیف الدین، نصیر الدین، رمہ رشی، صبور رشی، سلیمان رشی، حسین رشی، ان کے مزاروں پر آج تک خلقت جمع ہوتی ہے۔ اننت ناگ میں، ہردے رشی کا مزار ہے جن کے احترام میں لوگ چیت کے مہینے میں سات روز گوشت نہیں کھاتے۔

میر شمس الدین عراقی نے بلتستان اور لداخ میں شیعیت پھیلائی۔ کشمیر میں شیعہ اسی وجہ سے نظر آتے ہیں۔

کشمیر نے حیرت انگیز ہستیاں پیدا کیں، وسیع المشرب اور روشن خیال سلطان زین العابدین (1420–1470) بڈ شاہ کہلاتا ہے یعنی بڑا بادشاہ اس نے شال بافی شروع کروائی۔ سمرقند و بخارا و شیراز سے میوہ دار درخت منگوائے۔ نہریں کھدوائیں۔

چک سلاطین شیعہ تھے۔ یوسف شاہ چک کشمیری آخری خود مختار سلطان تھا۔ اس کی محبوبہ زون (چاند) یعنی حبہ خاتون شاعرہ تھی۔ یوسف شاہ خود بھی شاعری کرتا تھا۔ یوسف شاہ چک کشمیری

کے عہد میں وہی داستان دہرائی گئی جو رنجن شاہ اور اس کے بعد سیاسی بدامنی کے دور کی داستان دہرائی گئی۔ جب شاہ میر تخت و تاج پر قابض ہو گیا تھا۔ سازشیں، خانہ جنگی، خود بے چارے یوسف شاہ کو معزول کرنے کے لیے اس کے درباری امرا نے اکبر کو مدعو کیا۔ اکبر پہلے ہی توسیع سلطنت میں جٹا ہوا تھا کیوں نہ آتا۔

مغل بڑے باکمال لوگ تھے۔ لیکن انھوں نے ہندستان کے بعض نہایت غیر معمولی، ذہین، آرٹسٹک، آزاد خیال اور رومینٹک سلاطین کو نہایت بے دردی سے ختم کیا۔

مالوہ کا باز بہادر، کشمیر کا یوسف چک سلاطین دکن بالخصوص ابوالحسن تانا شاہ ان کی کہانیاں المناک ہیں۔ مگر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلتی ہے۔

مغل افواج پہلے بھی کشمیر پر حملے کر چکی تھیں مگر ناکام رہی تھیں۔ اب کی مرتبہ یوسف شاہ کے بیٹے یعقوب خاں نے مغل افواج کا بھی جی توڑ کر مقابلہ کیا۔ مگر یوسف شاہ کو مغل راجہ بھگوان داس سے صلح کرنا پڑی۔ مغل سرکار نے معاہدے کے خلاف ورزی کی اور یوسف شاہ اور یعقوب خاں کو قید کر کے دور دراز صوبہ بہار لے گئے۔ یوسف شاہ نے راجہ بھگوان داس سے صلح کی تھی۔ مغلوں نے پیمان شکنی کی۔ راجہ بھگوان داس قول نبھانے والا غیور راجپوت تھا۔ اپنے مغل آقاؤں کی اس وعدہ خلافی کی تاب نہ لا سکا خودکشی کر لی، اپنے عروج کے زمانے میں انگریز کمزور مظلوموں سے قدم قدم پر اس طرح پیمان شکنی کرنے والے تھے۔ آخری مغل بادشاہ کو رنگون لے گئے۔ سنا ہے پٹنے کے نزدیک ایک گاؤں کے ٹیلے پر اس بدقسمت کشمیری بادشاہ اور شہزادے کی قبریں موجود ہیں۔ نئی تحقیق کے مطابق حبہ خاتون بھی وہیں دفن ہے۔ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

اقبال کے مشہور ساقی نامے کا پہلا مصرع ہے۔ اقبال نے نشاط باغ میں بیٹھ کر کشمیر کے شاندار ماضی کو یاد کیا اور اپنے عہد کی زبوں حالی پر آنسو بہائے۔ اقبال سے قبل متعدد فارسی شعرا نے کشمیر کے مغلیہ باغات پر شعر کہے تھے اور محض ڈل جھیل کے کنارے مناظر قدرت اور بہتے پانی کے عاشق مغلوں نے جو باغات لگوائے ان کے کیا رومینٹک نام تھے۔ فیض بخش، فرح بخش، عیش

بخش، بحر آراء، نسیم باغ، باغ جہاں آراء، باغ پری محل، باغ چہارچنار، ان باغات کی محفلوں کی تصاویر سے مغل مصوروں کے موجیف نے کشمیری قالینوں اور کشیدہ کاری کے شاہکاروں کو سجایا۔

اکبر نے 1586 عیسوی میں کشمیر فتح کیا تھا۔ سری نگر پہنچ کر حسین خاں چک کے بنوائے ہوئے باغ میں ٹھہرا۔ فصیل قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا کیا دبدبہ اور جاہ و جلال رہا ہوگا۔ دنیا کے چار بڑے حکمرانوں میں سے اس وقت کے BIG FOUR ہیں۔ باقی تین انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ اول، سلیمان اعظم سلطان ترکیہ اور ایران کے شاہ عباس صفوی تھے۔ تو بے چارہ یوسف شاہ چک اور حبہ خاتون کہاں تک اس کا مقابلہ کرتے۔

پنڈت رام چند کک کا قول ہے کہ مغلوں نے کشمیر کو عہد وسطیٰ سے نکال کر دور جدید میں داخل کیا۔ مغلیہ ایڈمنسٹریشن، صنعتی ترقی، خوشحالی، عہد مغلیہ کشمیر کا دور زریں تھا۔ للت دتیہ، شہاب الدین اور بڈشاہ کے بعد رومان پرست شہزادہ سلیم دو بار باپ کے ساتھ کشمیر آیا۔ چھ بار نور جہاں بیگم کے ساتھ۔ شاہ جہاں دارا شکوہ سب کشمیر آتے رہے اور عمارتیں، مسجدیں اور باغات بنواتے چلے گئے۔ 1664 عیسوی میں اورنگ زیب تین ماہ رہا۔ شالیمار کے درجہ دوم فیض بخش میں بیٹھا رہا۔ طبیعت بے چینی ہوئی۔ زعفران کا شگوفہ دیکھے بغیر واپس چلا گیا۔ حالانکہ قاعدہ تھا کہ زعفران دیدہ باید راہ ہندستان گرفت اورنگ زیب دراصل ایک "آؤٹ سائڈر" تھا اور MISFIT بے حد ذہین تھا اور آئیڈیلسٹ لیکن کنفیوزڈ۔ نہ جانے اصلیت میں وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ جدید ذہن بھی رکھتا تھا۔ جیسا کہ اس کے خشم ناک اور طنزیہ خط سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اپنے لڑکپن کے استاد کو لکھا تھا کہ مولانا آپ نے مجھے بتایا کہ انگلستان کا بادشاہ ہمارے معمولی راجاؤں سے بھی کمزور ہے۔ یورپ ایک جزیرہ ہے۔ آپ نے انٹ سنٹ مجھے تعلیم دی۔ آپ کو حالات حاضرہ کی کوئی واقفیت نہیں۔ اورنگ زیب ایک عجیب و غریب انسان تھا اگر ماہر نفسیات اس کے زمانے میں موجود ہوتے تو اس کی تحلیل نفسی کرتے۔ آپ اسے وقت سے پہلے پیدا ہونے والا بادشاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس کی بیٹی شہزادی روشن آرا بیگم اس کے ہم راہ کشمیر آئی تھی۔ اسی سفر کو ذہن میں رکھ کر

انگلستان کے آئرش نژاد رومینٹک شاعر طامس مور نے 1817 عیسوی میں وہ مشہور منظوم رومان لکھا ''لالہ رخ'' اورنگ زیب کی بیٹی لالہ رخ جس کی نسبت شاہ بخارا سے ہوگئی ہے شادی کے لیے عازم کشمیر ہوتی ہے۔اس کے کارواں کے خدام میں ایک مطرب خوشنوا اور شاعر فرا موز بھی شامل ہے وہ سفر کے دوران فراموز پر عاشق ہوجاتی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ شاہ بخارا سے اس کی منگنی ہوچکی ہے وہ حکم صادر کرتی ہے کہ اس اجنبی شاعر کو اس کی خدمت میں حاضر نہ ہونے دیا جائے۔ کشمیر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شاہ بخارا ہی نے دراصل اس مطرب کا بھیس بدل رکھا تھا۔ انگلستان اور یورپ میں اپنی اشاعت کے بعد لالہ رخ نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ کیونکہ اس وقت ایشیا میں برطانوی فتوحات کی وجہ سے پراسرار رومینٹک مشرق سے دلچسپی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ادب کا رومانی دور تھا۔ کچھ عرصے کے لیے لالہ رخ کو کیٹس اور بائرن کی تخلیقات کے ہم پلہ سمجھا گیا۔ مغلوں کی بنوائی ہوئی عمارات و باغات اور ان کی متعارف کی ہوئی آرٹسٹک صنعتوں کے ذریعے آج سارے ہندستان اور کشمیر کو کثیر غیر ملکی زر مبادلہ تجارت اور سیاحوں کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

کشمیر کے حالات کبھی یکساں نہیں رہے۔ زلزلے، قحط، سیلاب چوبی، مکانوں کی آتشزدگی، حکام اور بادشاہوں کے مظالم، اس فن کار، نرم مزاج اور جفاکش (بقول اقبالؔ، زیرک ادراک، خوش گل) قوم نے کم از کم تاریخ کے دو ہزار سال میں تمام آفات سماوی وارضی کو نہایت صبر سے جھیلا ہے۔

انحطاط سلطنت مغلیہ 1853 عیسوی میں کشمیر پر احمد شاہ درّانی نے تسلط جمایا۔ 1818 عیسوی میں سکھوں نے ع

قوم سکھاں وارد کشمیر شد

کشمیر پر پٹھان، خالصہ اور ڈوگرہ راج کے مظالم ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغبان   افغاں کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد

ادھر جموں کے یہاں گلاب سنگھ نے اپنے آقا سلطان خاں کو رنجیت سنگھ کے حوالے کیا۔ صلے میں سکھ فوج میں عہدہ پایا۔ ڈوگرہ بغاوت فرو کرنے کے صلے میں رنجیت سنگھ نے 1820 عیسوی میں جموں گلاب سنگھ کو جاگیر میں دے دیا جب انگریزی فوج جلال آباد میں تھی۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں کی مدد کی۔ 1846 عیسوی میں سکھوں کے خلاف جنگ میں بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس وفاداری کے انعام میں 16 مارچ 1846 عیسوی کے روز امرتسر میں انگریزوں نے کشمیر مبلغ چالیس لاکھ روپے میں گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا۔

دہقاں و کشت و جوئے خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند
(اقبالؔ)

انگلستان کے آئرش نژاد رومینٹک شاعر طامس مور نے 1817 عیسوی میں وہ مشہور منظوم رومان لکھا ''لالہ رخ'' اورنگ زیب کی بیٹی لالہ رخ جس کی نسبت شاہ بخارا سے ہوگئی ہے شادی کے لیے عازم کشمیر ہوتی ہے۔ اس کے کارواں کے خدام میں ایک مطرب خوشنوا اور شاعر فراموز بھی شامل ہے وہ سفر کے دوران فراموز پر عاشق ہو جاتی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ شاہ بخارا سے اس کی منگنی ہو چکی ہے وہ حکم صادر کرتی ہے کہ اس اجنبی شاعر کو اس کی خدمت میں حاضر نہ ہونے دیا جائے۔ کشمیر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شاہ بخارا ہی نے دراصل اس مطرب کا بھیس بدل رکھا تھا۔ انگلستان اور یورپ میں اپنی اشاعت کے بعد لالہ رخ نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ کیونکہ اس وقت ایشیا میں برطانوی فتوحات کی وجہ سے پراسرار رومینٹک مشرق سے دلچسپی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ادب کا رومانی دور تھا۔ کچھ عرصے کے لیے لالہ رخ کو کیٹس اور بائرن کی تخلیقات کے ہم پلہ سمجھا گیا۔ مغلوں کی بنوائی ہوئی عمارات و باغات اور ان کی متعارف کی ہوئی آرٹسٹک صنعتوں کے ذریعے آج سارے ہندستان اور کشمیر کو کثیر غیر ملکی زرمبادلہ تجارت اور سیاحوں کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

کشمیر کے حالات کبھی یکساں نہیں رہے۔ زلزلے، قحط، سیلاب چوبی، مکانوں کی آتشزدگی، حکام اور بادشاہوں کے مظالم، اس فن کار، نرم مزاج اور جفاکش (بقول اقبالؔ، زیرک ادراک، خوش گل) قوم نے کم از کم تاریخ کے دو ہزار سال میں تمام آفات سماوی وارضی کو نہایت صبر سے جھیلا ہے۔

انحطاط سلطنت مغلیہ 1853 عیسوی میں کشمیر پر احمد شاہ درانی نے تسلط جمایا۔ 1816 عیسوی میں سکھوں نے ع

قوم سکھاں وارد کشمیر شد

کشمیر پر پنتھا، خالصہ اور ڈوگرہ راج کے مظالم ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغبان   افغاں کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد

ادھر جموں کے یہاں گلاب سنگھ نے اپنے آقا سلطان خاں کو رنجیت سنگھ کے حوالے کیا۔ صلے میں سکھ فوج میں عہدہ پایا۔ ڈوگرہ بغاوت فرو کرنے کے صلے میں رنجیت سنگھ نے 1820 عیسوی میں جموں گلاب سنگھ کو جاگیر میں دے دیا جب انگریزی فوج جلال آباد میں تھی۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں کی مدد کی۔ 1846 عیسوی میں سکھوں کے خلاف جنگ میں بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس وفاداری کے انعام میں 16 مارچ 1846 عیسوی کے روز امرتسر میں انگریزوں نے کشمیر مبلغ چالیس لاکھ روپے میں گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا۔

دہقاں و کشت و جوئے خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند
(اقبالؔ)

تحریک حریت کشمیر از رشید الدین تاشہ میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے حالات درج ہیں۔ 1849 عیسوی میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں کے مشورے سے لداخ کے بادشاہ حیات محمود خاں تسپال نمگل پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ بارہ سولداخی قید کیے چار سو زندہ پانی میں ڈبو دیے گئے۔ دو سو کو درختوں سے لٹکا کر پھانسی دی گئی۔ حیات محمود خاں کو بُری طرح قتل کیا گیا۔ گلاب سنگھ کے عہد میں حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ استحصال، بھاری ٹیکس، غلامی۔ جون 1886 عیسوی کے روز چار ہزار کاری گر ہجرت کر کے لاہور چلے گئے۔

1833 عیسوی میں ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل تھروپ سیاحت کے لیے کشمیر آیا تھا۔ ایک امیر زادی پر عاشق ہوا۔ اس سے نکاح کر کے لندن لے گیا۔ ان کا بیٹا رابرٹ تھروپ 1865 عیسوی میں کشمیر آیا۔ یہاں کے بھیانک حالات دیکھ کر اس نے MIS GOVERNMENT IN KASHMIR کے عنوان سے کتاب لکھی۔ کچھ عرصے بعد وہ نوجوان کوہ سلیمان پر مردہ پایا گیا۔ شال بافوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ انھوں نے احتجاجی جلوس نکالا۔ حکام نے انھیں کو دریائے جہلم میں دھکیل کر ہلاک کر دیا۔ روسی ریچھ کے خطرے کی وجہ سے کشمیر کی اہمیت بڑھتی گئی۔ سری نگر میں برطانوی ریزیڈنسی قائم ہوئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے 1887 عیسوی میں وفات پائی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ اس کے جانشین تھے۔ مہاراجہ امر سنگھ ان کے بھائی تھے اور ہری سنگھ بھتیجے، جو 1926 عیسوی میں گدی پر بیٹھے۔ ان کے دور کی ایک سیاسی سازش میں ملکہ پکھراج بھی شامل تھیں۔

خانقاہِ معلّٰے کے مجاہد

جاوید نامے میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور طاہر غنی کاشمیری والی نظمیں کشمیر کے متعلق ہیں اور ارمغان حجاز میں "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" والی نظم (پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب۔ مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب، اے وادیٔ لولاب) بہت مشہور ہے اور مظفر آباد ریڈیو سے روزانہ گائی جاتی ہے۔ اسی طرح کشمیر کے کلیشے بن چکے ہیں (ابھی ابھی معلوم ہوا کہ اس رپورتاژ کا عنوان بھی سری نگر کے ایک روزنامے کے روزانہ کالم کی سرخی ہے)۔

جاوید نامہ میں زندہ رود شاہ ہمداں سے کشمیریوں کے متعلق کہتا ہے

دست مزد او بدست دیگراں ماہی رودش بہ شست دیگراں

اور سوال کرتا ہے۔

ما فقیر و حکمراں خواہد خراج چیست اصل اعتبار تخت و تاج

ارمغان حجاز میں۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدادیٔ ایام کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر
چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یک دانہ

شیخ محمد عبداللہ اور چند اور نوجوانوں نے جو علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر لوٹے تھے۔ ۱۴ اپریل 1930 عیسوی کے روز سری نگر میں ایک ریڈنگ روم قائم کیا۔ 82 روپیہ چندہ اکٹھا کیا گیا اور اس کمرے میں سیاسی میٹنگیں ہونے لگیں۔ یہ کشمیر کی باضابطہ جدوجہد کا آغاز تھا۔ حکومت کے استبداد کے خلاف 25 جون 1930 عیسوی کے روز حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی

کی خانقاہ معلیٰ کے صحن میں زبردست جلسہ منعقد ہوا۔ تحریک زور پکڑتی گئی۔ پولیس فائرنگ میں سترہ اشخاص شہید ہوئے۔ چوہدری غلام عباس اور شیخ عبداللہ گرفتار کر لیے گئے۔ 2 ستمبر 1931 عیسوی شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد پھر 25 ہزار کے مجمع پر پولیس نے گولیاں چلائیں۔ خون کے دریا بہہ گئے۔ پولیس نے سنگینوں کی نوک سے عورتوں کو بھی زخمی کیا۔ خانقاہ معلیٰ اور جامع مسجد تحریکِ آزادی کے دو اہم مستقر بن گئے۔ تازیانے، قید و بند، ہندو مسلم فساد و فرقہ پرست سیاسی جماعتیں، پیر واعظوں کی باہم کشیدگی، قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کا تصادم۔ 1937 عیسوی تک سب زور شور سے چلتا رہا۔ اسی زمانے میں خانقاہ معلیٰ کے جلسے میں ایک نوجوان نے "سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ" والا شعر پڑھا۔ جس کی پاداش میں اسے ڈیڑھ سال کی قید سخت کی سزا ہوئی۔

شیخ عبداللہ کے ایما پر کشمیری مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ جدوجہد کا آغاز ہوا۔ 1935 عیسوی کو مسلم کانفرنس کے اجلاس میں کشمیری ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے جون 1939 عیسوی میں صادق صاحب کی زیرِ صدارت مسلم کانفرنس کشمیر کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی مشترکہ "نیشنل کانفرنس" میں تبدیل کر دی گئی۔

سیاسی جدوجہد کے دوران مہاراجہ کی پولیس فائرنگ سے کئی عورتیں بھی شہید ہوئیں۔

جاوید نامہ میں غنی کاشمیری فرماتے ہیں۔

پیچ کی دانی کہ روزے دردِ دل   موجہ ئی گفت با موجِ دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم   بجز تا یک دم بساحل سر زنیم

رخت با کاشمر کشا

جموں! جون 1989ء۔ سابق راجگان کشمیر کا شاہی مہمان خانہ جواب سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے۔ کمروں میں بیش قیمت قالین۔ غسل خانوں میں اسکاٹ لینڈ سے درآمد کیے ہوئے SHANKS کے ٹب اور واش بیسن جو برطانوی ہند کی کوٹھیوں میں بھی موجود تھے۔ برآمدوں اور خالی کمروں میں چوبیس گھنٹے فل اسپیڈ پر پنکھے چلتے رہتے ہیں تا کہ سرکاری بجلی بے دریغ ضائع ہوتی رہے۔

سری نگر کے راستے میں کرشن چندر کا بنوٹ اور کُد۔ سُرخ رنگ کا دریائے چناب لکوری کوچ کے ہمراہ بہتا جا رہا ہے۔ مگر اس کا رخ پاکستان کی طرف ہے۔ سامنے پیر پنجال کے سلسلے کی دوسری طرف وادی ہے۔ دنیا کے الگ تھلگ کشور مینو نظیر، طویل، تاریک بانہال سرنگ (جسے پنڈت جواہر لال نہرو دبنوا گئے) سے گزر کر پہاڑوں سے اتر کر اچانک پُر فضا وادیٔ کشمیر بید کے جھرمٹ، دھان کے کھیت چشمے، شاہراہ کے دونوں طرف سفیدے کی قطاریں، دریائے جہلم۔ سری نگر۔

1948 عیسوی میں مجاز مرحوم ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے سری نگر آئے تھے۔ واپسی پر دوستوں نے پوچھا سری نگر کیسا ہے فرمایا بس "مارہرہ شریف ہے" آج وہ ایک وسیع ماڈرن ترقی یافتہ شہر ہے جو مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔

ریذیڈنسی روڈ پر مہاراجہ اور برطانوی عہد کی یادگار، کوٹھیاں، سر ہری سنگھ کلب، گرجا گھر جسے بھٹو کے حامیوں نے جلا کر خاک کر دیا۔ کیونکہ بھٹو کو پھانسی دینے والا سرکاری جلاد تارا مسیح عیسائی تھا!!

سڑک ہاؤس کے ایک دریچے کے سامنے اخروٹ کی ٹہنی پر واقعی کلغی دار بلبل بیٹھی ہے اور

نیچے جہلم بہہ رہا ہے۔

یہ ایک عاشق رسول صوفی منش قوم ہے۔ ڈرائنگ روم کے دریچے میں ایک روز فجر کے وقت ایک ملازم بہ آواز بلند اس طرح نماز پڑھ رہا تھا گویا خدا اور اس کا رسول اس کے سامنے موجود ہیں اور وہ والہانہ ان سے مخاطب۔ دوسری شام وہی ملازم باغ میں ''عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں''۔ گنگناتا سنائی دیا۔

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

جہلم پر ایک شکارے پر بیٹھی کشمیری عورت اطمینان سے گدلا پانی اپنے اوپر انڈیل کر کپڑوں سمیت نہارہی تھی۔ غلام نبی اپنا شکارہ لے کر اپنے بہت بڑے ذاتی ہاؤس بوٹ کی طرف گیا اور کسی کو آواز دی۔ کھڑکی کھلی، سر پر سبز رومال باندھے ایک حسین عورت نے جھانکا۔ اسٹوو اور کیتلی غلام نبی کو دی۔ غلام نبی نے شکارہ پل کی طرف کھینا شروع کیا۔ یہ سارا منظر افسانوی تھا۔ الف لیلیٰ ہارون رشید کے زمانے کا دجلہ۔

دریا پر دورویہ خوشنما آبی ہوٹلوں اور آبی مکانوں اور آبی دوکانوں اور شکاروں کے غلط سلط انگریزی میں لکھے ہوئے نام، سبز پانی، نیلا پانی، گہرا پانی، گلشن رواں، بید کی آبی جھرمٹ، آبی کشت زار پھولوں سے ڈھکی مہمان سرائیں۔

ایک خاتون سیاہ چشمہ لگائے کشمیری پوشاک میں ملبوس تیزی سے اپنی ڈونگی کھیتی برابر سے نکل گئیں۔ جہلم پرانے شہر کے وسط سے گزر رہا ہے۔ دونوں طرف سہ منزلہ چوبی مکان۔ ایک اونچے مکان کی آخری سیڑھی پر بیٹھی کوئی ننھی سی بچی نہایت اطمینان سے پیالی میں دریا کا پانی بھر رہی تھی۔

نگین کے نزدیک غلام نبی نے ایک آبی کنج میں رک کر آواز دی۔ چند لڑکیاں ایک کشتی میں کھانا پکارہی تھیں۔ غلام نبی نے اسٹوو اور کیتلی ان کو تھما دی وہ غالباً اس کی رشتہ دار تھیں۔ واپس میں وہاں بیٹھ کر چائے پیئے گا۔

نگین جھیل۔ نیلے پانی کے اندر چاروں طرف سرسبز درخت گویا نیلم کے گرد زمردہ سایہ

دار ہرے بھرے آبی راستے میں جن پر ڈونگیاں رواں تھیں۔

آگے ڈل میں ایک چار سالہ بچی طویل طویل ناؤ کی بالکل نوک پر نہایت اطمینان سے بیٹھی چپو چلا رہی تھی۔ کشتی کے عقب میں اس کا باپ تھا حقہ گڑگڑاتا تھا۔

ڈل خاصی ڈل ہے۔ دور مغربی سیاحوں کے بے حد مہنگے ہاؤس بوٹ، کنارے پر نشاط باغ مغرب کے دھندلکے میں ملفوف ہے۔

تاج محل کو مرمریں خواب کہا جاتا ہے۔ حضرت بل کی نئی مسجد جس میں موئے مبارک محفوظ ہے ایک اور مرمریں خواب ہے۔ ڈل کنارے حضرت بل کے گھاٹ شکارا رکا۔ "اب ہم بھی مغرب کی نماز پڑھنے جاتا ہے۔ یہ مسجد نبوی کی طرز پر بنایا گیا ہے۔" غلام نبی نے کہا۔

گھاٹ پر صاف ستھری دوکانیں، نان کی ایک دوکان پر ایک حسین لڑکی تنہا، ایک تصویر کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ ساکت عبدالرحمان چغتائی کی ایک تصویر۔ کوئی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ کشمیری بدنظرے نہیں ہیں۔ گلف عرب یہاں نہیں آئے کیونکہ یہاں بے نقاب حسن کی فراوانی کے باوجود اتنی پاکیزگی ہے کہ ان کے عیاشی کے لوازم مفقود ہیں۔

گھاٹ پر ایک اور دوکان میں گول ٹوپی اوڑھے ایک فرغل پوش بزرگ حقہ پی رہے تھے۔ یہ سارا منظر مڈل ایسٹرن اور سنٹرل ایشین تھا۔ دو ہزار سال کے متواتر کشان، ترکستانی، ایرانی، مغل اثرات کے بعد اگر ایسا نہ ہو تو کیا ہو؟

مسجد حضرت بل کے احاطے میں پھاٹک کے نزدیک ایک پختہ منڈیر پر آلتی پالتی مارے غلام نبی عبادت میں اسی والہانہ انداز سے محو ہو گیا۔ جس طرح سرکٹ ہاؤس کا ملازم اللہ سے لو لگاتا ہے۔

ہارون، چشمہ شاہی، شالیمار باغ، نشاط، نورسٹوں کے ہجوم، نشاط باغ سے جھیل کے اس پار پر مسجد حضرت بل صاف نظر آ رہی ہے۔

مغل شہنشاہ، ان کی بیگمات اور شہزادیاں اور مغل صوبے دار جھیل پر چراغاں کرواتے تھے اور یہاں بیٹھ کر غروب آفتاب اور چراغاں کا نظارہ کرتے تھے۔

نیچے سیاحوں کے لیے دوکانوں کی قطار کے سرے پر چنار کے نیچے ایک بوڑھا نوپیوں پر اون سے کشیدہ کاری میں مصروف ہے۔ بارش آئی تو وہ اپنا اثاثہ پھرتی سے سمیٹ کر ایک کونے میں دبک جاتا ہے۔

نشاط باغ میں بیٹھ کر جون 1929 عیسوی میں علامہ اقبالؒ نے ساقی نامے میں لکھا تھا۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِش
نصیبِ تنش جامۂ تار تار

آج 1979 عیسوی میں سری نگر کے نئے کروڑ پتی تاجروں کا مال ساری دنیا میں جاتا ہے ان کی وجہ سے ایک نیا دولت مند طبقہ وجود میں آ چکا ہے لیکن کشمیری کاری گروں کی حالت نسبتاً پہلے سے بہتر ہے۔

کل رات سون مرگ میں برف پڑی تھی۔ یہ مئی 1979 عیسوی کا مہینہ ہے اور ''اتر پردیش اور بہار میں لوگ لو سے مر رہے ہیں''۔ سون مرگ کے مکانوں کی چھتوں پر سے برف پگھل رہی ہے۔ ہوٹل کے سبزہ زار پر متمول ہندستانی سیاحوں کا ہجوم ہے۔

دادر بمبئی سے آئے ہوئے ایک مرہٹے حیرت سے کہہ رہے ہیں ''کشمیر کی تو ہر عورت سائرہ بانو ہے''۔

ہمارا معیار حسن بھی فلمی ہے۔

سون مرگ سے سرینگر تک کے کچے خطرناک پہاڑی راستے کے برابر سندھ ندی اچھلتی کودتی چلی آرہی ہے۔ یہ مقامی سندھ ندی ہے۔ انڈس نہیں۔ سڑک کے دونوں طرف برف کی چٹانیں، گلیشئر، دریا کوہستان کی سیال روحیں ہیں۔ گلیشئر کوہستان کے منجمد تصورات، صنوبروں کے جنگل، پہاڑوں کے راگ، بادل پہاڑوں کے آوارہ خیال۔ سون مرگ کے راستے میں کھیر بھوانی کا مندر ہے۔ ایک پنڈت زعفرانی صافہ باندھے چنار کے نیچے کھڑا ہے۔ کشمیر کی قدیم روح۔ نیلہ مت پران اور رتناکر پران اور شوستر اس کے نسلی حافظہ میں محفوظ۔

کہ یہ عشق سارا محمدیؐ ہے

سری نگر سے پہل گام جاتے ہوئے شہر کی ایک سڑک پر ابل کی گھنی بیل میں چھپی ایک پنج منزلہ الف لیلوی پرانی عمارت نظر آئی۔ چوبی نقش و نگار کی بے شمار کھڑکیاں، پچلی منزل کی ایک کھڑکی میں سے ایک سرخ و سفید نوجوان نے باہر جھانک کر سڑک پر کھڑے ایک آدمی سے کچھ بات کی۔ طامس مور کی لالہ رخ کا قافلہ ایسی ہی کسی عمارت میں آ کر اترا ہوگا۔

پہل گام کے راستے میں اونتی پور کا مندر مارتنڈ کے مندر کی طرف رومن طرز کے کھنڈر، حیرت ناک، کشمیر کی ٹورزم روز افزوں ترقی پر ہے۔ ہر روز دو ہزار سیاح وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ اونتی پور کے مندر کے سامنے پہل گام جانے والی لگژری کوچیں ایک درجن سے زیادہ قطار میں کھڑی ہیں۔

پہل گام اور گل مرگ کو ہندستانی فلموں کی شوٹنگ نے بُری طرح کمرشلائز کر دیا ہے۔ ماہ عسل منانے والے ہندستانی جوڑے جو زیادہ تر پہل گام آتے ہیں۔ فوٹو گرافروں کی دو کانوں پر ان کی انتہائی فلمی پوز کی رنگین تصاویر، خچروں کے نام راج کپور اور بوبی، یہ ہمارا نیا فلمی کلچر ہے۔ پی ڈبلیو ڈی بنگلے کے عین سامنے کچھ فاصلے پر لدر بہہ رہا ہے۔ (پُر شور اور تندرو۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز زیادہ اونچی ہو جاتی ہے) کوہ پیائی کی پوشاک میں ملبوس جرمن سیاح حیرت سے ان ہندستانی خواتین کو دیکھتے ہیں جو اونچی ایڑی کی جوتیاں اور زرق برق ساڑھیاں پہنے، طلائی زیورات سے لدی، خچروں پر سوار پائین کے جنگلوں سے گزر رہی ہیں۔ زیادہ تر ہندستان کا نو دولتا طبقہ پہل گام اور گل مرگ آتا ہے۔

پہل گام میں افلاس زیادہ ہے کیونکہ یہاں کے باشندے صرف موسمِ گرما میں آنے والے سیاح کے سہارے گزر بسر کرتے ہیں۔ سری نگر، اننت ناگ، بارہ مولا زیادہ خوش حال

نیچے سیاحوں کے لیے دوکانوں کی قطار کے سرے پر چنار کے نیچے ایک بوڑھا فوٹو ہیوں پر اون سے کشیدہ کاری میں مصروف ہے۔ بارش آئی تو وہ اپنا اثاثہ پھرتی سے سمیٹ کر ایک کونے میں دبک جاتا ہے۔

نشاط باغ میں بیٹھ کر جون 1929 عیسوی میں علامہ اقبالؒ نے ساقی نامے میں لکھا تھا۔

بریشم قباخواجہ از محنتش
نصیب تنش جامۂ تارتار

آج 1979 عیسوی میں سری نگر کے نئے کروڑ پتی تاجروں کا مال ساری دنیا میں جاتا ہے ان کی وجہ سے ایک نیا دولت مند طبقہ وجود میں آچکا ہے لیکن کشمیری کاری گروں کی حالت نسبتاً پہلے سے بہتر ہے۔

کل رات سون مرگ میں برف پڑی تھی۔ یہ مئی 1979 عیسوی کا مہینہ ہے اور ''اتر پردیش اور بہار میں لوگ لو سے مر رہے ہیں''۔ سون مرگ کے مکانوں کی چھتوں پر سے برف پگھل رہی ہے۔ ہوٹل کے سبزہ زار پر متمول ہندستانی سیاحوں کا ہجوم ہے۔

دادر بمبئی سے آئے ہوئے ایک مرہٹے حیرت سے کہہ رہے ہیں ''کشمیر کی تو ہر عورت سائرہ بانو ہے''۔

ہمارا معیار حسن بھی فلمی ہے۔

سون مرگ سے سرینگر تک کے کچے خطرناک پہاڑی راستے کے برابر سندھ ندی اچھلتی کودتی چلی آرہی ہے۔ یہ مقامی سندھ ندی ہے۔ انڈس نہیں۔ سڑک کے دونوں طرف برف کی چٹانیں، گلیشئر، دریا کوہستان کی سیال روحیں ہیں۔ گلیشئر کوہستان کے منجمد تصورات، صنوبروں کے جنگل، پہاڑوں کے راگ، بادل پہاڑوں کے آوارہ خیال۔ سون مرگ کے راستے میں کھیر بھوانی کا مندر ہے۔ ایک پنڈت زعفرانی صافہ باندھے چنار کے نیچے کھڑا ہے۔ کشمیر کی قدیم روح۔ نیلمت پران اور رتنا کر پران اور شوستر اس کے نسلی حافظے میں محفوظ۔

کہ یہ عشق سارا محمدیؐ ہے

سری نگر سے پہل گام جاتے ہوئے شہر کی ایک سڑک پر آبل کی گھنی بیل میں چھپی ایک پنج منزلہ الف لیلوی پرانی عمارت نظر آئی۔ چوبی نقش و نگار کی بے شمار کھڑکیاں، نچلی منزل کی ایک کھڑکی میں سے ایک سرخ و سفید نوجوان نے باہر جھانک کر سڑک پر کھڑے ایک آدمی سے کچھ بات کی۔ طاس سور کی لالہ رخ کا قافلہ ایسی ہی کسی عمارت میں آ کر اترا ہوگا۔

پہل گام کے راستے میں اونتی پور کا مندر مارتنڈ کے مندر کی طرف رومن طرز کے کھنڈر، حیرت ناک۔ کشمیر کی ٹورزم روز افزوں ترقی پر ہے۔ ہر روز دو ہزار سیاح وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ اونتی پور کے مندر کے سامنے پہل گام جانے والی لگژری کوچس ایک درجن سے زیادہ قطار میں کھڑی ہیں۔

پہل گام اور گل مرگ کو ہندستانی فلموں کی شوٹنگ نے بُری طرح کرشلائز کر دیا ہے۔ ماہ عسل منانے والے ہندستانی جوڑے جو زیادہ تر پہل گام آتے ہیں۔ فوٹو گرافروں کی دوکانوں پر ان کی انتہائی فلمی پوز کی رنگین تصاویر، خچروں کے نام راج کپور اور بوبی، یہ ہمارا نیا فلمی کلچر ہے۔ پی ڈبلیو ڈی بنگلے کے عین سامنے کچھ فاصلے پر لدر بہہ رہا ہے۔ (پُر شور اور تند رو۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز زیادہ اونچی ہو جاتی ہے) کوہ پیمائی کی پوشاک میں ملبوس جرمن سیاح حیرت سے ان ہندستانی خواتین کو دیکھتے ہیں جو اونچی ایڑی کی جوتیاں اور زرق برق ساڑھیاں پہنے، طلائی زیورات سے لدی، خچروں پر سوار پائین کے جنگلوں سے گزر رہی ہیں۔ زیادہ تر ہندستان کا نو دولتا طبقہ پہل گام اور گل مرگ آتا ہے۔

پہل گام میں افلاس زیادہ ہے کیونکہ یہاں کے باشندے صرف موسم گرما میں آنے والے سیاح کے سہارے گزر بسر کرتے ہیں۔ سری نگر، اننت ناگ، بارہ مولا زیادہ خوش حال

اضلاع ہیں۔ پہل گام کے ان غریب کشمیریوں کے چیتھڑے اتار کر ان کو سوٹ پہنا دیے جائیں تو یورپین معلوم ہوں۔ ایک خچر والا بلونڈ لڑکا غلیظ تار تار کپڑے پہنے شکلاً بالکل نارویجن معلوم ہو رہا تھا اور اتنی شدید غربت کے باوجود ایمان داری کا یہ حال ہے کہ پنجابی، سندھی، مارواڑی سیاح عورتیں اور دلہنیں زیوروں سے لدی اکیلی ادھر اُدھر پھرتی رہتی ہیں۔ کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔

مشرقی یورپین چہرے مہرے والے اسد اللہ نے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے کہا "ہمارا باپ بھی کام کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔ اب گھر پہ بیٹھا ہے۔ جاڑا آنے پر شہر سے چاول لا کر رکھ لیں گے یاتریوں کو امرناتھ لے جائیں گے۔ دو سو روپے میں۔"

اسد اللہ۔ علی محمد۔ غلام محی الدین۔ خچر ان کے بھائی ہیں۔ ان کے ان داتا۔ گیارہ سالہ بچہ علی محمد چڑھائی پر تیزی سے دوڑتا جاتا ہے۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے بوڑھا ہو جائے گا۔ یا شاید اس وقت تک حالات بہتر ہو جائیں۔ پہلے اس سے بدتر تھے۔ "راجہ کے زمانے میں ہمارے باپ کو بیگار کرنی پڑتی تھی۔ اس کے پاس جوتے نہیں تھے جناب، پاؤں پر گھاس باندھ کر سامان ڈھوتا تھا۔ پہاڑوں پر سامان لے جاتا تھا۔" اسد اللہ نے کہا۔

گوجر مزدور سب سے زیادہ خستہ حال ہیں۔ چیتھڑوں میں ملبوس سانولے۔ سیاہ داڑھیاں۔ کشمیریوں سے نسلاً مختلف۔

لدر کے کنارے مسجد میں اذان ہوتی ہے اور برف پوش پہاڑوں سے ٹکراتی ہے۔ بنگلے کا چوکیدار غلام محمد نماز پڑھ کر واپس آتا ہے۔ بھورے بال نیلی آنکھیں۔ لیکن نورڈک کے بجائے انگریز معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو ETHNIC معلومات سے دلچسپی ہو تو انڈو آرین نسلوں کی یہ شباہتیں فسوں خیز ہیں۔ وادی میں باقی دنیا سے علاحدہ رہ جانے کی وجہ سے یہ لوگ اپنی قدیم ترین نسلی جڑوں سے زیادہ نہیں کٹے۔

اسی طرح چترال اور ہنزہ کے لوگ عہد سکندری کی باختری یونانی افواج کی نسل کے بتائے جاتے ہیں۔

غلام محمد بھی ——— بے حد مغموم ہے "جاتتھوں" کے گھر جلانے کے اجتماعی تاوان میں

اسے بھی دس روپے بھرنے پڑے جو اس کے لیے بڑی رقم ہے۔ وہ بھی بہت غریب آدمی ہے۔

''تمھاری اپنی کھیتی باڑی ہے غلام محمد؟''

''اپنی ہوتی جناب تو ہم یہاں چوکیداری کیوں کرتا۔'' اس نے اداس آواز میں جواب دیا۔

''جاڑوں میں یہاں سردی نہیں لگتی۔''

''لگتی ہے جناب! ہم جنگل کے جانور ہیں۔ جانوروں کی طرح سب مشکلیں جھیلنے کی عادت ہے۔''

''کبھی حضرت بل گئے ہو؟ موئے مبارک کی زیارت کو!''

''زیا موئے مبارک اگر دل سچا ہو تو یہیں نظر آ سکتا ہے جناب!''

''زیارتوں پر جاتے ہو؟''

''میں جہاں جاتا ہوں زیارتیں میرے ساتھ چلتی ہیں جناب!''

صدیوں کی سخت کوشی اور مصائب نے ان لوگوں کے دل گداز کر دیے ہیں۔ مدارج تصوف حاصل کرنے کے لیے اجتماعی ریاضت کی ہے!

''کبھی خواب میں رسولؐ اللہ کی زیارت کی؟''

جھینپ کر خاموش۔

''کی کبھی زیارت؟''

''ہم کیا کہہ سکتا ہے جناب؟''

''سچ سچ بتاؤ؟''

''جناب دو بار۔''

''کہاں؟''

''ادھر ہی جناب، اپنے کمرے میں۔''

''ماشاءاللہ بہت خوش نصیب آدمی ہو۔''

"جی ہاں جناب۔"

"اور یہ جو کانگڑی تمھاری ہے رات کو سوتے میں آگ نہیں لگ جاتی؟"

"جناب لگ بھی جاتی ہے کپڑے جل جاتے ہیں۔"

غلام محمد پابندی سے بازار جا کر ریڈیو سنتا ہے۔ کشمیر کے بیشتر عوام کی طرح وہ بھی بے حد سیاسی آدمی ہے۔ جاہل ہے مگر اس کے لڑکے اسکول میں انگریزی پڑھ رہے ہیں۔

"تمھارے ہاں ہندو مسلم جھگڑا ہوتا ہے؟"

"نہیں جناب! گاؤں میں اگر پڑوس کی ایک پنڈت عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اور مسلمان عورت کے ہاں بھی تو وہ دودھ شریک بھائی بن جاتے ہیں"—— "کمال ہے۔"

"سامنے لِدر کے اس پار نئی شکارگاہ میں بارھویں صدی کا ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ ایک صبح مُلا کی قسم کا لبادہ پہنے ایک شخص کیچڑ آلود سڑک پر سر جھکائے ایک سرخ رنگ کا کتابچہ پڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ماتھے پر تلک۔ ایک مسلمان سیاہ داڑھی والا گوجر قلی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ "السلام علیکم، رادھا کرشن۔" اس نے پنڈت سے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

پنڈت جی مندر پہنچے۔ دروازہ کھولا اور اندر جا کر سرخ پتھر کے قریب بیٹھ گئے۔ سامنے حوض میں سے چشمہ ابل رہا تھا۔ نیچے سارا پہلگام پھیلا تھا۔ دریائے لدر، بنگلے، بازار، خیمے، سیاحوں کے غول، پنڈت جی سال کے بارہ مہینے اس مندر کے احاطے میں رہتے ہیں۔

صبح سویرے غلام محمد چوکیدا اور غلام رسول مالی اپنے کمرے میں چٹائی پر کانگڑیاں رکھے کشمیری چائے پی رہے ہیں۔ حقہ سامنے رکھا ہے۔ رات کو اسی چٹائی پر کمبل بچھا کر سو جاتا ہے۔ کانگڑی جلائے ایک غریب، جاہل صابر و شاکر کشمیری محو خواب اور وہ رسول اللہ کی زیارت کرتا ہے۔

واہمہ! ہیلوسی نیشن؟ پیرا سائیکولوجی؟

شور مچاتے گرجتے دریا لدر کے اس پار پہاڑی پر مندر کے کمرے میں وہ پجاری بھی کانگڑی جلائے شنکر کے تصور سے لو لگائے سو رہا ہوگا۔ اس کے بھی ہیں کچھ خواب۔

اور پہل گام سے اترتے ہوئے دامن کوہسار پر عیشؒ مقام زین الدینؒ ولی کی چھوٹا سا درگاہ۔ بابا زین الدینؒ۔ نورالدینؒ عرف نندہ رشی کے سلسلے کے ایک مسلمان رشی تھے۔ غار میں رہتے تھے۔ اسی جگہ جہاں مزار ہے۔ نیچے شاہراہ پر مسلمان خانہ بدوش بکروالوں کے طویل قافلے گزر رہے ہیں۔ بالوں کی متعدد چوٹیاں گوندھے گھوڑوں پر سوار عورتیں۔ بھیڑوں کے گلے۔ یہ بکروال ہر سال موسم گرما میں پونچھ سے اس طرف آتے ہیں۔ رات کو جنگل میں گھاس پر سو رہتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک اونٹ بھی رکھتے ہیں۔ ہر ریوڑ کے پیچھے ایک کتا رکھوالا چل رہا ہے۔ نہایت معتبر انداز میں، بے حد احساس ذمہ داری کے ساتھ گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھو میں ایک حقیر کتا ہوں مگر کتنے بڑے سرمائے کی حفاظت میرے سپرد ہے۔

اچھبل کا مغل باغ ترکی وضع کی کوشک نو آرے، آبشار، نہریں۔

کوکرناگ کے راستے میں سکھوں اور مسلمان کے مخلوط گاؤں۔ کشمیری سکھ بھی نرم مزاج ہے۔ اسکول۔ دو منزلہ مکانات۔ وہ غلاظت اور شدید افلاس کہیں نظر نہ آیا جو ہندستان کے دیہات کی خصوصیت ہے۔

"بخشی صاحب بہت ترقی دے گئے۔ اب شیخ صاحب ترقی دے رہے ہیں۔ ابھی دلّی سے نوے کروڑ روپیہ لائے ہیں۔" مارتنڈ کے مندر میں سُرخ گلابوں کے پیچھے کھڑے ایک آدمی نے کہا۔ کوکرناگ کے ڈاک بنگلے کے سبزے پر ایک آدمی سر جھکائے سفید کپڑے میں بندھا ایک صندوقچہ سامنے رکھے خاموش بیٹھا تھا۔ شاید کوئی شال فروش ہوگا۔ پارک میں دور دور تک متمول ہندستانی سیاحوں کی ٹولیاں مصروف تفریح تھیں۔ وہ ان کے پاس جا کر شالیں دکھانے کے بجائے اس طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سر اوپر اٹھایا وہ نابینا تھا۔

"آپ کیا بیچتے ہیں؟"

"میں گویا ہوں جناب! کچھ سناؤں!" اس نے خوش ہو کر پُرامید لہجے میں پوچھا۔ کسی نے اس سے بات ہی نہیں کی تھی۔

"کیا نام ہے —؟"

"غلام محمد ——!"

کشمیر میں ہر دوسرے کا نام غلام محمد، غلام نبی، غلام رسول ہے۔ یہ ان کے بے پناہ عشق رسول کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔

"میں تین سال کی عمر سے اندھا ہوں، جناب! بڑا ہو کر اہت ناگ میں استاد دینا ناتھ منو سے پکا گانا سیکھا، بھائی کے ساتھ رہتا ہوں۔ روز صبح یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کوئی ٹورسٹ لوگ گانے کے لیے کہیں تو سنا دیتا ہوں۔" اس نے مسکینی سے جواب دیا۔

"اس طرح کتنا کما لیتے ہیں——؟"

"کبھی دو تین روپے، کبھی کچھ نہیں۔ ایک بار ریڈیو والے سری نگر سے آئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا بلا لیں گے، پتہ لے گئے تھے ان کے خط کا روز انتظار کرتا ہوں۔ کچھ سناؤں؟ امیر خسرو کی غزل سناؤں صاحب؟"

"کشمیری گانا سنائیے!"

وہ احتیاط سے ہارمونیم کا کپڑا اٹھا کر گاتا ہے۔

غنیمت شام غم روزانہ روزا
تمس زلفن یہ خم روزانہ روزا

پھر وہ انتہائی عقیدت اور جوش کے ساتھ ایک نعت شروع کرتا ہے۔

کسی نے قیس سے جا کر یہ پوچھا تو لیلیٰ پہ کیوں اتنا ہے مرتا
کہا لیلیٰ تو ہے بس اک بہانہ یہ عشق سارا محمدی ہے

فر کے درختوں میں چھپی فارسٹ لاج کا چوکیدار نظام الدین بھی پہلگام کے چوکیدار غلام محمد کی طرح بے حد سیاسی آدمی ہے۔ لیکن غلام محمد کے برعکس وہ پڑھا لکھا ہے اور نہایت فصیح و بلیغ اردو بولتا ہے۔ کہنے لگا "جب اہل کشمیر نے جماعت اسلامی کے ارکین کے مکانات نذر آتش کیے۔ متعدد افراد یہاں بھی زیر حراست لیے گئے۔"

فارسٹ لاج کی پہاڑی کے نیچے سے پانچ چشمے ایک ساتھ نکلتے ہیں۔ کوکر یعنی مرغی کے

پنجے کی شکل میں یہ چشمے یکجا ہو کر ایک نظر فریب پارک میں سے گزرتے ہیں۔ چناروں کے نیچے کالج اور اسکول کی لڑکیوں کے گروہ ساتھ ان کی استانیاں اور بڑے بڑے ناشتہ دان سب یونیفارم کی شلوار قمیص میں ملبوس اور بے پردہ، اضلاع کی مسلمان لڑکیاں سرینگر جا کر انجینئرنگ، معاشیات قانون اور ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں۔ تیس سال قبل وادی کے مسلمان مرد بھی عموماً جاہل تھے۔ اپنے خط پنڈتوں سے پڑھواتے تھے۔

ویری ناگ ایک خواب ہے جو رومینٹک جہانگیر نے دیکھا۔ نیلے پانی کے وسیع حوض کے گرد محرابوں والی عمارت سرد کمرے جن کے اندر جہانگیر اور نور جہاں دوپہر کو آرام کرتے ہوں گے۔ حوض کی تہہ میں پوشیدہ چشمہ جہلم کا منبع ہے۔ جہلم حوض کی عمارت کے پھاٹک سے نکل کر تیز رو نہر کی صورت میں چناروں کے نیچے بہتا دور چلا جاتا ہے۔ مغل انجینئرنگ کا کمال ہے کہ اس وسیع حوض کا پانی اس کے چوطرفہ بنی غلام گردش سے ایک انچ اوپر نہیں آتا۔ عمارت کے وسطی در میں مرمریں تختی پر کندہ ہے۔

''پادشاہ ہفت کشور شہنشاہ عدالت گستر ابو المظفر نور الدین جہانگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ غازی بتاریخ ۱۵ جلوس دریں سرچشمہ فیض آئین نزول اجلال فرمودند ایں عمارت بحکم آں حضرت اتمام بنا سر کشید بر افلک بانی تحمل یافت۔

تاریخش قصر آباد چشمہ ورناگ۔ 1029 عیسوی۔''

جہانگیر نے عمارت بنوانی شروع کی تھی شاہجہاں نے مکمل کروائی۔

دوسری تختی پر لکھا ہے۔

''حیدر بحکم شاہجہاں پادشاہ دہر شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار جوئے ایں جوئی دادہ است ز جوئے بہشت یاد۔ زیں آبشار یافتہ کشمیر آبروئے۔ تاریخ جوئے گفت ہاتف بگوشم سروش غیب۔ از چشمہ بہشت بیرون آمدست جوئے۔''

گویا 1626 عیسوی میں حیدر غالباً چیف انجینئر کا نام رہا ہوگا۔

فرغل پوش پنڈت گوپی ناتھ گائیڈ نے فرفر فارسی پڑھ کر سنائی۔

مغل دنیا کے پانچ عظیم ترین ایمپائر بلڈوزر میں سے تھے باقی چار رومن اور عرب۔ ان سے پہلے عثمانی ترک ان کے ہم عصر اور انگریز ان کے بعد، دورِ مغلیہ میں کشمیر میں امن وامان تھا اور صنعتی ترقی اور خوش حالی ہندستان کے دوسرے صوبوں کا نظام حکومت یہاں بھی قائم کیا گیا تھا۔ ماہر ایڈمنسٹریٹر یہاں بھیجے جاتے تھے جن کو ان کی ٹرم کے خاتمے پر ٹرانسفر کر دیا جاتا تھا۔ مغل نظام حکومت اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ انگریزوں نے سارے ہندستان میں اس میں زیادہ رد وبدل نہیں کیا اور ایڈمنسٹریشن کی وہی اصطلاحات آج تک مستعمل ہیں۔

مغل بادشاہ یہاں کس کروفر سے آتے ہوں گے اور کتنے مکمل انتظام کے ساتھ ہاتھیوں پر ہودے جن میں بیگمات بیٹھتی تھیں اور وہ ہاتھی ان دشوار گزار پہاڑی راستوں پر چڑھتے تھے۔ کمال ہے اور گھوڑوں پر سوار از بردست عملہ خزانہ۔ اعلیٰ عہدیدار اہلکار۔ ملازم۔ باورچی۔ ہزاروں پر مشتمل شاہی قافلہ ہوتا ہوگا۔

مغل گورنروں کی کیا شان وشوکت رہی ہوگی۔ جب وہ دورے پر نکلتے ہوں گے۔ قاسم خان نواب قلیچ خان۔ دلاور خان۔ ظفر خان۔ حسن علی مردان خان۔ آج کل اعلیٰ عہدے دار جب ان جگہوں پر پہنچتے ہیں تو ان کی اس قدر آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اس وقت بھلا کیا عالم رہا ہوگا۔ ذرا تصور کیجیے۔ نواب احمد بیگ خان۔ صوبے دار کشمیر کوکرناگ میں زرنگار خیمے کے نیچے بیٹھے ہیں سارے سرکاری حکام دست بستہ سامنے ایستادہ وہی پیٹرن آج تک موجود ہے۔

دریائے جہلم اس نیلے پرستانی حوض سے نکل کر اسی روانی سے بہے جا رہا ہے۔ !

سری نگر میں پبلک بسوں پر لکھا نظر آتا تھا "سری نگر سے اسلام آباد"۔

ہائیں یہ کیا انقلاب آیا راتوں رات۔ مصر۔اسرائیل مصالحت کی طرح۔ یروشلم سے قاہرہ سری نگر سے اسلام آباد۔

معلوم ہوا اننت ناگ کا دوسرا نام اسلام آباد ہے!

چشموں کے متعلق قدیم ہندو عقیدہ تھا جس کا ذکر کلہن پنڈت نے بھی کیا ہے کہ ہر چشمے کا محافظ ایک دیوتا ہے جو ناگ کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے لہٰذا کشمیری زبان میں چشموں کو ناگ کہتے

ہیں۔ ویری ناگ۔ کوکر ناگ۔ اننت ناگ۔

گھنے چناروں کے اندھیرے میں سرد چشمے اور وشنو مندر۔ ایک مندر پر اردو میں لکھا تھا 'رام کنڈ'۔ ایک فربہ سادھو حوض میں نہا رہا تھا۔ دوسرے حوض پر دو نوجوان پنڈت اشنان میں مصروف تھے۔ پھاٹک پر مسلمان بوڑھے مصنوعات فروخت کر رہے تھے۔ نزدیک ایک گردوارہ اور مندر سے چند قدم کے فاصلے پر مسجد دارا شکوہ۔

اس فقیر شہزادے کے نام پر بنائی ہوئی مسجد پر گنبد کے بجائے چنار کا عظیم الشان چھتنار درخت سایہ فگن ہے۔

سری نگر میں زبروال کی پہاڑی پر پری محل ہے جس میں دارا شکوہ تصوف کا مدرسہ اور ایک رصد گاہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ بے چارہ انوکھا درویش صفت شہزادہ "یہ فقیر دارا شکوہ" جو آج موجود ہوتا تو نوبل پیس پرائز کا حق دار ہوتا۔

گندھک کا چشمہ اننت ناگ مندر کی خنک نیم تاریکی سے نکل کر مسجد دارا شکوہ کے روشن باغ کو سیراب کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ نہر کے کنارے ایک فرغل پوش بڑے میاں چہرہ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ نہر کی منڈیر پر اس اطمینان سے بیٹھے تھے گویا جنت میں تشریف فرما ہوں۔

"اس جگہ پر۔" انھوں نے سلیس اردو میں کہا "شہزادہ دارا شکوہ کا ایک کتبہ برآمد ہوا تھا۔ آزادی سے قبل اس مقام پر نماز پڑھنے کے لیے چبوترہ بنادیا گیا اور یہ چنار کے درخت بھی جو سارے کشمیر میں موجود ہیں۔ مغلوں نے ایران سے یہاں لا کر لگائے تھے۔ خزاں میں ان کے پتے جب سُرخ ہو جاتے ہیں آگ سی دہکتی ہے۔ ایران قدیم میں کسی نے حیرت سے کہا ہوگا۔ چہ نار! کیسی آگ! آپ کی طرف تو انھوں نے بات کا رخ بدلا" بڑی گرمی پڑتی ہے۔ قحط بھی پڑتے ہیں پھل فروٹ تو سارا ہم لوگ یہاں سے آپ کو بھیجتے ہیں۔"

باغ رضوان کی بنگل کے کنارے بیٹھے بڑے میاں کو یہ احساس برتری بھلا کیوں نہ ہوتا۔ باغ میں سُرخ گلابوں کی بہتات، حسین عورتیں کپڑے دھو کر سبزے پر سکھا رہی تھیں۔ باہر بازار

میں اسکول اور کالج یونیفارم میں ملبوس بے پردہ لڑکیوں کی ٹولیاں۔

اننت ناگ سے سری نگر جانے والی سڑک کے دونوں طرف بید کے جھرمٹ سڑک کے کنارے کرکٹ کے بلّوں کے انبار یونہی رکھے ہیں کوئی چوری نہیں کرتا۔ کرکٹ کے بلّوں کے کارخانے۔ ایک حسین نابینا لڑکی۔ سبز رومال باندھے سبز فراک میں ملبوس، ایک معمر عورت کا ہاتھ تھامے سڑک عبور کر رہی ہے۔

ایک چوبی مکان کے دروازے میں ایک باوقار عمر رسیدہ خوب صورت نورانی چہرے والی پنڈتانی لبادے میں ملبوس، پیشانی پر روپہلی پٹی باندھے کھڑی ہے۔ یہ پٹی "زوج" قدیم یونانی اور رومن فیشن معلوم ہوتا ہے جو اسی زمانے میں یہاں پہنچا ہوگا جب مارتنڈ میں رومن طرز کا مندر تعمیر کیا گیا۔

ایک نوجوان ساری پوش "دختر برہمنے" سے (جس نے کانوں میں سہاگ کی نشانی بے حد طویل طلائی بندے پہن رکھے ہیں) باتیں کر رہی ہے اور قدیم یونانی دیوی سی معلوم ہوتی ہے۔

سری نگر۔ خانقاہ معلّیٰ کے برآمدوں میں سفید صافے باندھے بوڑھے تسبیح پھیر رہے ہیں۔ جگہ جگہ "یا علی مدد" لکھا ہے اور پھر پھاٹک۔

ہر فیض کی در سابقہ ہر دو جہانست

در پیروئ حضرت ہمدانست

اندر خانقاہ معلّیٰ کا جھاڑ فانوس سے سجا ہال ایک فینٹسی ہے۔ دیواروں پر حسین ترین گل کاری۔ ایک کونے میں وہ حجرہ جس میں شاہ ہمدانؒ نے قیام کیا تھا۔ اس کے نزدیک شیشے کی الماری میں علم "یہ حضرت کا علم ہے جو حضرت امیر کبیر اپنے ہمراہ لائے تھے" مجاور نے کہا۔ ہال کے اندر بھی جگہ جگہ "یا علی مدد" لکھا تھا۔ شاہ ہمدانؒ کے اسی کشمیر میں صدیوں شیعہ سنی خون خرابہ ہوا۔ مذہبی سیاست میں منطق کا زیادہ دخل نہیں ہے۔ ایک جگہ لکھا تھا۔

یا علی یک نظرے کن ز سر صدق و صفا

کہ بجائے نرسد بے نظرِ پیر مرید

خانقاہ معلی ساری کی ساری لکڑی سے بنی ہے۔ بیرونی دیواروں پر گل کاری کو صدیوں کی برف باری نے زائل نہیں کیا۔ کیا با کمال کاری گر اور فن کار تھے۔ یہ خانقاہ جو ایک عالی شان چینی پگوڈا معلوم ہوتی ہے، کشمیر کی بیشتر عمارتوں اور مکانات کے مانند کئی بار جلی۔ سلطان محمد شاہ کی ملکہ صالحہ نے اپنے زیورات فروخت کر کے اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ کشمیر کی مساجد اور درگاہیں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کا طرز تعمیر اسلامی کے بجائے بدھسٹ ہے۔

خانقاہ معلی جس قدر بارونق اور بشاش ہے، مزار السلاطین اتنا ہی اجاڑ، سنسان اور غمزدہ

ع زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سلطان زین العابدین کی والدہ کے مقبرے کے گنبد ازمنی طرز کے ہیں۔ دیواروں میں کہیں کہیں نیلے اصفہانی ٹائل باقی رہ گئے ہیں۔ باہر احاطے میں بہت سے سلاطین مدفون ہیں۔ ایک مزار بڈشاہ کا ہے جو کھلے آسمان کے نیچے محوِ خواب ہے۔ ایک گھنے چنار کے نیچے سلطان حیدر شاہ کاشغری کی قبر ہے۔ ہمایوں کا خالہ زاد بھائی۔ جس نے کچھ عرصے کشمیر پر اپنے کزن کی طرف سے حکومت کی۔

مزار السلاطین کے احاطے میں ان گنت قبریں ہیں۔ کشمیری وضع کی۔ پکی اور مختصری۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں۔

خواجہ خضر ہمراہ

اننت ناگ کے بازار میں ایک اندھا فقیر کشمیری میں کچھ گاتا ہوا بس کے اڈے پر مسافروں کے پاس جاجا کر دہراتا تھا۔ خواجہ خضر ہمراہ! خواجہ خضر ہمراہ۔

سرینگر سے پانڈی پور کی سمت طویل خیابان پر دونوں طرف سفیدے اور بید کے جھنڈ اور چشمے اور قالین کا ایک کارخانہ جس کا بورڈ جرمن زبان میں سڑک کے کنارے لگا ہے بڑے بڑے ساوار اٹھائے عورتیں دھان کے کھیتوں میں جا رہی ہیں۔ ساوار میں سے گرم بھاپ اٹھ رہی ہے۔ یہ منظر شمالی ایران ساحل کیسپین کا بھی ہے——!

ایک سڑک بارہ مولا جاتی ہے۔ تقسیم سے قبل لاہور کے سیاح اسی راستے سے گرمیاں گزارنے کشمیر آتے تھے۔

ٹیکسی اب جھیل ولر کے کنارے کنارے جا رہی ہے۔ ولر جس کے لیے اقبال نے کہا تھا۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب
من خدارا دیدم ایں جا بے حجاب

لیکن ولر کا منظر بدل رہا ہے جھیل کا رقبہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ دل دل بڑھ گئی ہے۔ دھان اگانے کے لیے جھیل پاٹی جا رہی ہے۔ اب خواجہ خضر بھلا کیا سوچیں گے ولر کے کنارے۔ سو سال بعد کشمیر کا جغرافیہ ہی بدل چکا ہے۔ جنگل تیزی سے کٹ رہے ہیں۔ ساری ریاست کی نمبر اکونوی ہے۔ اس بے حد سرد ملک کے عوام کو ایندھن چاہیے۔ مکان لکڑی کے بنتے ہیں۔ مصنوعات لکڑی کی ہیں۔ کاشت کاری اور چراگاہوں کے لیے مزید زمین درکار ہے۔ جنگل کٹنے سے آب و ہوا پر اثر پڑے گا ECOLOGY کے ماہرین کو اس ہولناک مستقبل کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہے۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور جنگل تیزی سے کٹ رہے ہیں۔ سوڈیڑھ سو سال میں

کشمیر کا حسن داستان پارینہ میں شامل ہو جائے گا۔ جبکہ حکومت سوئٹزر لینڈ اپنے ملک کے قدرتی حسن کا انتہائی احتیاط سے تحفظ کرتی ہے۔

باغڈی پور کے قریب چترنار میں محکمہ جنگلات کے فاریسٹ گارڈز کا تربیتی کالج ہے۔ فاریسٹ گارڈز کو بہت قلیل تنخواہیں ملتی ہیں۔ چترنار وادی کشمیر کے خوب صورت ترین علاقوں میں سے ہے۔ سیاحوں کی یلغار سے محفوظ، پُرسکون اور پُرامن فارسٹ لاج کے کنارے پائین کے گھنے جنگل میں کوئل مستقل بول رہی ہے۔

چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوت شاخسارے
(اقبالؔ)

بہت دور سفید گلاب اور لیونڈر کی جھاڑیوں کے اس پار جھیل وُلر نظر آ رہی ہے اور سلسلۂ کوہ سبز اور نیلگوں۔ باغ کے نیچے چشمہ بہہ رہا ہے۔ باد بہار موج موج۔ مرغ بہار فوج فوج۔ صلصل وسار زوج زوج۔

فارسٹ لاج کا رجسٹر جو 1942 عیسوی میں تھا وہی آج تک مستعمل ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتنے کم لوگ یہاں آتے ہیں۔

1942 سے 1945 عیسوی تک سردار عبداللہ خاں اسسٹنٹ اکاؤنٹینٹ جنرل سرینگر۔ ڈاکٹر مس امین کرم۔ ویمنز میڈیکل سروس الور سے آئی تھیں۔ 1944 عیسوی میں میجر جنرل ایچ ٹی ڈی ہکمین۔ آر ایس میل انسپکٹر جنرل پولیس سری نگر۔ لیفٹیننٹ بارکر۔ رائل نیوی۔ وی جی کیرٹن اسسٹنٹ ماسٹر ایچیسن چیفس کالج لاہور۔

جنرل ہکمین اگر جنگ عظیم میں کام نہیں آئے تب بھی شاید اب تک انگلستان کے کسی قصبے میں داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں۔ نوجوان لیفٹیننٹ بارکر اگر مارا نہیں گیا تو بوڑھا ہو چکا ہوگا۔ مس کرم شاید مر چکی ہوگی۔ وکٹر کیرٹن بفضل خدا انگلستان میں بقید حیات ہیں۔

فاریسٹ لاج سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک نوے سالہ بزرگ رہتے ہیں۔ حاجی کوثر

علی شاہ افغانستان سے تشریف لائے تھے۔ واپس نہیں گئے۔ سوائے عیدین کے سال کے بارہ مہینے روزے رکھتے ہیں۔ بے حد سویٹ بزرگ ہیں اور سچے فقیر۔ اور انتہائی روشن خیال۔ مکان کے سامنے ایک چشمہ جاری ہے۔ وہیں پر انھوں نے ایک اسکول قائم کیا جس میں آٹھویں جماعت تک انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ اسکول کی سہ منزلہ چوبی عمارت زیر تعمیر ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔ سفید شلوار، اودی قمیص اور اودے اسکارف کا یونیفارم پہنے۔ بچیاں کلاس کے بعد حاجی صاحب کے اسکول سے نکل رہی ہیں۔

گل مرگ میں ڈرائنگ روم کے دریچے میں سے نانگا پربت کی چوٹی اور ہر مکھ کا سلسلۂ کوہ نظر آ رہا ہے اور پڑوس کا وہ سبز رنگ کا بنگلہ جہاں سے 1952 عیسوی میں ایک روز شیخ عبداللہ اچانک گرفتار کر لیے گئے تھے۔

کھلن مرگ کی چڑھائی پر ایک مضمحل خچر تھا چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا "اس کا مالک اور سواری اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ کمزور ہے، اوپر نہیں جا سکتا۔" گھوڑے والے محمد سلطان نے کہا۔

"اتنا کمزور کیوں ہے؟"

"اس کے مالک کی آمدنی زیادہ نہیں ہوگی۔ پوری طرح کھلا نہیں سکتا ہوگا۔ میرے گھر میں چھ انسان ہر روز کھانے والے ہیں اور ایک گھوڑا۔" محمد سلطان ہانپ رہا تھا۔ وہ بارہ سولا کا گوجر تھا۔

"تم بیمار ہو؟"

"جی ہاں۔ دل کی تکلیف ہے۔ اس لیے کھلن مرگ سواریاں نہیں لے جاتا۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ وہ مہنگے نسخے لکھ دیتے ہیں کہاں سے خریدوں؟"

نیچے ایک آسٹرین فرم انٹرنیشنل گولف کورس بنا رہی ہے۔ سامنے برف پر پھسلنے والوں کے لیے بڑھیا ہوٹل ہیں۔ گل مرگ کو عالمی سطح کی تفریح گاہ بنایا جا رہا ہے۔

"اگر شیخ صاحب یہاں فیکٹری شکٹری لگا دیں تو لوگوں کو صرف ٹورسٹوں کے پیچھے نہ دوڑنا پڑے۔" گل مرگ سے اترتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

تنگ مرگ میں ڈیزی کے پھولوں کی فراوانی۔

سری نگر اور وادیٔ کشمیر کے شہروں اور قصبوں کی دکانوں میں جگہ جگہ ذوالفقار علی بھٹو کی تصاویر نمایاں جگہوں پر آویزاں ہیں۔ گوٹے کے ہاروں سے مزین۔

جماعت اسلامی کے اراکین کے جو مکانات جلائے گئے بلوائیوں کے اس غم و غصے میں طبقاتی نفرت بھی غالباً کارفرما تھی۔ سوپور نئے کاروباریوں کا مستقر ہے۔ وہ لوگ اس قدر امیر ہو چکے ہیں کہ سوپور "نیو انگلینڈ" کہلاتا ہے اور یہ تاجر زیادہ تر جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا سوپور بھی بلوائیوں کے حملے سے نہ بچ سکا۔

حضرت بل کے علاقے میں عیدین کی سی چہل پہل تھی۔ میلہ بھر رہا تھا۔ "کل بڑا دن تھا معراج مبارک تین دن سے موئے مبارک کی زیارت کروائی جا رہی ہے۔" ٹنگ مرگ سے واپسی پر سرینگر حضرت بل کی سڑک پر پہنچتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

حضرت بل کو عہد شاہجہانی میں باغ صادق خاں کہتے تھے (نواب صادق خاں امرائے شاہجہاں کے زمرے میں شامل تھے) آج سے تقریباً پونے تین سو سال قبل ایک بزرگ خواجہ نورالدین موئے مبارک سری نگر لائے۔ اسے جہانگیر کی بنوائی ہوئی مسجد میں محفوظ کیا گیا۔ شاعر نے تاریخ کہی ع

کشمیر مدینہ شد از موئے نبیؐ

عاشقانِ رسول کی یہ قوم موئے مبارک سے جو شدید عقیدت رکھتی ہے اس کا مظاہرہ بخشی غلام محمد مرحوم کے دورِ حکومت میں اس تبرک کی پُراسرار گمشدگی کے دنوں میں ہوا۔ سری نگر برف پوش تھا۔ ساری وادیٔ کشمیر سے عوام امنڈ کر سری نگر آ گئے۔ اسی برف باری میں رات بھر وہ سڑکوں پر بیٹھ کر زار زار روتے اور کہتے "ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ بس ہمیں موئے مبارک واپس کرو"۔ موئے مبارک کی بازیافت کے بعد ان کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

23 جون 1979 عیسوی کے روز صبح سے حضرت بل کے باغات، ڈل کے گھاٹ اور سڑکوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ معراج مبارک کا سالانہ میلہ، مرد عورتیں، بچے جو ساری وادی سے بسوں میں بھر بھر کر وہاں آئے تھے۔ بے پردہ عورتیں۔ کنبے چناروں کے نیچے بیٹھے پکنک

سنا رہے تھے۔ میلے کی دکانوں پر ٹھٹھ لگے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد موئے مبارک کی زیارت ہونے والی تھی۔ مرمریں مسجد کے بڑے ہال میں مرد انتہائی خوش الحانی سے متواتر درود شریف پڑھ رہے تھے۔ باہر وسیع چبوترے پر عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ بھی مردوں کے ساتھ ساتھ آواز ملا کر درود خوانی میں مصروف تھیں۔ ہر عمر کی عورتیں۔ نوجوان لڑکیاں سب بے پردہ۔ کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ کشمیری تہذیب کا یہ سب سے زیادہ تابناک پہلو ہے۔

نمازیوں کی بھیڑ بڑھتی گئی۔ بہت سے مرد بھی آ کر اسی چبوترے پر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ایک معمر سبز پوش عورت نہایت خود اعتمادی سے ڈانٹ ڈانٹ کر صفیں درست کرتی پھر رہی تھیں——!

سنو! اسلام دو ہیں۔ ایک میدانوں کے ملا کا اسلام اور ایک وادیٔ کشمیر کا۔ یہ لوگ اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے بیرونی دنیا سے علاحدہ رہے ہیں اس وجہ سے ان کے ہاں اسلام اپنی پاکیزگی کے ساتھ محفوظ ہے۔ یوں تو ہندستان میں بھی غریب مسلمان عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ شہروں اور کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ ملا ان کے خلاف بے پردگی کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے۔ پردہ محض نچلے متوسط، متوسط اور اونچے طبقے کا اسٹیٹس سمبل ہے۔

مسجد حضرت بل میں نماز کے بعد ایک مینار میں سبز چوغے میں ملبوس ایک مولوی صاحب نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں بلور اور چاندی کا ایک سلینڈر رسا تھا جسے انھوں نے نیچے مجمع کی طرف بڑھایا اتنی دور سے موئے مبارک نظر نہیں آ سکتا تھا۔ مگر ہجوم پر ہیبت اور سکتہ طاری تھا۔ بہت سی عورتیں اور مرد رو رہے تھے۔ عورتیں ہاتھ پھیلا کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ مجمع پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری تھی۔ عشق نبی کا یہ ایک حیرت انگیز نظارہ تھا۔ ع

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

چند منٹ بعد مولوی صاحب دوسرے مینار میں آئے اور اس سلینڈر کی زیارت کرائی۔ باہر باغ میں اور سڑکوں پر پولیس کے مسلمان اور ہندو افسروں اور سپاہیوں نے بہ لحاظ ادب جوتے اتار دیے تھے اور ننگے پاؤں ڈیوٹی پر مستعد تھے۔ بہت سے لوگ رو رہے تھے۔ زیارت کے بعد

پھر باجماعت درود شریف شروع ہو گیا۔ اور کشمیری میں نعتیں۔ نہایت سریلی CHANTING یہ حضرت بل کے علاوہ وادیٔ کشمیر کی مسجد میں ہر نماز کے بعد دیر تک جاری رہتی ہے۔ اور مسلسل باجماعت درود شریف صلی اللہ علیک یا رسول اللہ۔ وسلم علیک یا حبیب اللہ اور مسلسل CHANT—

زدنی ردنی یارزاق
اِرحم حالے یارحمٰن
اُستر عیب یاستار

حضرت بل کے نزدیک کشمیر یونیورسٹی کیمپس پر سینکڑوں مسلمان بے پردہ لڑکیاں اطمینان کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہیں۔ گو شہر میں نئے دولت مند طبقے کے چند افراد نے وہی "MOD" طرز زندگی بھی جو برصغیر میں اسی قسم کے لوگوں کے ہاں آچکا ہے۔ نہ معلوم کشمیری تہذیب کی یہ پاکیزگی اور سادگی اور اخلاص اور مہمان نوازی کب تک قائم رہ سکے گی۔ آج کے صنعتی دور میں اکثر اقوام کو اپنی مادی ترقی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ کشمیری شیومت اور اسلامی تصوف کے زیر اثر ہندو مسلم اتحاد کم از کم ایک حد تک ضرور موجود ہے۔

حضرت بل میں مغرب کی اذان ہوئی۔ نزدیک کی ایک کوٹھی کے لاج پر موجود نوجوان کشمیری ہندو ڈاکٹر نے کھڑے ہو کر حضرت بل کی طرف نمسکار کیا۔

سری نگر سے جموں جاتے ہوئے اونتی پور میں ایک اور مسلمان بزرگ کی چھوڑا نما درگاہ جس کے احاطے میں ہولی ہوکس کھلے ہوئے تھے۔ جموں کے باشندے کالج کے تعلیم یافتہ نوجوان ہندو ڈرائیور نے کشتی روکی۔ درگاہ کا مجاور لپکا ہوا آیا۔ ڈرائیور نے اسے دو روپے دیے اور ٹیکسی آگے بڑھائی۔

خیاباں کے دونوں طرف رواں چشموں کی وجہ سے سڑک کی سرمئی سطح پر سُراب برابر

آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

مذہبی عقیدتوں کی یگانگت بھی برصغیر میں صدیوں سے موجود رہی ہے اور سراب کی طرح غائب بھی ہو جاتی ہے۔ صبح کے اخبار میں ندیا کے فساد کی خبریں چھپی تھیں۔ بنگال میں بھی سارے برصغیر کی طرح بہت سے اولیا کے مزار موجود ہیں۔ جن پر ہندو اور مسلمان اسی طرح اظہار عقیدت کرتے ہیں۔

وادی میں ہر جگہ فرسٹ ایڈ اسٹیشن اور اسکول اور کالج نظر آتے ہیں۔

جموں کے راستے میں جگہ جگہ خونی نالہ اور شیطانی نالہ کہلانے والی جگہیں ملتی ہیں۔ نئے پہاڑی راستوں کی تعمیر سے قبل بہت حادثے ہوتے تھے۔ حادثے اب بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک گھاٹی میں ایک ٹرک الٹا پڑا تھا۔ ڈرائیور نے کہا چند روز ہوئے سات آدمی مر گئے۔ ڈرائیور عبدالغفور کی شادی ہونے والی تھی۔ میرا دوست تھا۔

ہمارے ہاں بسوں اور ٹرکوں پر اردو میں جو دلچسپ اشعار اور تک بندیاں درج ہوتی ہیں ان کی ایک بیاض مرتب کرنی چاہیے اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اردو شاعری اپنے عوامی روپ میں کس قدر مقبول ہے۔ بانہال شہر میں ایک ٹرک پر لکھا تھا۔

مہندی رنگ لاتی ہے سوکھ جانے کے بعد   محبت یاد آتی ہے بچھڑ جانے کے بعد

یہ شعر یقیناً ڈرائیور صاحب یا ٹرک کے مالک نے خود کہا ہوگا۔ رنگ لاتی ہے حنا سے متاثر ہو کر۔

دوسری ٹرک پر لکھا تھا۔

دفا کر ان حسینوں کو جو حسن پر ناز کرتی ہیں
لگا کر تیل زلفوں میں ہمیں برباد کرتی ہیں

دفا یعنی دفع

بانہال سرنگ کے پھاٹک پر ایک مدراسی سپاہی کھڑا سگرار ہا تھا۔ سرنگ کی دوسری طرف سے دوسری دنیا شروع ہو جاتی ہے۔ طلسماتی وادی کشمیر پیچھے رہ گئی۔

جموں کی سرسبز پہاڑیاں۔ دریائے چناب کا رنگ اب نارنجی نہیں رہا۔ یہ دریا بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے پاکستان جارہا ہے۔ اس کے گدلے پانی میں لکڑی کے گٹھے بہہ رہے ہیں۔ ان پر نمبر پڑے ہیں COLLECTING STATIONS پر ان کے مالک نمبر دیکھ کر ان کو نکال لیتے (بہت سے گٹھے پاکستان بھی نکل جاتے ہیں) اور انسان کی زندگی بھی ان گٹھوں کی طرح ہے جو دریا میں بہے جارہے ہیں۔ COLLECTING STATIONS پر موت کا فرشتہ نمبر دیکھ کر گٹھا نکال لیتا ہے!

چناب جموں کے بھدرا ضلع کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ راستے کے ساتھ بہتے بہتے وہ اچانک ایک تنگ نالے میں تبدیل ہوکر بھدرا کی سمت مڑ جاتا ہے یا یوں کہیے کہ وہاں سے ایک تنگ نالے کی صورت میں نکلا تھا۔

بادل گھر آئے۔ تینی ٹوپ پر بارش ہونے لگی۔ راستے کے کنارے لوگ سیب اور آڑو بیچ رہے تھے۔ یہاں سے سنٹرل ایشیا کے بجائے پنجاب کی کلچر بیلٹ شروع ہوجاتی ہے۔ تینی ٹوپ پارک میں کسی کی شادی کا بینڈ بج رہا تھا۔ بہت دور نیچے کھڈ میں وہ ٹرک الٹی پڑی تھی جس کے نوجوان ڈرائیور عبدالغفور کی چند روز بعد شادی ہونے والی تھی مگر وہ کھڈ اس کا COLLECTING STATIONS تھا اس کا نمبر آگیا اور ملک الموت اسے نکال لے گئے۔

ساری وادی، سارے جموں میں ترقی اور بڑھتی ہوئی خوشحالی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہر جگہ چپے چپے پر کچھ نہ کچھ ہورہا ہے۔ سرکاری اور نجی عمارتیں بن رہی ہیں یا نئی سڑکیں اور پل اور کارخانے۔ بھکاری بہت ہی کم دکھلائی دیے۔ اور وہ ویرانی افلاس اور پس ماندگی کہیں نظر نہ آئی جو کمایوں اور گڑھوال کے پہاڑوں کی خصوصیت ہے۔

جموں شہر پہنچ کر ڈرائیور نے ایک انگریزی وضع کے قلعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ مہاراجہ ہری سنگھ کا محل تھا۔"

(نامعلوم)

دکن سانہیں ٹھار سنسار میں

کوچین سے روانہ ہو کر ٹرین تامل ناڈو سے ہوتی کرناٹک سے گزر رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں ایک گوانی راہبہ، دو ملیالی خواتین ایک امریکن کالی لڑکی، پرتگالی اور ملیالی اور انگریزی کتابوں میں منہمک۔ باہر گلبرگہ تھا۔ مون اسکیپ۔ افق تا افق سُرمئی میدان عجیب وغریب نمونوں کی چٹانوں سے پُر۔ جیولوجیکل وقت کے سنگ تراش نے کہ شروع ہی سے تجریدی تھا، بے حد موڈرن، اسکلپچر اپنے اوپن ایرا سٹوڈیو میں چن رکھے تھے۔

"فنٹاسٹک"۔ امریکن چاؤش لڑکی نے باہر دیکھ کر کہا۔ گوانی راہبہ نے انجیل اُٹھائی جس میں تخلیق کا بیان بھی ہے۔ امریکن لڑکی نے چپکے سے کہا

EVE WAS FRAMED

گوانی راہبہ نے اس کی بات نہیں سُنی۔ امریکن لڑکی نے ویمنز کلب کی ایک قائد خاتون کی لکھی GENETIC ENGINEERING پر کتاب کھولی۔ ایک ملیالی خاتون وائی کوم محمد بشیر کا ناول پڑھتی رہی۔ امریکن لڑکی اچانک۔

WE SHALL OVER COME

الا پنے لگی۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی رُکتے ہی ایک نوجوان صحت مند بھکارن اللہ کا واسطہ دیتی کوچ میں چڑھی۔ گود میں بچہ۔ پہلے اس نے کنڑ میں بھیک مانگی پھر دکھنی اُردو میں، پھر انگریزی میں۔ "نومنی۔ نو پاپا۔ نو بریڈ۔"

"نوکری کیوں نہیں کرتیں۔" میں نے پوچھا۔

وہ بے نیازی سے مسکرائی۔

"کیا نام ہے؟"

"چاند بی بی"

بچے کا نام

"تحسین صاحب"

چاند بی بی۔ ٹیپو صاحب۔ تحسین صاحب۔

حضور یہ مابعد التواریخ ہے۔

گاڑی چلی۔ راستے کے اسٹیشنوں پر مہذب، تعلیم یافتہ اجلے، ہندستانی زبان سے نا آشنا، کافی پیتے مسافروں کی بھیڑ، ٹرین کے اندر شائستہ عملہ "ہندی بیلٹ" کی دھما چوکڑی سے علاحدہ وندھیاچل پار ملک ہی دوسرا ہے۔

محل اور مزار سے دور "سری رنگا پٹنم" کا بورڈ دیکھ کر ہی دہاڑیں مار مار کر رونے کو دل چاہتا ہے۔ ہندو بھی اسے بڑی عقیدت کے ساتھ "سلطان شہید" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کسی نے بتایا تھا۔

چاند بی بی اطمینان سے فرش پر بیٹھ کر بچے کو امریکن لڑکی کے دیے ہوئے چوکلیٹ کھلا رہی تھی۔ گوانی راہبہ کا رو پہلا کراس دھوپ میں چمکا۔ کرناٹکی بھکارن کا پیتل کا چاند تارے نما لاکٹ۔

گلبرگہ تھا اور اس کے آگے بیجا پور اور بیدر اور آگے احمد نگر۔ چاند بی بی۔ بیجا پور کی چاند سلطانا ئیں ارا کاٹ کے چندا صاحب۔ حیدر آباد کی چندا بائی مہ لقا اور آج کی "چاند پاشا ئیں" جو

''آتا ہوں'' ''جاتا ہوں'' بولتی ہیں۔اور جنوبی رقص بھرت ناٹیم کی ماہر جنوب کی وحیدہ رحمٰن جن کو ان کی بھانجیاں چاند خالہ پکارتی ہیں۔ جنوب میں شاید ہر چوتھی مسلمان لڑکی کا نام چاند ہے اور جنوب کی مسلمان عورتوں کے زیورات میں چاند تارے کا موتیف۔

ایک بار بمبئی میں شہزادی اسریٰ سے دریافت کیا تھا کہ ان کے عثمان آتی اجداد کا سمبل کس طرح تخلیق ہوا۔ ان کو علم نہ تھا۔ ٹوئیبی کا خیال ہے کہ عثمانی ترکوں نے اپنی یہودی رعایا کی خاطر ''اسٹار آف ڈیوڈ'' ہلال میں شامل کیا۔ ہلال کو قمری کیلنڈر کی وجہ سے اسلامی تمدن میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ساتویں صدی کی عرب خلافت کے سکوں پر سب سے پہلے ہلال کا نقش ملتا ہے۔ مقدونیہ کے فلپ نے ولادت مسیح سے چند صدیوں قبل جب بازنطین پر حملہ کیا ایک ''دیوتا کی امداد'' کی یادگار کے طور پر بازنطینی سکوں پر چاند تارا اپنایا گیا۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد عثمانی ترکوں نے اسے اپنا قومی نشان مقرر کیا۔ اواخر انیسویں صدی میں ترکی سے عقیدت کی وجہ سے ہندی مسلمانوں نے۔

علائم کا سفر۔

''یہ ضلع پہلے نظام ڈومینز میں شامل تھا۔'' قاطمہ گتی نے امریکن کالی لڑکی کو بتایا۔

''لگتا ہے اہل مریخ یہاں آ کر یہ چٹانیں تراش گئے۔'' امریکن لڑکی باہر جھانک کر بولی۔ ''یہاں کے لوگ بھی ایسے ہی ہیں۔ چٹانوں کی طرح مضبوط۔ ترشے ہوئے۔ اس بھکارن کے فیچرز مجھے تو بالکل اجنتا کی بلیک پرنس جیسے معلوم ہو رہے ہیں۔'' اس نے بیگ سے کاغذ نکال کر بھکارن کو اسکیچ کرنا شروع کیا۔ چاند بی بی نے فوراً بخشش کے لیے ہاتھ پھیلائے۔

چند منٹ بعد کالی لڑکی نے اچانک کہا۔ ''نائی زیم دنیا کا امیر ترین شخص تھا۔ اتنی دولت کہاں سے آئی تھی اور کہاں گئی؟'' وہ امریکن نیو لفٹ سے تعلق رکھتی تھی'' کچھ لوگ ارب پتی اور باقی بھیک منگے۔ آپ کا خدا واقعی بہت منصف اور عادل ہے۔'' اس نے گوانی راہبہ کو مخاطب کیا۔ وہ تسبیح پھیرا کی۔

آتے وقت ترپی وندرم کی ایرپس کے لیے سانتا کروز پر منتظر چند یورپین عورتوں کی گفتگو

کان میں پڑی تھی۔ دو گوری راہبات ان کے ساتھ تھیں۔ وہ تیک بیبیاں شاید ولی فرانسس کے تابوت کی زیارت کے لیے عازم گوا تھیں۔

یورپین خواتین میں سے ایک نے دوسری سے کہا "دنیا میں انتشار اور لادینی بڑھ رہی ہے۔ شاید جیزس جلد آئے۔ مگر میں سوچتی ہوں وہ آئے گا کس طرح۔ ہوا میں اُڑتا آ کر کہیں لینڈ کرے گا؟ اور کس ملک اور کس شہر میں آن کر اُترے گا؟"

جواباً اطالوی راہبات چپ چاپ تسبیح پھیرتی رہی تھیں۔

دو شمالی خواتین کوریڈور میں ٹہلتی ہوئی آ کر کھڑکی کے نزدیک برتھ پر ٹک گئیں۔ ان میں سے ایک نے جڑاؤ نکلس پہن رکھا تھا جس میں چاند تارے ایک قطار میں آویزاں تھے۔ آپس میں ان کی گفتگو جاری رہی۔ "مدراسیں مکمل ساریاں پہنتی ہیں۔ ایک میں نے بھی خریدی۔ میرے مس بینڈ کو پسند نہیں آئی تو میں نے اسے کاٹ کر سوٹ بنوالیا۔"

"مدراسیں ہیرے بھی اچھے پہنتی ہیں۔" انھوں نے دونوں ملیالی خواتین پر نظر ڈال کر کہا۔

"آپ لوگ سارے ساؤتھ انڈینز کو مدراسی کیوں سمجھتے ہیں۔" لکشمی راجندرن نے ذرا چڑ کر ان کی بات کاٹی۔ چاند بی بی منہ کھولے بڑے اشتیاق سے جڑاؤ نکلس کو تک رہی تھی۔ خاتون نے مدافعتی انداز میں گلوبند پر انگلیاں پھیریں۔

"ویری پریٹی۔" میں نے اخلاقیات کی۔

"حیدرآباد میں خریدا تھا۔" انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

گاڑی رُکی۔ چاند بی بی فوراً اٹھی۔ حسین صاحب کو کمر پر لادا۔ بکھرتی سے اُتر کر ریں ریں کرتی چند مسافروں کی طرف لپکی اور پلیٹ فارم کے مجمع میں غروب ہو گئی۔

ٹرین چل پڑی ایک دیو نما چٹان گویا اپسٹن نے کوئی سوچتا ہوا عبرانی پیغمبر تراشا ہو، قریب سے گزری۔

تاریخی وقت اور ارضیاتی اور فلکیاتی اور سماواتی۔ ہاں صاحب۔ وَتحک وَتحک کی بات

ہے۔ دور دور تنہا چٹانوں کے درمیان تنہا کھڑا کوئی شکستہ مقبرہ۔ برید شاہی۔ عماد شاہی۔ نظام شاہی۔ عادل شاہی۔ آصف جاہی۔

امریکن کالی لڑکی نے VISIT SOUTH INDIA ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کا شائع کردہ نقشہ برتھ پر پھیلایا۔ فاطمہ کُٹی اسے سمجھا رہی تھی۔

"نظامز ڈومینز کے اضلاع میں سے رائے چور، بیدر، گلبرگہ اب کرناٹک میں شامل ہیں، اورنگ آباد، عثمان آباد، بیڑھ، پربھنی، نانڈیڑ مہاراشٹر میں۔"

چمن میں پرزے پرزے ہو کے بکھری داستاں میری۔

حضور۔ چاند تارے کے مانند میر عثمان علی خاں آصف سابع بھی تو اسلامیان ہند کے لیے ایک علامت تھے۔

دونوں شمالی خواتین دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ "بہت لمبا سفر ہے۔ کاٹے نہیں کٹ رہا۔" ان میں سے ایک نے باقی سارے کمپارٹمنٹ کو مخاطب کیا۔ "ہم تو ہمیشہ بائی ایر ٹریول کرتے ہیں۔ اس بار ٹکٹ نہیں ملا۔ ہوائی جہازوں میں بھی اتنی بھیڑ ہونے لگ گئی ہے۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟" انھوں نے فرداً فرداً سب سے دریافت کیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" دوسری نے ایک ملیالی خاتون سے پوچھا۔

"فاطمہ کُٹی"

'شادی ہو گئی؟ کتنے بچے ہیں؟ اچھا۔ سروس کرتی ہیں کیا سروس؟"

"نیوکلیر فزکس پڑھاتی ہوں۔" فاطمہ کُٹی نے جواب دیا۔

"یہ آپ کی بہن ہیں؟" انھوں نے دوسری ملیالی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی نہیں۔ ابھی ٹرین میں ملاقات ہوئی ہے۔"

"آپ کا نام؟"

"لکشمی راجندرن۔"

"ساؤتھ میں ہندو محمڈن کرسچین کچھ پتہ نہیں چلتا۔" دوسری نے مجھے مخاطب کیا۔

"آپ تو کرسچین ہوں گی؟"

"جی نہیں۔ شنتو۔"

"___؟"

"یہ بھی ایک دھرم ہوتا ہے۔ جاپان میں؟" میں نے جواب دیا۔

"آپ جاپانی ہیں؟ پتلون سے میں کرسچین سمجھی۔ ہمارے نارتھ میں کرسچین لیڈیاں یہ ڈریس پہنتی ہیں۔" لکشمی راجندرن اور فاطمہ کٹی عرب پتوتا (کہ فاطمہ کا ملیالی وژن ہے جس طرح پنجابی کا پھاتاں) زیرلب مسکرائیں۔ فاطمہ کٹی پھر اپنے ناول کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ کیا ہے؟"

"وائی کوم محمد بشیر کا ناول۔" فاطمہ کٹی نے جواب دیا۔

"بیسٹ ملیالم ناولسٹ۔" لکشمی راجندرن نے اطلاع دی اور اپنا ملیالی رسالہ اٹھایا۔

فاطمہ کٹی کا خاندان برابر والے کمپارٹمنٹ میں تھا۔ ایک چھوٹی بچی برابر روئے جارہی تھی۔ ایک باریش سوپاسولانا کو ریڈور میں لا کر اسے ماں ماں پکارتے پچکار رہے تھے "ماں. کری یادے انگادے ساری گو۔"

"یہ مولوی جی آپ کے کیا لگتے ہیں؟" ایک شمالی خاتون نے سوال کیا۔

"فادر۔"

"کیا کرتے ہیں۔"

"ناریل اور کافی کے پلانٹیشن۔"

"آپ کے اپنے؟"

"جی۔"

"اوہ۔"

''کمال ہے۔ یہاں تو بچوں کے ان کے باپ ماں کہہ کر بلاتے ہیں۔ اپنا اپنا دستور ہے۔ یہاں سارے ساؤتھ میں اندرا گاندھی اندر ماں کہلاتی ہیں۔ سنا ہے آپ کے کیرالا میں ایک جاتی ایسی ہے جس میں ماں سے خاندان چلتا ہے۔'' انھوں نے لکشمی راجندرن سے کہا۔

''ایک بات ہے۔ آپ لوگ ہیرے بہت بڑھیا پہنتی ہیں۔'' دوسری نے اظہار خیال کیا۔

''ہمارے ہاں ہیروں کی کانیں ہیں۔'' لکشمی راجندر نے جواب دیا۔

''آپ کی اپنی؟''

''جی نہیں۔''

''یہ آپ کے ناک اور کان کے ہیرے۔ فرسٹ کوالٹی ہیں یا سکنڈ کوالٹی؟''

''آپ خود پہچانیے۔'' لکشمی نے ترشی سے جواب دیا۔

ماحول زیادہ ہمت افزا نہ تھا۔ دونوں نے پھر ایک دوسرے سے گفتگو شروع کی۔

''بہن جی۔ آپ کا یہ نیکلس بچی بہت سندر ہے۔ کب خریدا؟''

''بہت پرانا ہے۔ میرے ہس بینڈ جب دلّی سے حیدرآباد آئے تھے بزنس جمانے تب ہی خریدا تھا۔ ایک بیگم صاحب اپنے گہنے بیچ رہی تھی۔ ہم نے سارے خرید چھوڑے۔ بہت سستے مل گئے۔ صرف بیس ہزار میں۔ اب تو مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے۔ پچھلے سال میں نے اپنی لڑکی کو پانچ لاکھ کا دہیج دیا۔''

''اوفوہ۔''

''اب تو ہم نے بنجارہ ہل پر کوٹھی بھی بنوالی ہے۔''

''اوفوہ۔ وہاں تو سُنا ہے سب نواب لوگ رہتے تھے۔''

''ہاں جی۔ سب دن ایک سمان نہیں ہیں۔ میرے فادران لا کو اپنا سب کچھ شنگری میں چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ جانیں بچا کر۔ پھوٹی کوڑی پاس نہیں تھی جب دلّی پہنچے۔''

''ابھی تو لگتا ہے لوگ بھول ہی گئے وہ کیسا کڑا سے تھا۔''

''سب ٹائم ٹائم کی بات ہے۔'' دوسری نے کہا۔ پھر وہ دونوں چپ ہوگئیں۔ بمبئی کے قریب وہ دونوں پھر ٹہلتی ہوئی آبیٹھی تھیں۔ گلوبند والی خاتون نے بڑے اخلاق اور خلوص کے ساتھ مجھ سے کہا تھا۔ ''کبھی حیدرآباد آئیں تو ہم سے ضرور ملیے گا۔ ہم بنجارہ ہل پر——''

ایک رسالہ شاید 1907 عیسوی وغیرہ میں شائع ہوا کرتا تھا۔

''دبدبہ آصفی۔'' اڈیٹر مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت۔ بچپن میں یوپی کے اکثر گھروں میں شاہ دکن کی تصاویر دیواروں پر آویزاں دیکھیں نیچے میر عثمان علی خاں کا شعر۔

سلاطین سلف ہوچکے نذر اجل عثماں
مسلمانوں کا تری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اور دونوں ترک شہزادیوں کی تصاویر ان کے شوہر اور بچے برطانیہ کے شاہی خاندان کی طرح یہ ہندی مسلمانوں کی اپنی رائل فیملی تھی۔ ایک عزیزہ رقم طراز ہیں۔

''بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے شہزادہ اعظم جاہ اور شہزادی درشہوار کی شادی علی برادران کے توسط سے قرار پائی تھی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد معزول سلطان ترکی فرانس میں رہتے تھے اور وہیں سے یہ شادی ہوئی تھی۔ سلطان کے جب بُرے دن آئے تو عثمان علی خاں آصف سابع نے ان کی دستگیری فرمائی۔ چنانچہ تادم زیست ان کو معقول وظیفہ ملتا رہا۔ اور اس احسان کے بدلے میں سلطان عبدالمجید آخری فرماں روائے ترکی نے اپنی لخت جگر کو نالائق ولی عہد سلطنت آصفیہ کے حوالے کردیا۔ بھتیجی نیلوفر کی شادی چھوٹے بھائی معظم جاہ سے کردی۔ نظام بڑے بیٹے سے ناخوش رہے اپنے پوتے مکرم جاہ کو ولی بنایا۔ اب تخت ہی نہ رہا تو تاج کا ہے کا ——رہے نام اللہ کا۔''

اسلامیان ہند کو نظام دکن اور ''خلیفۃ المسلمین'' سلطان ترکی دونوں سے بے حد عقیدت تھی۔ اس جذبہ میں وہی اجتماعی نوسٹلجیا مضمر تھا۔ اپنے امپیریل ماضی کا۔

امپریل مغلوں نے وسیع المشرب ذی علم سلاطین کشمیر و مالوہ و بنگال و دکھن و گجرات کا قلع قمع کیا۔ ان سلطنتوں کی تاراجی تہذیبی اور انسانی المیہ تھی۔ مغل خود نہایت غیر معمولی اور روشن خیال اور ذی علم فرماں روا تھے۔ مگر وہ بڑی مچھلی تھے جو چھوٹی مچھلیوں کو نگل گئے۔ چاند بی بی کے قلعہ احمد نگر میں انگریزوں نے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں کو نظر بند کیا تھا۔ اس سے تو سے سال قبل وہ اورنگ زیب کی اولاد بہادر شاہ کو رنگون بھیج چکے تھے۔ کیونکہ وہ شارک مچھلی نکلے۔

فاتح دکن عالمگیر کی مملکت کے زوال کے بعد آصف جاہ مغل صوبے دار و نظام دکن نے خود مختار ہو کر ٹیپو صاحب (جو ڈوبتے ہندستان کا ناخدا ہو سکتا تھا) کے خاتمے کے لیے مرہٹوں اور انگریزوں سے اشتراک کیا اور خود برطانیہ کے تابع ہوئے۔ اور قلعہ احمد نگر میں مقید رہنماؤں نے برطانیہ سے آزاد ہو کر 1948 عیسوی میں ساتویں آصف جاہی نظام کو تخت سے اُتارا۔

جب بے چارے عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ کو شہزادہ اورنگ زیب سے زبردستی صلح کرنا پڑی تھی اور مغلوں کا تابع ہوا تھا۔ اس نے نئی مہر بنوائی تھی "ختم بالخیر السعادۃ" یعنی آج سے آزاد قطب شاہی قلمرو کا خاتمہ ہوا۔ آصف جاہی حیدرآباد کا خاتمہ بالخیر والسعادۃ جنرل چودھری کے ذریعے ہوا اور خبر لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس پہنچی تو حیدرآبادی شاعرہ، بلبل ہند، مہاتما گاندھی کی دست راست، جوشیلی قوم پرست، قومی رہنما، سروجنی نائیڈو پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور بولیں ہائے میرے بادشاہ کو تخت سے اتار دیا۔ اور حیدرآبادی ادیبوں نے اپنے معاشرے کی عیش پرستی کے متعلق ناول اور افسانے لکھنے شروع کیے۔ حیدرآباد کا امیج 1948 عیسوی سے پہلے اور بعد باہر والوں کے لیے کچھ اس طرح تھا اور ہے۔ حضور نظام بے شمار یار جنگ۔ مولوی عبدالحق۔ اردو۔ دارالترجمہ۔ جامعہ عثمانیہ۔ رضاکار۔ پولیس ایکشن۔ زوال۔ تلنگانہ تحریک۔ مخدوم۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" زوال۔ بگھارے بیگن۔ نوابوں کی عیاشی کے متعلق افسانے۔ غریب مسلمان لڑکیوں کے بوڑھے متمول عرب خریدار۔ تباہ حال نواب۔ زوال۔

قاضی عبدالغفار 1932 عیسوی میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ دلآویز ادیب حق

پرست اور نڈر صحافی۔ پیام اخبار جاری کر کے اردو صحافت کا نیا دور شروع کیا۔ ان کی چھوٹی لڑکی فاطمہ کی شادی دکن میں ہوئی۔ فروری میں اس کا خط آیا اُس سے قبل کہ پرانا حیدرآباد بالکل مٹ جائے آ کر دیکھ جاؤ۔

حیدرآباد روانگی سے چند روز قبل ایک عزیز کی شادی میں سرکار سنبھل مضاف صوبہ اکبر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ لوگ اپنے جد منصب دار سید حسین خاں کی سرائے میں مقیم ہیں۔ اس کے قریب امرودوں کا ایک باغ ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے وزیر با تدبیر اور فارسی مصنف نعمت خاں عالی سنبھلی اس باغ میں مدفون۔ بے نام ونشان۔ قصداً ان کی تلاش کا کیا۔ جن عزیز کی شادی تھی ان کے ایک رشتے دار نے کہا ''چچا ابا کا باغ تھا۔ انھوں نے ایک بیٹے کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس میں نعمت عالی دفن تھے۔ سید حسین خاں کے مزار کے قریب۔ یہ جو بدیع الدین شاہ مدار کا چلہ ہے سامنے ٹیلے پر۔ والد مرحوم اس کی مسجد میں فجر پڑھنے کے بعد اُتر کر باغ میں جایا کریں تھے۔ دونوں بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے۔ میں بھی ساتھ جایا کروں تھا۔ اب تو عرصے سے ادھر گیا نہیں۔ اب آپ کو جستجو ہے تو چلیے۔ چل کر ڈھونڈتے ہیں۔''

ہم لوگ گئے۔ ڈھونڈنے۔ امرودوں کے ایک جھنڈ کے نیچے اشارہ کر کے انھوں نے فرمایا۔ ''وہ جو چند اینٹیں پڑی ہیں یہی تھا۔''

''کیا۔؟'' ان کے بچے نے امرود توڑتے ہوئے دریافت کیا۔

''اجی۔ وہی۔ نعمت خان عالی کا مزار۔ باجی پوچھ رہی تھیں۔ میں جانوں کتاب میں ڈالیں گی۔''

یہ نیک لوگ سید حسین خاں اور نعمت خان عالی کے ورثا تھے۔

شمال میں تاریخ بہت پیچھے ہٹ چکی ہے۔ دکھن میں ابھی قدرے نزدیک معلوم ہوتی ہے۔

نواب سید لشکر خاں رکن الدولہ نصیر جنگ دیوانِ اعظم نظام الملک آصف جاہ اوّل۔ دلّی سے دکھن آئے۔ مرہٹوں اور فرانسیسیوں کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا۔ محل ان کا حیدرآباد کی عمارات میں ارفع ترین سمجھا جاتا تھا۔ لشکر خاں نے 1758 عیسوی میں رحلت کی۔ ان کے بھتیجے میر

میرک رفعت الدولہ زور آور جنگ بخشی رسالہ مغولان کلاہ پوش مزید جنگوں میں شامل ہوئے۔ تذکرے کے مولف حکیم سید شمس اللہ قادری فرماتے ہیں 1783 عیسوی کے اواخر میں بالاجی پیشوا اور حضرت غفران مآب میر نظام علی خاں نے متحد ہو کر ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کیا۔ حضرت غفران مآب مع جاہ و حشم 1775ء مع رفعت الملک و دیگر امرا انگیر پہنچے۔ تالاب کے کنارے قیام کیا۔ ہر روز نوازی میں سوار ہو کر شمس الملک مشیر الملک اور رفعت الملک کے خیموں میں آتے روشنی آتش بازی اور ناچ ملاحظہ کرتے۔

''رفعت الملک کے فرزند اکبر رفعت الملک ثانی کو سات ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ دو سو تورانی سوار رکاب میں مع جمعیت علی غول و جاگیر۔ 1789 عیسوی میں حضرت غفران مآب نے ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں اور مرہٹوں سے اتحاد کیا۔ اس کے مقبوضات فتح کرنے کے لیے فوج اور خدم و حشم کے ساتھ 1789 عیسوی غرۂ رجب کو حیدرآباد سے روانہ ہوئے...... سب سے پہلے فتح کپل کے لیے رفعت الملک اور راجہ رنبھا راؤ اپنے ہم راہ بعض امرائے خاصہ کی فوج، پائیگاہ کے سوار، انگریزوں کی پلٹن لے کر پانگل سے روانہ ہوئے۔ عرصہ تک محاصرہ رہا۔ 14 شعبان 1791 عیسوی کو قلعہ فتح ہوا...... اسی زمانے میں محاصرہ سری رنگا پٹنم کے ارادے سے لارڈ کارنوالس کلکتہ سے آیا۔ حضرت غفران مآب کے حکم سے مرشدزادہ آفاق نواب سکندر جاہ بہادر لشکر کثیر ہم راہ لے کر ان کی امداد کے لیے پانگل سے چلے۔ رفعت الملک اور راؤ رنبھا بھی اپنے لشکر کے ساتھ لارڈ کارنوالس کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی فوج برق رفتار گھوڑوں پر سوار، ہتھیاروں میں غرق، کمر میں دو دھاری تلواریں، ہاتھوں میں چھ چھ نیزے، سر پر آبدار آہنی خود۔ بڑی آن بان کے ساتھ اس وقت پہنچی جبکہ لارڈ کارنوالس رود کاویری کے قرب و جوار میں ٹیپو سے برسر پیکار تھا۔ ٹیپو سلطان کی فوج پیہم لڑائیوں سے خستہ حال ہو چکی تھی۔ انگریز غلبہ پا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ لال باغ کے پاس ٹیپو سلطان کے پچاس ہزار چیلوں نے جو اسد الٰہی کہلاتے تھے اس شد و مد سے چھاپا مارا کہ لارڈ کارنوالس کی ترپ کے سوار یک لخت پسپا ہو کر فرار ہونے لگے۔ ایسے موقع پر رفعت الملک اور ان کے ساتھی امرا نے ایسا حملہ کیا کہ چیلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ عاجز ہو کر

پیچھے ہٹنے لگے۔ ٹیپو سلطان نے سری رنگ پٹنم آ کر اپنے موروچوں میں پناہ لی۔"

رفعت الملک ثانی نے 1820 عیسوی میں انتقال کیا۔ ان کے پوتے میر عالم علی خاں ترک تاز۔ دو ہزاری ذات ایک ہزاری منصب۔ ان کے پوتے میر علی خاں (شادی جن کی فاطمہ بیگم بنت قاضی عبدالغفار سے ہوئی) حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ اولاد کینیڈا میں۔ تاریخ اس کینڈین اولاد سے بھی بہت دور ہٹ جائے گی۔

تیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آن کر آپ اچانک ایک ایسی سرزمین پر اُترے، جہاں چاروں طرف لوگ بانگ قطب شاہی اردو بول رہے ہوں تو کچھ تاریخی وقت میں گھپلا سا معلوم ہوتا ہے اور چاروں طرف وہی ازضیاتی وقت کی تراشی چٹانیں۔ ایرپورٹ سے بجائے علی غول و تورانی سواراں و تواڑی عالم علی صاحب نے کار میں بیٹھ کر رُخ بنجارہ ہل کا کیا۔ چڑھائی پر پہنچے۔ میں نے فاطمہ سے پوچھا "وہ بنگلے کہاں ہیں عزیز احمد کے ناولوں والے"۔

"بہت سے گر گئے۔ نئے بن گئے۔ وہ ادھر نواب فلاں جنگ کی کوٹھی ہے جن کو عزیز احمد نے "حسن نواز جنگ" کے نام سے پیش کیا ہے۔"

فاطمہ کے ہاں برآمدے میں ایک ذرا بھاری بھر کم مہاراشٹرین خاتون بیٹھی عالم علی خاں کی والدہ بیگم ہاشم علی خاں سے باتیں کر رہی تھیں۔

"شیوانتی۔" فاطمہ نے کہا "رام گوپال کی پارٹنر تھیں لندن میں۔"

انھوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ وقت کی تیز رفتار اور دنیا کے اختصار پر تبصرہ ہوا۔ شیوانتی کے شوہر نے پڑوس میں ایک بیگم صاحبہ کی کوٹھی خرید لی ہے۔ بنجارہ ہل کی نئی سوسائٹی۔ پنجابی کاروباریوں (مجھے وہ چار سال قبل کی ٹرین والی خاتون یاد آئیں) اعلیٰ افسروں کے مکان اور زیر تعمیر ملٹی اسٹوری اپارٹمنٹ۔ قدیم خاندان بھی بہت سے موجود اور تعمیرِ نو میں مصروف۔ بیگم مریم بلگرامی کا فون آیا۔ اور بیگم تقی بلگرامی کا۔ فاطمہ کی سب سے چھوٹی نند طاہرہ یونیورسٹیوں کی تعلیم

یافتہ اور کالج آف نرسنگ کی پرنسپل لنچ کے لیے گھر آئیں۔ وادی ایلورا کے رنگ برنگے پتھر ان کے ڈرائنگ روم کے دیوار میں پیوست شہر حیدرآباد ایک ایسا قدرتی لینڈ اسکیپ گارڈن جس کا ارتقائی مناظر نہ صرف تجریدی بلکہ جاپانی بھی تھا۔ ہر طرف وہ انوکھی چٹانیں جنھیں گویا ہنری مور اور بار برا ہیپ ورتھ نے تراشا ہوا ان کو ڈائنامائٹ سے اُڑا کر مکان بنائے جا رہے ہیں کیونکہ لوگاں کی عقلاں پر پتھر پڑ گئے ہیں۔

سنگ ہائے رنگا رنگ کی اس سرزمین پر ایلورا کی صنم تراشی میں مناسب کے چھپائے نور ازل بُت ہے آستیوں میں۔ وجد صاحب آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔

اختر سلطانہ کا خاندان سو سال سے پتھروں کا سوداگر ہے۔ ان کے شوہر بھی۔ کرناٹک میں ان کی پتھروں کی کانیں ہیں۔ ان کانوں میں اوپر تلے چوکور سلیں یوں دھری ہیں گویا الماریوں میں تہہ کی ہوئی ساریاں۔ اختر سلطانہ حیدرآباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر گیان چند کی طالب علم اور ریسرچ اسکالر ہیں۔ بنجارہ ہل پر ان کے ٹیرس سے شہر کا نظارہ کچھ ہالی ووڈ بول جیسا معلوم ہوتا ہے۔

حیدرآباد یونیورسٹی میں ضلع بجنور کے ڈاکٹر گیان چند جین، قائم چاند پوری کے ہم وطن، ولی اور سراج کے ہم وطنوں کو اردو کا درس دیتے ہیں۔ دور آصفی کی تعلیمی روایت کی نام لیوا ایک ہندو خاتون غزل پر پی ایچ ڈی کرتی ملیں۔ یہ نئی یونیورسٹی سروجنی نائیڈو کی کوٹھی GOLDEN THRESHOLD میں قائم کی گئی ہے۔ مگر یہ کرا سے ''سروجنی نائیڈو میوزیم'' ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ڈین آف فیکلٹی آف آرٹ ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر رضیہ اکبر، ڈاکٹر زینت ساجدہ، نامور محقق خواتین، حیدرآبادی خواتین عرصہ دراز سے لیڈر ہیں۔ انجمن ترقی اردو، ادارہ ادبیات اردو، آندھرا پردیش اردو اکادمی، اردو اکادمی آف ساؤتھ انڈیا وغیرہ کے جلسوں میں ہر عمر کی بے پردہ تعلیم یافتہ خواتین کا مجمع کثیر۔ رودرالیہ کے باہر ایک

ایرانی نوجوان آیت اللہ خمینی کی رنگین تصاویر تقسیم کر رہا ہے۔

گنبدوں (مقابر قطب شاہیہ) پر ایک تقریب بسلسلۂ گولڈن جوبلی ادارہ ادبیات اردو جو ڈاکٹر محی الدین زورؔ مرحوم نے قائم کیا تھا۔ ڈائس پر نائب صدر جمہوریہ جناب ہدایت اللہ آخری نظام کے پوتے شہزادہ مکرم جاہ۔ جناب اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی۔ دوسرے حضرات۔ محمد قلی قطب شاہ کے مقبرے کے نیچے۔ ہزارہا کرسیوں پر ہزارہا مردوزن۔ باہر بے شمار کاریں۔ لوگ باغات اور مقبرے کے چبوترے پر گھومتے پھر رہے تھے یا بچے عزیز وارثی کی قوالی اور ایک میاں بیوی (نام شاید ڈاکٹر اور مسز اکبر) سے قلی قطب شاہ کا "پیا باج پیالہ پیا جائے نا" سُن رہے تھے اور جذباتی طور پر اپنی تاریخ میں شامل اور اس سے وابستہ معلوم ہوتے تھے۔ ایسا ہم آہنگ مجمع صفدر جنگ یا ہمایوں کے مقبرے یا فتح پور سیکری میں نظر نہ آئے گا۔ اہل جون پور اس طرح گومتی کنارے اپنے بادشاہ سلطان حسین شرقی کا جشن منا کر اس کے خیال گائیں گے؟ توبہ کیجیے صاحب۔

"پیا باج پیالہ" کے سروں کے ساتھ سورج گنبدوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور سُرمئی آسمان کے مقابل میں گنبدوں کی سیاہ پرچھائیاں لرزہ خیز۔ کیفیت اس کی آئینۂ تحریر میں اُتر سکتی نہیں۔

اسکول میں نظم بلینہم BLENHEIM کی لڑائی کے متعلق بلیکی اینڈ سنز لندن کی چھپی رنگین تصویروں والی کتاب میں پڑھی تھی کہ گرما کی ایک شام اولڈ کیسپرؔ اپنا کام ختم کر کے کاٹج کے باہر بیٹھا تھا۔ جب اس کا پوتا کھیلتے کھیلتے ایک کھوپڑی اٹھالایا۔ جو اسے نزدیک کے کھیت میں پڑی ملی تھی اس کے سوال پر بوڑھے کیسپرؔ نے اس جنگ کا قصہ سنایا اور بولا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا تھا مگر بہرحال وہ ایک بہت مشہور فتح تھی:

"IT WAS A FAMOUS VICTORY"

گنبدوں سے کچھ فاصلے پر آہ! وہ جولا نگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار۔ اتنا وسیع، دلی اور آگرہ کے قلعے اس کے کونے میں سما جائیں۔ اندر عمارتوں کی دیواروں میں لگے سفالی پائپ جو پرشین وہیل کے ذریعے گرم و سرد پانی سارے قلعے کو سپلائی کرتے تھے۔ شاہی محل، دربار ہال، داد محل، رانی محل، موتی محل، خزانہ، لنگر خانہ، مساجد، حمام، مدارس، دیوان عام، دیوان خاص، تارامتی کی مسجد اور محلات، پریم متی، بالا متی، رکھی پڑی، ناچتی ہوں گی۔ اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں۔ تک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا۔

قطب شاہ نے ایک محل کے پانچ حصے کیے تھے۔ نقاشوں، خطاطوں، شاعروں، ادیبوں اور موسیقاروں کے لیے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر۔ بانی شہر حیدر آباد۔ اپنے دور حکومت میں کسی کو سزائے موت نہ دی جو حکم دیتا تھا سو یہ کہ کھو مطریاں کو بجائیں کھاج۔ اچھا کرتا تھا۔ چار مینار بنوایا گیا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ تعزیہ نما عمارت اس کے کارناموں کے بجائے سگرٹ کی ایک برانڈ کی وجہ سے مشہور ہوگی تو دکھی ہوتا۔ 47 برس کی عمر میں مر گیا۔

اور بیٹی اس کی خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم علم دوست سخن پرور۔ گولکنڈہ سے رخصت ہو کر بیجاپور گئی۔ محمد عادل شاہ سے بیاہ کے وہ۔ "جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی" اور اس کی "دھنی بی بی چاند سلطانہ ملکہ جہاں" کا پایہ تخت۔ جو اس وقت میں تھا بیجاپور شہر۔ سو اس شہر کی تھی جہاں میں خبر خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا۔ اسی کے کرم سوں وہ منصور تھا۔ ہوئے بادشاہ جب اورنگ زیب۔ کیے اس کو لینے تئیں کئی فریب۔ دیے بھیج فوجاں کی اوّل عتاب۔ جو جا کے کریں ملک سارا خراب[1]

اور گولکنڈہ کا سلطان عبداللہ قطب شاہ۔ اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ جیسا۔ شاعروں نے کہا۔ پھر جگ میں آیا محمد قلی۔ غواصی نے لکھا

سلطان عبداللہ جو شیر خدا کا شیر ہے
مشہور اس کی داب کا دو جگ میں ہے تروار آج

شاعر افضل قادری نے کہا۔

خدا ہور مصطفےٰ ہور مرتضیٰ ہور کل ولی رکھتے
ترے کوٹاں، ترے شہراں، ترے قلعے ترے کشور

خوش فہمی تھی۔ مغل آن پڑے۔ بے چارے کو وتی کی اطاعت قبول کرنی پڑی جبھی اس نے وہ مہر بنوائی تھی "ختم بالخیر والسعادۃ"

ادھر بیجاپور پر مغل حملے اور محاصرے کے وقت بے چارے آخری سلطان سکندر عادل شاہ نے ایک بزرگ بابا شاہ حسینی کو عریضہ بھیجا کہ دعا کریں مصیبت ٹل جائے یہ بھی نہ ہوا۔

سلطنت کے زوال سے اُداسی بڑھی۔ شاعروں نے مرثیہ گوئی شروع کی۔ خود عبداللہ قطب شاہ مرثیے لکھنے لگے۔

ع پڑے گا غم تمن پر جب مرا غم یاد کرنا تب
بغیر از ظلم بیدادی نہ تھی اس وقت کچھ شادی
ہوئی قاسم کی دامادی دیکھو تقدیر باری بھی
حسینؑ کا دردکھ دل میں آن لگا یک چت سوں دائم دھیاں
کرے قطب عبداللہ سلطان دُکھ سوں شہریاری بھی

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ فرماتے ہیں:

"غم والم کے ساتھ بادشاہت کرنے اور مجبور ہو کر اپنی لڑکی اورنگ زیب کے فرزند سلطان محمد سے بیاہ دینے کا ذکر اس مرثیے میں بہت واضح ہے۔ قاسم کی دامادی ظلم و بیداد کا نتیجہ نہ تھی بلکہ دراصل سلطان محمد کی دامادی کی طرف اشارہ ہے"۔[2]

ہر آخری مفتوح حکمراں فاتحین کے پروپگنڈے کا شکار ہوتا ہے۔ مغل پروپگنڈے نے ابوالحسن تانا شاہ کو بے ہودہ ناکارہ عیاش اور ظالم ظاہر کیا۔ برٹش پروپگنڈے نے سراج الدولہ، ٹیپو صاحب اور واجد علی شاہ کو۔ آج آزاد ہندستان کا ہندی اردو پریس اس نازک خیال شاعر اور عادل فرماں روا کی "تانا شاہی" کو ظلم اور سفاکی کی علامت کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ عالمگیری

پروپگنڈے کا سفر۔

ڈاکٹر زور فرماتے ہیں "اہل حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ ابوالحسن کے آٹھ ماہ تک محصور اور جرأت اور شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اس کی شریفانہ عادات اور تصوف و عرفان سے لگاؤ کی بنا پر اس کو حضرت امام حسینؓ سے تشبیہ دینے لگے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زوال حیدرآباد سے پہلے اور بعد اس شہر کے اکثر شاعر جن میں زیادہ تر سنّی المذہب تھے مرثیہ گوئی ہی میں منہمک رہے۔"

ایک شاعر نے کہ مرزا کہلاتا تھا سقوط گولکنڈہ کے بعد تانا شاہ کے غم میں فقیری اختیار کر لی اور کہا ع

ملا تھا بلبل سوں میں سحر گہ سنا ہوں احوال گلستاں کا
نہیں ہے کوئی گل بغیر نرگس دولے ہے گریاں غم چمن میں

راجہ رام نرائن موزوں سراج الدولہ کے لیے اور واجد علی شاہ اور ظفر کے لیے ان کی رعایا اسی طرح رونے والی تھی۔

ہم لوگ قلعے کے کھنڈروں میں گھوم رہے تھے جب ایک خشک حوض کے پاس جا کر گائیڈ بولا۔ "جب عبداللہ خاں قلع دار نے محاصرے کے دوران قلعے کا پھاٹک کھول دیا۔ مغل لشکر در آیا۔ تانا شاہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی بیگمات مغلوں کے ہاتھ پڑنے کے بجائے سب اس حوض میں کود کود کر جاناں دیدیے۔"

سہ منزلہ اسلحہ خانے کے نزدیک صدر دروازے کی عمارت میں ہزارہا بندوقوں کی نالیوں اور آہنی گولوں کا ڈھیر۔ گویا جنگ کل ہی ختم ہوئی ہے۔

دوپہر کی سنسناتی دھوپ میں فاطمہ اور اختر سلطانہ کے ساتھ بالا حصار کے اس شہر خموشاں میں گھومتے ہوئے اچانک مجھے میر سعد اللہ یاد آ گئے۔ یہ جد بزرگ نہٹور ضلع بجنور سے شاہجہاں

آباد آ گئے اور عامل مالوہ مقرر ہوئے۔ ''سید سعد اللہ در عہد سلطنت محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہٗ۔ ملک دکن ہم راہ افواج تشریف بردہ۔ در فتوحات متواتر حصہ کثیر فراہم آوردہ۔''

عین ممکن ہے کہ موصوف نے گولکنڈہ کی تاراجی میں حصہ لیا ہو۔ عالمگیر کے سرکاری کاغذات میں ''دارالجہاد حیدرآباد'' لکھا ملتا ہے۔ اس ''دارالجہاد'' میں میر سعد اللہ نے بھی خوب لوٹ مار کی ہوگی۔ اس تصور نے مجھے مزید افسردہ کیا۔

میں نے ایک آہنی گولہ اٹھایا۔ بہت وزنی تھا۔ اس پر بارود لگائی جاتی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کیا ہوا تھا۔ لیکن بہرحال یہ ایک مشہور فتح تھی۔

" IT WAS A FAMOUS VICTORY "

ڈاکٹر حسینی شاہد اپنی کتاب[3] میں ایک ''چکی نامے'' کے متعلق فرماتے ہیں۔ ''یہ چکی نامہ بارھویں صدی ہجری میں لکھا گیا اور اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وہ شدید ردِ عمل ملتا ہے جو فتح دکن کے بعد اورنگ زیب کے خلاف دکن میں عام تھا۔

بارھویں صدی آئی اورنگ زیب کی بادشاہی
قیامت کے آنے کی نشانی دیس میں آئی
انصاف اورنگ شہ کا شرعی آنے بھانے
ظاہر میں اخلاص سینے میں سب کینے

فاطمہ کہہ رہی تھیں کہ اہل حیدرآباد کسی ناپسندیدہ چیز کو اب تک عالمگیری کہتے ہیں۔ شام کو ہم لوگ حسین ساگر کے کنارے والی تفریحی سڑک پر سے گزر رہے تھے جب عالم علی صاحب نے کہا ''اسی راستے سے ابوالحسن تاناشاہ کو قلعہ دولت آباد لے گئے تھے۔ اسے بہت پیاس لگی تھی۔ یہیں پر ایک غریب آدمی نے مٹی کے کوزے میں اسے پانی پلایا۔ اس نے اپنی آخری انگشتری اُتار کر کوزے میں ڈال دی۔''

تاناشاہ قلعہ دولت آباد میں چودہ سال قید رہا۔ زندان ہی میں انتقال ہوا۔

FOR GOD'S SAKE LETS. SIR'

UPON THE GROUND AND TELL

OF THE DEATH OF KINGS[4]

کشمیر کا آخری سلطان یوسف شاہ چک وہ جلاوطن بہار میں مرا تھا۔

ملکہ حیات بخشی بیگم بیٹھی حقہ پی رہی ہیں۔ ایک بانکی شہزادی خنجر کمر سے باندھے اس شان سے کھڑی ہے کہ امریکن ویمنز لبرز اس کی کنیزیں معلوم ہوں۔ ایک ملکہ شہسواری میں مصروف۔

حضور۔ دکھن قلم کے یہ مینا تور خیالی نہیں۔ نہ ان درباری مصوروں کی یہ ہمت ہو سکتی تھی کہ وہ دلی آگرہ لاہور اور دکھن کی بیگمات اور شہزادیوں یا چوگان کھیلتی ملکہ نور جہاں کی تصویر فرضی ہی بنا سکیں۔ جب تک ان کو باضابطہ حکم نہ دیا جاتا۔ تو کیا یہ خنجر بکف اور شہسوار شہزادیاں پردے میں مقید تھیں؟ مسئلہ۔

دکھن قلم مغل اسکول کا ہم عصر مگر اس کے میناتوری پورٹریٹ شاہوں اور امرا اور بیگمات کے، اور راگ مالا کی "راگنیوں" کی صورتیں STYLISED کے بجائے حیرت انگیز حد تک ریلسٹک۔ بادشاہوں کے رنگ گہرے سانولے۔

مغل دکھنی گجراتی میناتور کا ذخیرہ سالار جنگ میوزیم کے اڑتیس (38) ایوانوں میں سے ایک میں موجود ہے۔ یہ سارا عجائب خانہ اس لیے محیر العقول ہے کہ محض ایک فرد (سر سالار جنگ ثالث نے بہ عمر ساٹھ سال 1949 میں رحلت کی) اور کچھ ان کے باپ نے مشرق و مغرب کے ان نوادر کا اتنا زبردست عظیم الشان ذخیرہ کس طرح جمع کیا اور اس کا نصف سے زیادہ حصہ کریٹوں میں بند ہے جو ابھی کھولے ہی نہیں گئے! بہت سی بیش بہا اشیا قالین وغیرہ افراتفری کے دنوں میں چوری ہوئے۔ ان نوادر کی مالیت اب اربوں روپے میں کمپیوٹ کی جائے گی۔ مگر وفات کے بعد سر سالار جنگ مرحوم کی (جو بیچلر تھے) اتنی دولت باقی تھی کہ ان کے دور کے رشتہ داروں کو بھی لاکھوں روپیہ ترکے میں ملا۔

"امرائے حیدرآباد میں سے بعض کی جاگیریں رام پور اور بھوپال کی ریاستوں سے زیادہ

بڑی تھیں۔" ایک صاحب نے مجھ سے کہا" مگر زیادہ تر کی اولاد تعلیم سے بے نیاز۔ جاگیرداری کے خاتمے کے بعد بہ طور تلافی حکومت آندھرا پردیش نے ان روٴسا کے بیٹوں کو گزیٹیڈ ملازمتیں پیش کیں مگر بہت کم اس کے اہل نکلے۔"

"لیکن ان روٴسا کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی تھی؟"

"یہ تلنگانہ تحریک کی کلاس وار چلانے والوں سے پوچھئے۔"

"تلنگانہ تحریک کہاں گئی؟"

"پارٹی کے قائدین سے پوچھیے۔"

"وہ جو بہت بڑی کوٹھی سامنے دیکھتی ہیں۔" دوسرے صاحب نے کہا۔" اس کے مالک نے اسے پچھلے دنوں واجبی داموں پر ایک دوست کے ہاتھ اس لیے فروخت کر دیا کہ اس پر ایک منسٹر کے دانت تھے۔ اگر ذرا دیر کرتے وہ منسٹر اسے کوڑیوں کے مول خرید لیتا اور مالک مکان چوں نہ کرسکتا۔"

یہ بھان متی کا پٹارا دیکھو۔ جاگیردار گل منسٹر حاضر۔

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ شاہراہ کے دونوں جانب کمائی مزدور تیشہ زنی میں مصروف۔ چٹانیں توڑ کر نئے ایوان پرویزی تعمیر کر رہے ہیں۔

شہر کی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے فاطمہ بتلاتی جاتیں وہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی ڈیوڑھی ہے۔ وہ سرسالار جنگ کی۔ وہ عثمان علی پاشا کی کنگ کوٹھی۔ اور بہت سی "ڈیوڑھیوں" کے کھنڈر۔ سراج اورنگ آبادی کہہ گئے تھے۔

چشم عبرت سے تماشائے جہاں کرتا ہوں
خاک در خاک ہے یہ انجمن گل در گل

پولس ایکشن کے بعد بے شمار خاندان پہلے پاکستان اور اس کے بعد انگلستان۔ کینیڈا اور

امریکہ جا بسے۔ کیا بودوباش پوچھو ہو مغرب کے سا کنو۔

علی پوسٹ پولس ایکشن جنریشن کا ایک ذہین اور حساس نوجوان ہے۔ اس کی نثری نظموں کا مجموعہ 'کاسۂ روح' 1970 عیسوی میں چھپا تھا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اس کی رسم اجرا ادا کی تھی (نئی کتابوں کی ''رونمائی'' اور مصنف کی گل پوشی حیدرآبادی رسم ہے اور شاید یہیں سے پاکستان پہنچی،

سلیٹی آسمان
کے تپتے سائے تلے
میں ایک نقطۂ معدوم
بڑے صبر سے
بڑی دیر سے
بیٹھا ہوں
کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے
پھر لکھتا ہے—
ایسا کریں
اپنے بچوں کے ساتھ
ایک نئی دنیا بسائیں
جہاں
سارے سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے
پتلے اُلٹے لٹکا دیں
قطار در قطار
اور دنیا سے کہیں
دیکھو یہ میرا فیصلہ ہے!

علی بھی اب لندن میں رہتا ہے۔ لیکن بہت سوں کو جاگیروں کے معاوضے میں جو بونڈ ملے تھے وہ بیچ بیچ کر فضول خرچیوں میں اُڑا دیے۔ بنی پہ کیوں اترائے مورکھ بگڑی پہ کیوں روئے۔ کرمن کی گت نیاری۔ مگر یہ قوم کسی بڑے سے بڑے سانحے سے سبق لینے والی نہیں۔ ادھر مرادآباد فرخندہ بنیاد میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دو سال قبل اتنا خونناک فساد ہوا تھا۔ مسلمان تجار اور کارخانہ داروں کی آمدنی ہزاروں اور لاکھوں روپے روزانہ تک پہنچ چکی ہے سابی رفتار سے ان کا اسراف ترقی پر ہے۔ جہیزوں کے ماہی مراتب نکلتے ہیں۔

حیدرآباد میں ایک صاحب نے کہا کہ اب تو برقعے والیاں یعنی ورکنگ کلاس عورتیں سونے کے زیور بنوا رہی ہیں۔ ان محلوں کے تقریباً ہر گھر سے ایک نوجوان مڈل ایسٹ گیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک تعلیم یافتہ، خوش حال ملازمت پیشہ یا کاروباری مڈل کلاس وجود میں آچکا ہے۔ ایک نوجوان مسلمان تاجر نے نظام کی ایک پرانی حویلی خریدی ہے۔

مدینہ بلڈنگ۔ ایک وقت تھا جب تیل کی دریافت سے قبل سعودی عرب کی آمدنی حاجیوں اور کھجوروں پر مشتمل تھی۔ تب مدینہ بلڈنگ ٹرسٹ کا روپیہ بطور امداد وہاں بھیجا جاتا تھا۔ بازار کے اسی راستے سے اب نئے دولت مند بوڑھے عرب اپنی کمسن عارضی دلہنوں کو شاپنگ کے لیے لے جاتے ہیں۔ دکھلائیے لیجا کے اسے مصر کا۔

مدینہ بلڈنگ کا موڈل بلقیس علاء الدین کے ہاں بارہ بل پر موجود ہے۔ بلقیس کے خسر ایک خوجہ انڈسٹریلسٹ اور ملک التجار اس کے مالک تھے، بلقیس انگریزی اخباروں میں مضمون لکھتی ہیں۔ جب بمبئی آتی تھیں حیدرآباد کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ قلعہ گولکنڈہ کے اندر ایک پلے کروا چکی تھیں۔ ان دنوں انھوں نے اسمٰعیل مرچنٹ اور روتھ جھب والا کی فلم HEAT AND DUST کی شوٹنگ نظام کی ایک حویلی میں کروانے کا انتظام کیا تھا۔ جولی کرسٹی آئی ہوئی ہے۔

صبا زیدی کا فون بلقیس کے پاس آیا۔ لندن فیسٹیول کے لیے حیدرآبادی ملبوسات آپ کچھ انتظام کر سکتی ہیں۔

اردو کی طرح مسلم تہذیب بھی ایک EXOTIC چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ "اچھا یہ بتایئے۔ یہاں کے اردو اخباروں رسالوں میں گیاس، میاچس، بیاک گراؤنڈ، فیاکٹری کیوں لکھا جاتا ہے؟" میں نے علاء الدین صاحب سے دریافت کیا۔

"کیوں بھئی تم نے یہ کھانا کس چیز پر پکایا ہے؟" جواباً انھوں نے ملازم سے پوچھا۔

"گیاس پر۔" اس نے جواب دیا۔

پہلے میں آپ کو حیدرآباد کی بیاک گراؤنڈ بتاتا ہوں۔ سنیے۔ ایک روز شہزادہ قطب قلی موسیٰ ندی کنارے شکار کھیل رہا تھا۔ ایک جھونپڑی میں اسے بھاگ متی نظر آئی۔ عاشق ہوا۔ بھاگ متی سے شادی کی۔ حیدر محل نام رکھا حیدرآباد بسایا 1591 عیسوی میں۔"

فلک نما پیلس کے تذکرے تک پہنچنے کے لیے اس محل کے نگراں ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل عباس عابدی نے قصہ شروع کیا۔ پریوں کی کہانی معلوم ہوتا تھا۔ کیا یہ لوگ اب تک پریوں کی کہانیوں میں رہتے ہیں۔ لیکن حیدرآباد رومانس کا شہر ہے اور اب سروجنی نائیڈو کی شاعری کا رومانس اور حیدرآباد کے متعلق ان کی خوب صورت نظمیں سمجھ میں آتی ہیں۔

"اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے یہ محل تعمیر کروایا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز ولایت سے منگوائی گئی تھی۔ پھر اسے وائسرائے کے لیے مہمان خانہ بنا دیا گیا۔"

کرنل عابدی نے زار روس کے کسی محل جیسے اس شاہی مہمان خانے کے گرینڈ اسٹرکیس پر چڑھتے ہوئے ارشاد کیا۔ زینے کی دیوار پر کلائیو سے لے کر ماؤنٹ بیٹن تک کی تصاویر آویزاں تھیں۔ بیش بہا فرنیچر اور سامان آرائش (بہت سا گرد زدہ ہو چکا) فلک نما پیلس جس کی بلندی سے سارا شہر نظر آتا ہے موجودہ نظام مکرّم جاہ کی ذاتی جائیداد ہے۔ وہ خود

آسٹریلیا جا بسے۔

"میں گیارہ سال اعلیٰ حضرت کی پیشی میں رہا اور کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم کو خدا نے خدمتِ خلق کے لیے پیدا کیا تھا ـــــ" کرنل عابدی نے فرمایا جو اپنے کہے ہوئے مرثیے مجالس میں پڑھتے ہیں۔ مرزا اور دوسرے مراثی نگاروں نے زوال گولکنڈہ اور بیجاپور کے بعد مرثیے لکھے تھے۔

حیدرآباد میں شیعہ سنّی جھگڑا ابھی مفقود ہے۔ قدیم عاشور خانوں کے متولی زیادہ تر سنّی ہیں۔ نہایت عظیم الشان محرم ہوتا ہے۔ قلی قطب شاہ کی والدہ کی منت کا "بی بی کا علم" ہاتھی پر نکلتا ہے۔ ساتھ دو تین لاکھ آدم سنّی شیعہ کا جلوس۔

ایوان اردو باہر سے جتنا خوب صورت ہے اندر ادارہ ادبیات اردو اتنا ہی افسردہ حال۔ کھلی الماریوں میں گرد آلود نادر اور اہم کتب و مخطوطات و شاہی فرامین دیمک اور چوروں کے منتظر۔ اودھ پنچ 1875 عیسوی کا فائل برقی پنکھے کے نیچے پھڑپھڑاتا ہوا۔ ایک طرف اکبر کی "ذوالفقار" جس پر "جلال الدین محمد اکبر" کندہ ہے اس طرح رکھی ہے گویا باورچی خانہ کا چاقو پڑا ہو۔

محض پانچ ہزار سالانہ کی گرانٹ سے بہتر انتظام ناممکن۔ کیوں صاحب آجکل اردو کے لیے کم از کم پیسے کی کمی کی شکایت تو نہیں کی جا سکتی۔ آندھرا پردیش کے مختلف اردو اداروں کو لاکھوں روپے سالانہ کی گرانٹ مل رہی ہے ان میں سے کچھ رقم اس قابل قدر ادارے کو نہیں دی جا سکتی۔

اندر ہال میں محمد قلی قطب شاہ کے اشعار۔

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر رکھیا توں جوں دریا میں مِن یا سمیع

اور دکنی کا۔

دکھن سا نہیں ٹھا ر سنسار میں
بخ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

وغیرہ۔ اور ایک سلوگن جو خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں ادارے کو دیا تھا

"اللہ ہر دم۔ اُردو ہر گھر"

اردو ہال میں انجمن ترقی اُردو کا کُل ہند اجلاس ہونے والا تھا۔ ایک طرف کتابوں کی نمائش جاری تھی۔ پنڈت آنند نرائن ملا، بیگم عابدہ احمد، پروفیسر ثریا حسین، جناب مالک رام، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، محترمہ حمیدہ سلطان، ڈاکٹر خلیق انجم، سیدہ طیبہ بیگم، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، بانو طاہرہ سعید، سری نواس لاہوٹی، راج بہادر گوڑ، چندر سری واستو، نریندر لوتھر، وشوناتھ طاؤس، شفیقہ فرحت اور نجمہ نکہت صفیہ اریب خواتین و حضرات ایک شامیانے کے نیچے چائے پینے میں مصروف تھے۔ برآمدے میں پرنس مکرم جاہ ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھے اجلاس شروع ہونے کے منتظر سامنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ سلطانیِ جمہور کے زمانے کے لوگ ان کے سامنے آ جا رہے تھے۔ اپنے اپنے کاموں اور باتوں میں مصروف۔ کاخ امرا کے در و دیوار کب کے ہل چکے۔ پرنس کے دادا نظام دکن اور نانا سلطان عبدالمجید کے حضور میں امرا دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔

شہزادہ مکرم جاہ، پرنس اعظم جاہ پرنس آف برار اور شہزادی در شہوار کے فرزند، اور موجودہ نظام (''موجودہ سابق نظام'' تو ذرا عجیب سا لگے گا) مکرم جاہ کے چھوٹے بھائی نہایت منکسر المزاج، خالص حیدرآبادی اُردو بولتے ہیں اور زیادہ تر انگلستان میں رہتے ہیں۔

سنا ہے یہاں کے بیش تر امرا منکسر المزاج تھے اور اس بندی نے اہل حیدرآباد کو بے حد شائستہ، خلیق، متواضع اور سراپا انکسار پایا۔ صحیح معنوں میں متمدن۔

''محض نوابوں کی عیاشیاں ہی تو حیدرآبادی تہذیب نہیں تھی۔ اعلیٰ حضرت کی سرپرستی میں کتنی ترقیاں ہوئیں۔ ہمارا سوشل ویلفیئر اور ایڈمنسٹریشن کئی لحاظ سے برٹش صوبوں سے بہتر تھا۔

حضور نظام نے اردو اور تعلیم نسواں کی طرف کتنی توجہ دی۔ 1895 عیسوی میں نظام گورنمنٹ نے سروجنی نائیڈو کو وظیفہ پر انگلینڈ انگلستان بھیجا تھا۔ اس کے بعد درجنوں ہندو مسلم پارسی خواتین کو۔ دوسری بات یہاں ہندو مسلم منافرت نہیں تھی۔ وہی مخلوط تہذیب جس کی بنیاد دکھنی سلطنتوں کے بادشاہوں نے رکھی تھی بہمنی دور سے۔"

برآمدے میں ایک صاحب نے رنجیدہ آواز میں مجھ سے کہا" حیدرآباد کی اسّی فیصدی پبلک عمارات حضور نظام کی بنوائی ہوئی ہیں!!"

مجھے وہ مضامین یاد آئے جو حیدرآبادی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے متعلق نصیرالدین ہاشمی مرحوم عصمت میں لکھا کرتے تھے۔ اندر ہال میں ایک صاحب نے بڑی لجاجت سے اپنا تعارف کرایا۔" میں نصیرالدین ہاشمی مرحوم کا بیٹا ہوں۔"

"کیا میر عثمان علی خاں بہت ہردلعزیز تھے؟" میں نے ایک اور صاحب سے پوچھا۔

"جب ان کا انتقال ہوا اُن کو معزول ہوئے کئی برس گزر چکے تھے لیکن ان کے جنازے کے ساتھ لاکھوں آدمی تھے جو زار زار رو رہے تھے۔

ع "اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھولنے والی نہیں۔"

"مگر مرحوم کی وہ ECCENTRICITIES اور عیاشیاں۔"

"مَی باؤ۔ ہر تصویر کے دو رُخ ہیں۔ تابناک رخ بھی ہم نے دیکھا ہے۔"

"وہ مصطفےٰ لاج ہے۔" فاطمہ نے ایک روز ایک راستے پر سے گزرتے ہوئے ایک سمت اشارہ کیا۔" ماموں میاں اس میں رہتے تھے۔ یہیں انتقال ہوا۔"

سر یعقوب نے ہندستان میں خلع کا قانون بنوایا تھا۔ ان کی دکن آمد پر کسی اخبار نے لکھا۔ کل صبح بن کے وہ غارت گر قوم آتے ہیں چوٹ پہ ڈنکے کی آتے ہیں بزعم آتے ہیں سر محمد جنھیں سب کہتے ہیں قوم آتے ہیں۔" علی گڑھ کالج میں ساتھیوں نے ان کو" قوم" کا خطاب

دے رکھا تھا۔

''ماموں میاں کو عثمان علی پاشا نے بہ طور مشیر خاص دکن بلوایا تھا۔'' فاطمہ نے کہا۔''کرسی پیش کی جاتی تھی۔''

''کیا مطلب؟ لوگ کرسیوں ہی پر تو بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں تھا۔''

لو صاحب۔ یہ درباروں کی دنیا اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔ سات سو سال سے اہل دکن دربار داری اور حفظ مراتب کے عادی تھے۔ کچھ لوگ شہریار وقت کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ کچھ بیٹھے ہیں اور ہر بڑا جاگیردار جو اپنا اپنا دربار لگاتا تھا وہ الگ۔ سرسالار جنگ کے دربار کا سامان میوزیم کے ایک ہال میں سجا ہوا ہے۔

''ماموں میاں کی موٹر کار کوٹھی کے اندر تک جاتی تھی۔'' فاطمہ نے کہا ''یہ بھی ایک خصوصیت تھی۔''

مولوی محمد یعقوب جب مراد آباد میں وکالت کرتے تھے ان کی شادی وحیدہ بیگم بنت شمس العلما سید ممتاز علی سے ہوئی تھی۔ 1917 عیسوی میں وفات پائی۔ سر یعقوب نے دوسری شادی نہ کی۔ نذر خالہ نے ممانی کا مرثیہ لکھا تھا۔

ع ''کیوں جلد سفر تم نے کیا ہائے وحیدہ۔'' فاطمہ نے بتایا۔

''سر یعقوب مرحوم قاضی عبدالغفار کے بہنوئی تھے۔ بہن فاطمہ کو گیارہ دن کی چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوئیں۔'' ماموں میاں مجھے اپنے ہاں لے آئے۔ بے حد لاڈ پیار سے پالا۔ چار سال کی تھی جب خالہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ میں ان کو سارے گھر میں ڈھونڈتی پھری۔ ماموں میاں بولے ''تمھاری اماں تو مٹی کی تھیں مٹی میں مل گئیں۔''

''مجھے ایک بہت دھندلی سی یاد ہے مراد آباد کی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ سحری کے وقت نذر خالہ[5] اور ماموں میاں میں مذاق ہو رہا تھا۔ نذر خالہ سحری ختم کر چکی تھیں اور ماموں میاں ابھی کھانے میں مصروف تھے۔''

''اماں نے شاید مذاقاً کہا ہوگا۔ آپ لوگوں کے روزے اسی وجہ سے قبول نہیں ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

گھر پہنچ کر فاطمہ نے چند پرانی تصاویر نکالیں۔ سر یعقوب حیدرآبادی دستار پہنچے۔ متبسم چہرہ بے حد سوئٹ لگ رہے تھے۔ ''ماموں کے کانوں بالیاں۔ بھانجی اینڈی اینڈی پھریں'' ۔ وہ فاطمہ سے کہتے تھے۔

''مجھے ان کی ایک جھلک یاد ہے۔ لکھنؤ میں ہمارے ہاں ڈرائنگ روم میں بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ سُرخ و سپید بشاش چہرہ سر پہ تُرکی ٹوپی اگلے ماہ ہی حیدرآباد سے ان کی سناؤنی آئی۔''

''نومبر 1942ء'' فاطمہ نے کہا ''ماموں میاں یہاں اپنی اصول پرستی اور اخلاق کی وجہ سے نہایت ہردلعزیز تھے۔ ان کی ضیافتیں بہت مشہور تھیں۔ نوکروں سے بے حد لجاجت سے بات کرتے تھے۔ ایک روز ان کے ایک ملازم نے ان سے کہا صاحب بہت ضعیف ہوگیا ہوں مراد آباد واپس جانا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے۔ میری چار دن کی زندگی اور باقی ہے کیوں ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو۔۔۔ اتفاق دیکھو۔ ٹھیک چوتھے دن اچانک ماموں میاں کا انتقال ہوگیا۔''

''عجیب باتیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتیں۔ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ رمیش سنگھوی ایک صاحب تھے۔ ایک دن وہ بار بار شاہ ایران سے کہہ رہے تھے۔ یور میجسٹی۔ یہ ایران کا میرا آخری ٹرپ ہے۔ اس کے بعد کبھی نہیں آؤں گا۔ بالکل صحت مند اور بشاش کئی بار یہ جملہ دہرایا۔ طہران سے لندن جاکر کچھ روز بعد ہی چل بسے۔''

فاطمہ نے اپنا ایک مضمون نکالا (موصوفہ نے شدید سنس آف ہیومر اور لکھنے کی صلاحیت اپنے والد مرحوم سے ورثے میں پائی ہے۔ گو اس موخرالذکر صلاحیت کو زیادہ استعمال کرنے کی قائل نہیں)

''دسمبر 1942 عیسوی میں چچا سجاد نے ابا کو لکھا تھا۔۔۔ میں تمہیں تعزیت نامہ کیا لکھوں ''ہمدم دیرینہ کی یاد میں'' تعزیت بھی ہے اور دوستوں کو چھوڑ جانے والے دوست کے نام ایک

پیام بھی۔ یعقوب کی قوم پرستی کی نہیں احباب پرستی کی یاد مجھے تڑپا رہی ہے۔"

میں نے اس نظم پر نظر ڈالی۔ یعقوب سا اب کوئی نہ آئے گا دوبارا۔

مضبوط پکڑتے تھے سر رشتہ اُلفت — یہ کیا جھٹک کر اسے خود توڑ گئے تم
اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے — یہ شرط رفاقت تھی ہمیں چھوڑ گئے تم
بے کار ہے بے کار ہے اخلاص و محبت — اب کوئی نہ ہوگا حزن جادہ اُلفت

"اور اس کے صرف تین مہینے بعد ہی ہم لوگوں کو فیض آباد روڈ تمھارے ہاں چچا سجاد کی تعزیت کے لیے جانا پڑا۔!"

"نسلیں ایک ساتھ نمودار ہوتی ہیں ایک ساتھ غائب۔ جوش و فراق کیا آگے پیچھے گئے۔" میں نے کہا" چچا غفار نے لکھا تھا۔ وہ دور بہاراں بیت گیا، روداد جوانی ختم ہوئی۔ اگلوں کو زمانہ کیا دے گا اپنی تو کہانی ختم ہوئی۔"

"ماموں میاں کی وفات کی اطلاع پر عثمان علی پاشا مصطفےٰ لاج آئے۔ نوکروں پر خوب گرجے کہ یہ نہ سمجھنا کہ یعقوب یہاں تنہا تھا۔ میں موجود ہوں۔ ماموں میاں مراد آباد میں دفن ہونا پسند کرتے۔ عثمان علی پاشا نے ان کو خطہ صالحین میں دفن کروایا۔ ماموں میاں کے تین قریبی دوست چچا سجاد، سر رضا علی اور خواجہ حسن نظامی تھے۔ آغا حیدر حسن دہلوی علی گڑھ میں ان سے جونیئر تھے۔ ماموں میاں کے انتقال کے بعد آغا چچا کی والدہ دادی حضرت نے اپنے ایک بیٹے کی جواں مرگی کا قصہ سُنا کر مجھے دلاسہ دیا۔"

آج کے ہندستان میں بہت سوں نے سر یعقوب کا نام بھی نہیں سُنا ہوگا۔ پچھلی نسلوں نے کیسے GIANTS پیدا کیے۔ بڑی REVEALING بات یہ ہے کہ لوگ طرا مجھ سے کہتے ہیں آپ اپنی تحریروں میں گزشتہ حضرات کو بالکل فرشتہ بنا کر پیش کرتی ہیں، کردار کے بحران نے لوگوں کو CYNICAL بنا دیا ہے۔" میں نے کہا۔

اب فاطمہ نے گویا وقت کے MOVIEOLA کو سوئچ بیک کرکے ایک اور FREEZE SHOT پیش کیا۔

"ذرا ان لوگوں کو پہچانو۔"

میں نے غور سے دیکھا۔ کرسیوں پر کمسن فاطمہ۔ ڈھائی سالہ یاسمین اعجاز۔ دو پیچ کی ساری باندھے جواں سال حجاب امتیاز علی۔ سر محمد یعقوب۔ بیرسٹر ابوالحسن۔ نوعمر ثریا حمید علی۔ پیچھے ایستادہ سید امتیاز علی تاؔج۔ اور ابوالحسن صاحب کے دونوں بیٹے۔ شملہ۔ 1938ء۔

سر یعقوب شاید اس زمانے میں کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر تھے۔ مجھے چچا ابوالحسن کی ایک جھلک بھی یاد آگئی۔ نوکیلی مونچھیں۔ ڈریسنگ گاؤن۔ منہ میں پائپ۔

"بے حد صاحب آدمی تھے۔" میں نے کہا۔

شام کو اردو فکشن کے مورخ ڈاکٹر یوسف سرمست مع بیگم تشریف لائے۔ چند مہمان اور موجود تھے۔ میں نے اس گروپ فوٹوگراف میں حجاب کی تصویر ان کو دکھلائی۔ "پہچانیے تو کہ یہ کون خاتون ہیں۔"

"یہ سب کون لوگ ہیں؟" اور نوجوان نے دریافت کیا۔

"پھر گراموفون بجانا پڑے گا۔ بہرحال سنیے۔" میں نے کہا "والدہ شمس العلما سید ممتاز علی کی منہ بولی بہن تھیں۔ مولوی ممتاز علی کے دو بیٹے تھے۔ سید حمید علی اور امتیاز علی تاؔج۔ اور ایک بیٹی وحیدہ بیگم جو اماں کی بچپن کی سہیلی تھیں۔ وحیدہ بیگم کا بیاہ سر محمد یعقوب سے ہوا تھا۔

"حجاب اسمٰعیل بھی اماں کی سہیلی تھیں۔ میرے والدین اور سر یعقوب نے ان کا رشتہ امتیاز بھائی سے کروایا۔ شاید 1934 عیسوی میں قصہ مختصر۔"

"دوپلی کی ساری باندھ رکھی ہے!" ایک نوعمر لڑکی نے بہ غور دیکھ کر کہا۔

"تازہ ترین فیشن تھا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ خود نامور ادیبہ انسان کی طرح ادب بھی سرعت سے چولے بدلتا رہتا ہے۔ دو سال قبل یہ چند روز کے لیے دلّی آکر واپس لاہور گئیں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

''نہیں صاحب۔'' میں نے بعد میں فاطمہ سے کہا'' پرانی تصاویر سمجھانا مشکل کام ہے۔ ان لوگوں کے دور کو ابھی محض چالیس پچاس سال ہی گزرے ہیں۔ تو وہ مر تھے۔ صحن چمن یا مہتابی یا بارہ دری یا شکار گاہ یا محفل سماع میں جمع لوگ۔ وہ سب بھی گروپ تصویر کھنچوانے کے لیے باقاعدہ تازہ ترین فیشن کے لباس پہن کر بیٹھتے ہوں گے۔ اسکیچ شروع کرنے سے پہلے مغل یا دکھنی مصور گروپ اور پوز ARRANGE کرتا ہوگا۔ اس طرف دیکھیے۔ مسکرائیے۔ تلوار کے قبضے پر یوں ہاتھ رکھیے۔ گلاب کا پھول انگلیوں میں اس طرح تھامیے۔ بیچان کی نے اس طرح۔ پھر ملبوسات اور بیک گراؤنڈ کے لحاظ سے کلر اسکیم طے کرتا ہوگا۔ مصوروں نے جوان لمحات کو FREEZE کیا ہم ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کو غائب ہوئے تو تین چار سو سال ہو گئے۔

''اماں ہی کو لو۔ وہ اپنی حیدرآبادی دوستوں بیگم سربلند جنگ اور بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا اور جنے کس کس کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ مجھے ان کے نام تک معلوم نہیں۔ خود اماں کو گئے پندرہ سال ہو جائیں گے اور وحیدہ بیگم لیڈی یعقوب کو پینسٹھ سال سے زیادہ۔ مگر بھئی ایک بات اور ہے۔'' میں نے ذرا سر کھجا کر کہا۔ اس رفتار سے تو سقوط گولکنڈہ زیادہ پرانا واقعہ معلوم نہیں ہوتا۔ 1687 عیسوی ہی کی تو بات ہے۔''

''اور 1857 عیسوی پرسوں کا قصہ سمجھو۔'' فاطمہ نے کہا۔

قاضی عبدالغفار مرحوم کے دادا حامد علی شہر مرادآباد کے قاضی تھے۔ ایام غدر میں انھوں نے بد بخت شہزادہ فیروز بخت کو پناہ دی۔ اس وجہ سے انگریزوں نے قاضی صاحب کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی۔ محلہ تمباکو والان میں ایک لالہ جی تھے جن کی دوکان پر قاضی جی شام کو بیٹھ کر گپ شپ کیا کریں تھے۔ ون نے رات کو قاضی جی کے دروازے کی کنڈی کھڑکھڑائی اور ان کی بیوی سے کہا قاضی جی کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔ چل کر اس کا انتظام کیجیے۔ وہ دکھیاری ڈلائی اوڑھ لالہ جی کے ساتھ گئیں۔ پھانسی پانے والوں کی لاشوں کے انبار میں سے میاں کا جسد خاکی

ڈھونڈا۔ گڑھا کھود کر دفن کیا۔ نشان کے طور پر سرہانے ایک ٹہنی لگاتی آئیں۔ انگریزوں نے جائیداد ضبط کرلی۔

قاضی جی کی گھرانے میں نئی دلہن کا منہ سب سے پہلے لالہ جی کی بیوی آکر دیکھتی تھیں۔ پہلے آنچل سے مُٹھی کھول کر دیتیں۔ اس کے بعد رونمائی کی رسم شروع ہوتی۔

اس سوال کا کہ پہلے کی اور آج کی دِلّی میں کیا فرق ہے۔ پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی نے اپنے آخری ٹیلی ویژن انٹرویو میں جواب دیا تھا "پہلے ہندو مسلمان کھاتے الگ الگ تھے۔ دل ایک تھے۔ اب کھاتے ایک ساتھ ہیں دل جدا ہو گئے ہیں۔"

"آغا صاحب مرحوم کی صاحبزادی شہزادی بیگم اور داماد معظم صاحب کے مکان واقع بنجارہ ہل کے بیرونی چبوترے کے گرد لال قلعہ دِلّی کی مینا توری پیمانے پر بنی سُرخ فصیل اور پھاٹک استادہ ہے۔ اندر چٹان پر سے آبشار حوض میں گرتا "فصیل" کے نیچے سے گزرتا باغ میں جارہا تھا۔ بیرونی کمرے میں دروازے کے عین مقابل آغا صاحب مرحوم کا بشاش روغنی پورٹریٹ۔ روشن متبسم آنکھیں۔ متبسم شگفتہ چہرہ۔ مغلیہ لباس۔ لگتا تھا ابھی بولنا شروع کردیں گے۔ یہ تصویر ان کی مصور نواسی نے پیرس میں بنائی تھی۔ معظم صاحب اور شہزادی بیگم اٹھارہ سال پیرس میں رہے۔ کچھ عرصہ آغا صاحب بھی ان کے ہاں مقیم پیرس میں نہایت مقبول ہوئے۔

پائیں باغ میں حوض کے کنارے مسندوں پر دِلّی والوں کا مجمع۔ حمیدہ سلطان باجی اور نجمہ بیگم۔ خواجہ حسن ثانی نظامی جو صبح کی فلائٹ سے تشریف لائے تھے۔ خواجہ صاحب ہی نے دِلّی دوردرشن پر آغا صاحب مرحوم کا آخری انٹرویو کیا تھا۔

معظم صاحب جو ایک قدیم حیدرآبادی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور شکلاً فرانسیسی کاؤنٹ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی مصور بیٹی کا شوہر خود ایک فرانسیسی کاؤنٹ ہے جسے حیدرآبادی لباس پہنا کر نکاح پڑھایا گیا تھا۔ مکان کے اندر آصف جاہیوں کی تصاویر۔ باہر وہ کمرے مع کتب خانہ بند پڑے تھے جن میں آغا حیدر حسن مرحوم رہا کرتے تھے۔ چبوترے پر استادہ اونچے

درخت زرد پتے گرا رہے تھے۔

"آپ کا لگایا ہوا وہ پودا خوب بڑھ گیا۔" خواجہ حسن ثانی نظامی نے فرمایا۔

درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں کھِرنی کا ایک تناور درخت ہے جسے چودھویں صدی عیسوی میں مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ بخاری لگا گئے تھے۔

گزشتہ سال خواجہ حسن ثانی نظامی نے کھِرنی کا ایک پودا بحیثیت یکے از احفاد مخدومؒ اس کم ترین سے درگاہ حضرت خواجہ حسن نظامی میں لگوایا۔ (کہاں مخدوم جہانیاںؒ کہاں یہ محرر۔ مگر پودے کو کیا معلوم ہوتا۔ بوجہارے علم لدنی کے۔ سو جہارے حقیقتان دین و دنیا کے۔ وہی جانتے ہوں گے)

"ایک حیدرآبادی حویلی دیکھنا چاہتی ہوں کہ ہماری حویلیوں سے اس کا طرز تعمیر کس حد تک مختلف ہے۔"

"یہاں کی حویلیاں بہت زیادہ بڑی ہیں" خواجہ حسن ثانی نظامی نے فرمایا۔ "کیونکہ ہماری شہنشاہیت کے خاتمے کو سوا سو سال ہو گئے۔ یہاں کی بادشاہت محض تیس سال قبل تک موجود تھی۔"

معظم صاحب نے اپنے ایک عزیز کا نام لیا۔ "میں ان کو فون کردوں گا۔ پچھلے دنوں VOGUE والے بھی ان کی ڈیوڑھی کی تصاویر لے گئے ہیں۔"

دوسرے روز ان نواب صاحب کے بے شمار تصاویر سے مزین دیوان خانے میں شہزادی درشہوار کا فوٹوگراف دیکھ کر میں نے پوچھا "یہی مکرم شاہ کی والدہ ہیں؟"

"شاہزادہ مکرم جاہ" نواب صاحب نے نرمی سے تصحیح کیا۔

مگر یہ نیم دیسی نیم کولونیل کوٹھی تھی۔ ٹپیکل حیدرآبادی حویلی ایک اور نکلی جس میں قدیم تہہ خانہ مع حوض و یری ناگ کے چشمہ شاہی کی وضع کا اب تک موجود تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مکین دور جدید میں داخل اپنا کاروبار کر رہے تھے۔

اختر حسن صاحب (سابق اڈیٹر اردو بلٹز) کے مکان پر عربی قرأت کے تعلیم کا بورڈ۔

لیاقت آپا عربی پڑھا رہی ہیں۔ ان کے آنگن میں آم کا درخت ہری ہری کیریوں سے لد چکا ہے۔ موسم تبدیل ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر انور معظم اور جیلانی بانو کا نوعمر بیٹا فرحان ہیم ریڈیو ایکسپرٹ اس موضوع پر منعقد ہونے والے سیمناروں کی صدارت کے لیے بلایا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کی سمت جانے والی پیڑھی۔

شکر ادا کیجیے کہ بیدر، بیجاپور، احمد نگر، سری رنگا پٹنم وغیرہ نہیں گئی، ورنہ ان کے متعلق بھی دختر معہ مرثیہ۔

سیاست اخبار میں ناچیز کی کتابوں کے نام یوں چھپے ہیں۔ میرے بعد صنم۔ سفینۂ دل۔ آخری شب کے مسافر۔ گیسوئے شب دراز۔

مسیحی ادارے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پنجابی نژاد ڈاکٹر بجن اردو شاعر ہیں۔ طالب شاہ آبادی تخلص۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے نئے طغرے پر تلنگو عبارت۔ اردو غائب۔

سلطان قلی شاہ نے چالیس سال حکومت کی مگر سکّے اور خطبے سے اپنا نام الگ رکھا۔ بہ وجہ کسرِ نفسی۔

ایک اخبار میں ایک قانونی نوٹس چھپا ہے۔ قلع نامہ۔ (یعنی خلع نامہ)

بہت خوب۔

قلی قطب شاہ نے حیدرآباد بساتے وقت دُعا مانگی تھی میرا شہر لوگاں سے معمور کر۔ اس کا شہر تو اب تک صاف ستھرا اور نسبتاً کم گنجان ہے مگر وہ دعا پونے چار سو سال بعد باقی ملک کے لیے ایسی قبول ہوئی کہ شمالی ہند کی ٹرینوں کی چھتیں بھی لوگاں سے معمور ہو گئیں۔

بنجارہ ہل پر کمائی مزدور تیشہ زنی میں اور بیڈروم کے دریچے کے باہر کمائی مالی باغبانی میں

معروف۔ مگر ایک شاخِ نہالِ غم۔

مجتبیٰ حسین کی تازہ کتاب 'بالآخر' کا جشن اجرا۔ اسٹیج کی میز پر کتاب کا پیکٹ گلابی کاغذ گلابی فیتے میں بندھا۔ گلابی ربن بہت اچھا لگا۔ ایک تو اسٹیج پر سے اسے اُٹھالائی حیدرآباد سے روانگی کے وقت چند خواتین نے کچھ کتابیں برائے دستخط بھجوائی تھیں۔ ان کا کراس اسٹیج کا بیگ بہت خوب صورت تھا وہ بھی بحیثیت بنت میر سعد اللہ عالمگیری از دکن ایں حصہ کثیر فراہم آوردہ۔

(نامعلوم)

حواشی:

1. شاہ عبدالرحمٰن قادری بیجاپوری
2. علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل صفحہ 412
3. سید شاہ امین الدین علی ص-327
4. شیکسپیئر RECHARD III
5. نذر سجاد حیدر

آئینۂ جہاں برصغیر کی ممتاز اور منفرد فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی کلیات ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا افسانوی سفر 1943 سے شروع کیا۔ جو ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے تقریباً 75 افسانے لکھے جو ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔ پانچ ناولٹ، نو ناول اور گیارہ رپورتاژ تحریر کیے۔ ان کے علاوہ درجنوں مضامین، خاکے، بچوں کی کہانیاں اور دوسری زبانوں سے تراجم کیے۔ پوری زندگی صحافت میں گزاری (پرنٹ میڈیا اور الکٹرونک میڈیا) درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں۔ مصوری اور موسیقی کا بھی بے حد شوق تھا۔ درجنوں پینٹنگ بنائی لندن اور ہندوستان میں نمائش بھی ہوئی۔ انگریزی میں سیکڑوں صحافتی مضامین لکھے انٹرویوز اور فلم ریویو کیے، اردو ادیبوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خود درجنوں انٹرویو دیے۔ محقق کا فریضہ بھی انجام دیا اور کئی کتابیں مدون کیں۔ یہ کلیات ایک عہد ساز ادیبہ کے کارناموں کو جمع کرنے کی ایک محققانہ کوشش ہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''پدم شری'' اور ''پدم بھوشن'' جیسے انعامات سے سرفراز کیا تھا۔ اس جلد میں ان کے رپورتاژ ہیں۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ادیب، محقق، مصنف اور نقاد ہیں۔ فکشن کی تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کلیات اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس سے قبل بلونت سنگھ کی کلیات آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کا نیا افسانوی مجموعہ بھی ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اشاریہ آج کل کی تدوین کے ذریعے اردو میں اشاریہ سازی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ زندگی نامہ قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ ان کے علمی کمالات کے نئے زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کی داستان بہت طویل ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی چالیس سے زائد کتابیں قومی اور بین الاقوامی اداروں سے شائع ہو چکی ہیں جن میں چار کتابیں آکسفورڈ پریس سے بھی شائع ہوئی ہیں اور انھیں کئی ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-124-1
9 789351 601241
NCPUL New Delhi
₹ 170/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025